تاریخِ فقہ جعفری

علامہ سید ہاشم معروف الحسنی

شیخ الازہر، شیخ محمد خضری
کی کتاب
تاریخ التشریع الاسلامی
کے جواب میں لکھی گئی
فقہ جعفری کی ''تاریخ''
پر اولین کتاب۔
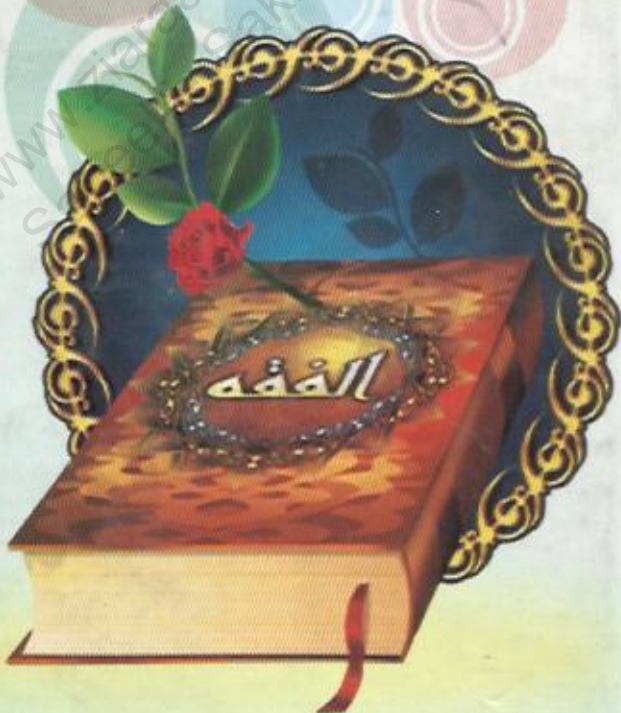
یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔
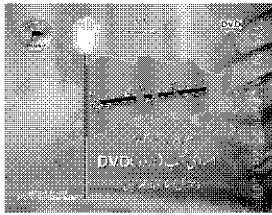
منجانب۔

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

علامہ سید ہاشم معروف الحسنی

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ - کراچی - پاکستان

نام کتاب ————————تاریخ فقہ جعفری

تالیف ————————علامہ سید ہاشم معروف الحسنی

ترجمہ ————————مستجاب احمد انصاری

نظر ثانی و حواشی————رضا حسین رضوانی

کمپوزنگ ————————رزاق جعفرانی

طباعت ————————محراب پریس کراچی

طبع دوم ————————اکتوبر ۲۰۱۰ء

عصر حاضر کے عظیم الشان محدث اور فقیہ

حضرت آیت اللہ سید ابو القاسم الموسوی الخوئیؒ

کے نام

علم اصول اور علم رجال میں جن کی کتابیں

شیعوں کا گراں قدر علمی ورثہ ہے

حضرت علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا:

إِنَّ هٰذَا الْإِسْلَامَ دِينُ اللهِ الَّذِي اصْطَفَاهُ لِنَفْسِهِ ، وَاصْطَنَعَهُ عَلٰى عَيْنِهِ ، وَأَصْفَاهُ خِيَرَةَ خَلْقِهِ ، وَأَقَامَ دَعَائِمَهُ عَلٰى مَحَبَّتِهِ. أَذَلَّ الْأَدْيَانَ بِعِزَّتِهِ ، وَوَضَعَ الْمِلَلَ بِرَفْعِهِ ، وَأَهَانَ أَعْدَاءَهُ بِكَرَامَتِهِ ، وَخَذَلَ مُحَادِّيهِ بِنَصْرِهِ ، وَهَدَمَ أَرْكَانَ الضَّلَالَةِ بِرُكْنِهِ . وَسَقٰى مَنْ عَطِشَ مِنْ حِيَاضِهِ ، وَأَتْأَقَ الْحِيَاضَ بِمَوَاتِحِهِ . ثُمَّ جَعَلَهُ لَا انْفِصَامَ لِعُرْوَتِهِ ، وَلَا فَكَّ لِحَلْقَتِهِ ، وَلَا انْهِدَامَ لِأَسَاسِهِ ، وَلَا زَوَالَ لِدَعَائِمِهِ ، وَلَا انْقِلَاعَ لِشَجَرَتِهِ ، وَلَا انْقِطَاعَ لِمُدَّتِهِ ، وَلَا عَفَاءَ لِشَرَائِعِهِ ، وَلَا جَذَّ لِفُرُوعِهِ ، وَلَا ضَنْكَ لِطُرُقِهِ ، وَلَا وُعُوثَةَ لِسُهُولَتِهِ ، وَلَا سَوَادَ لِوَضَحِهِ ، وَلَا عِوَجَ لِانْتِصَابِهِ ، وَلَا عَصَلَ فِي عُودِهِ ، وَلَا وَعَثَ لِفَجِّهِ ، وَلَا انْطِفَاءَ لِمَصَابِيحِهِ ، وَلَا مَرَارَةَ لِحَلَاوَتِهِ . فَهُوَ دَعَائِمُ أَسَاخَ فِي الْحَقِّ أَسْنَاخَهَا ، وَثَبَّتَ لَهَا آسَاسَهَا ، وَيَنَابِيعُ غَزُرَتْ عُيُونُهَا ، وَمَصَابِيحُ شَبَّتْ نِيرَانُهَا ، وَمَنَارٌ اقْتَدٰى بِهَا سُفَّارُهَا ، وَأَعْلَامٌ قُصِدَ بِهَا فِجَاجُهَا ، وَمَنَاهِلُ رَوِيَ بِهَا وُرَّادُهَا . جَعَلَ اللهُ فِيهِ مُنْتَهٰى رِضْوَانِهِ ، وَذِرْوَةَ دَعَائِمِهِ ، وَسَنَامَ طَاعَتِهِ ؛ فَهُوَ عِنْدَ اللهِ وَثِيقُ الْأَرْكَانِ ، رَفِيعُ الْبُنْيَانِ ، مُنِيرُ الْبُرْهَانِ ، مُضِيءُ النِّيرَانِ ، عَزِيزُ السُّلْطَانِ ، مُشْرِفُ الْمَنَارِ ، مُعْوِذُ الْمَثَارِ . فَشَرِّفُوهُ وَاتَّبِعُوهُ ، وَأَدُّوا إِلَيْهِ حَقَّهُ ، وَضَعُوهُ مَوَاضِعَهُ .

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۶)

اسلام ہی وہ دین ہے جسے اللہ نے اپنی پہچان کرانے کے لیے پسند کیا، اپنی نظروں کے سامنے اس کی دیکھ بھال کی، اس کی تبلیغ کے لیے بہترین خلق کا انتخاب فرمایا۔ اپنی محبت پر اُس کے ستون کھڑے کیے، اُس کی برتری کی وجہ سے تمام ادیان کو سرنگوں کیا اور اس کی بلندی کے سامنے سب ملتوں کو پست کیا۔ اس کی عزت کے ذریعے دشمنوں کو ذلیل اور اُس کی مدد سے مخالفوں کو رسوا کیا۔ اس کے ستون سے گمراہی کے کھمبوں کو گرا دیا۔ پیاسوں کو اس کے تالابوں سے سیراب کیا اور پانی الچنے والوں کے ذریعے حوضوں کو بھر دیا۔ پھر اسے اس طرح مضبوط کیا کہ نہ اس کے بندھن ٹوٹ سکتے ہیں، نہ اس کی کڑیاں الگ الگ ہوسکتی ہیں، نہ اس کی بنیاد گر سکتی ہے، نہ اس کے ستون اپنی جگہ چھوڑ سکتے ہیں، نہ اس کا درخت اکھڑ سکتا ہے، نہ اس کی مدت ختم ہوسکتی ہے، نہ اس کے قوانین ختم ہوسکتے ہیں، نہ اس کی شاخیں کٹ سکتی ہیں، نہ اس کی راہیں تنگ، نہ اس کی آسانیاں دشوار ہیں، نہ اس کے سفید دامن پر سیاہی کا دھبہ، نہ اس کی استقامت میں پیچ وخم، نہ اس کی لکڑی میں کجی، نہ اس کی کشادہ راہ میں کوئی دشواری ہے، نہ اس کے چراغ گل ہوتے ہیں، نہ اس کی خوشگواریوں میں تلخیوں کا گزر ہوتا ہے۔ اسلام ایسے ستونوں پر حاوی ہے جس کے پائے اللہ نے حق کی سرزمین میں قائم کیے ہیں اور اُن کی بنیاد کو استحکام بخشا ہے اور ایسے سرچشمے ہیں جن کے چشمے پانی سے بھرپور اور ایسے چراغ ہیں جن کی لوئیں ضیا بار ہیں۔ ایسے مینار ہیں جن کی روشنی میں مسافر قدم بڑھاتے ہیں اور ایسے نشان ہیں جن سے سیدھی راہوں کا قصد کیا جاتا ہے اور ایسے گھاٹ ہیں جن پر اترنے والے اُن سے سیراب ہوتے ہیں۔ اللہ نے اسلام میں اپنی انتہائے رضامندی، بلند ترین ارکان اور اپنی اطاعت کی اونچی سطح کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ کے نزدیک اس کے ستون مضبوط اس کی عمارت سربلند، اس کی دلیلیں روشن اور لوئیں ضیابار ہیں۔ اس کی سلطنت غالب اور مینا بلند ہیں اور اس کی بیخ کنی دشوار ہے۔ پس تم اس کی عزت باقی رکھو، اس کے احکام کی پیروی کرو، اس کے حقوق ادا کرو اور اس کے ہر حکم کو اس کی جگہ پر قائم کرو۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۶)

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم خوئیؒ کا قائم کردہ یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان اب حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی حسینی سیستانی مدظلہ العالی کی سرپرستی میں دنیا بھر میں معتبر اسلامی لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔
اس ادارے کا مقصد دور حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو محکم اسلامی علوم کی طرف متوجہ کرانا اور اس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیت رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اردو اور انگریزی زبان میں ایران، عراق، لبنان، تیونس، یمن، سوڈان اور افغانستان کے علماء کی کئی کتابیں شائع کرچکا ہے جو اپنے مشمولات اور اسلوب بیان کی بنا پر فردوس کتب میں نمایاں مقام حاصل کرچکی ہیں۔ اشاعت کتب کا یہ سلسلہ انشاء اللہ العزیز انسانیت کو صراط مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ ادارہ ہذا ایک ہزار سے زائد مدارس و مکاتب میں زیر تعلیم بچوں اور جوانوں کو اسلامی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

اسلام کی دعوت ایک ایسا کام ہے جس کو فروغ دینے کے لئے تمام مومنین کو باہمی تعاون کرنا چاہئے۔ ادارہ آپ سب کو اس کار خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں عام کیا جاسکے۔

دعا ہے کہ خداوند منان بحق محمدؐ و آل محمدؐ ہم سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

شیخ یوسف علی نفسی
وکیل حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیستانی دام ظلہ العالی

فہرست

باب اوّل

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

خُطبۃُ الکتاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ۔ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ مَالِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۔ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ وَ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیۡنَ۔ اَلَّذِیۡ اَرۡسَلۡتَہٗ رَحۡمَۃً لِّلۡعَالَمِیۡنَ۔ وَاَنۡزَلۡتَ عَلَیۡہِ کِتَابًا لَّا رَیۡبَ فِیۡہِ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ۔ وَسَلِّمۡ عَلٰۤی اَھۡلِ بَیۡتِہِ الۡمُطَھَّرِیۡنَ۔ اَلَّذِیۡنَ جَعَلۡتَ صِرَاطَھُمۡ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ۔

تقریظ

علامہ محمد جواد مغنیہ

فقہاء کی اصطلاح میں فقہ سے مراد احکام الٰہی کا ان کے مفصل دلائل سے استخراج ہے جیسے، واجب، حرام، مستحب، مکروہ اور مباح حکم کا معلوم کرنا۔ مثال کے طور پر یہ معلوم کرنا کہ یہ معاملہ درست ہے یا نہیں۔ یہ عبادت کامل ہے یا ناقص، میراث فلاں رشتہ دار کو ملے گی یا فلاں کو، یہ نکاح شرعی ہے یا غیر شرعی وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بالمقابل شریعت کا لفظ زیادہ عام ہے۔ اس میں وہ تمام اعمال، اعتقادات اور اقوال و افعال آجاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کئے ہیں۔ بالفاظ دیگر اسلامی شریعت دین کے اصول اور فروع دونوں پر حاوی ہے جبکہ فقہ میں صرف فروع سے بحث کی جاتی ہے۔ علم فقہ کے طالب علم اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں۔

یہاں ممکن ہے کہ ایک متجسس قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ فقہ اور تاریخ فقہ میں کیا فرق ہے اور اصولاً تاریخ فقہ سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقہ اور تاریخ فقہ میں وہی فرق ہے جو انسان اور انسان کی تاریخ میں ہے۔ اگر انسان کی فطرت اور اس کی جبلتوں اور صلاحیتوں سے بحث کی جائے تو یہ گفتگو خود انسان کے متعلق ہوگی اور اگر یہ بتلایا جائے کہ انسان کیسے وجود میں آیا، وہ کس کس دور سے گزرا اور اس کے کیا نتائج مرتب ہوئے تو یہ انسان کی تاریخ کا بیان ہوگا۔

یہی صورت ہے فقہ اور تاریخ فقہ کی۔ اگر شرعی احکام اور ان کے مآخذ اور دلائل کی گفتگو ہو تو یہ فقہ کی بحث ہوگی اور اگر یہ بحث کی جائے کہ گزشتہ ادوار میں مختلف آراء اور افکار کی کس طرح تشکیل ہوئی، ان افکار کو کب مدوّن کیا گیا اور اس کے کیا نتائج مرتب ہوئے تو یہ گفتگو تاریخ فقہ کا موضوع ہے۔

فقہ کی تاریخ کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ اس کے ذریعے سے فقہاء کی کوششوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علم نے کیسے ترقی کی اور کس طرح آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچا۔ ان تمام معلومات سے حقیقت تک رسائی کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف اگر یہ نکتہ ذہن میں رکھا جائے کہ ہر شخص کا عقیدہ اور عمل لازمی طور پر اس کے ماحول اور معاشرے کے مخصوص حالات سے متاثر ہوتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی فرد یا گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس قاعدے سے مستثنٰی ہو اور کوئی ایسا عقیدہ رکھے جس کا معاشرے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اگر یہ بات ذہن میں رکھی جائے تو ہم بہ آسانی اس اہم نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ فقہ کی تاریخ ہمارے لئے گویا کہ ایک ایسا اوزار ہے جس کی مدد سے ہم فقہاء کی آراء کا تجزیہ کر سکتے ہیں، راویوں کے اقوال کو پرکھ سکتے ہیں اور یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کن خاص حالات میں اور کن اسباب کے تحت وجود میں آئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ صحیح اور موضوع احادیث اور صحیح اور غلط عقائد کا پتا لگا سکتے ہیں۔

فقہ اسلامی کی تاریخ ایک جدید علم ہے۔ اس کی تاریخ زیادہ طویل نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ صدی کے اوائل تک کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ سب سے پہلے جامعہ ازہر کے شیخ محمد خضری نے اس موضوع پر ایک مختصر کتاب تاریخ التشریع الاسلامی لکھی۔ اس کام کا خیال انہوں نے مغرب سے لیا تھا کیونکہ اہل مغرب ہی نے مذاہب اور علوم کی تاریخ مرتب کرنے کے کام کا آغاز کیا ہے۔

گزشتہ ادوار میں مسلمان مصنفین نے فقیہوں، نحویوں اور شاعروں کے تذکرے ضرور مرتب کئے تھے لیکن علماء اور شعراء وغیرہ کے تذکرے ایک علیحدہ علم ہے۔ اس کا کسی علم کی تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں۔

شیخ محمد خضری کے بعد شیخ سبکی نے بعض علمائے ازہر کی مدد سے اور ان کے بعد ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے اس کام کی طرف توجہ دی۔ ان تین کے علاوہ کوئی چوتھا ایسا شخص ہمارے علم میں نہیں جس نے اس موضوع پر کوئی کتاب لکھی ہو لیکن ان تین مصنفین نے بھی فقہ کی پوری تاریخ مرتب نہیں کی۔ صرف اپنے مذہب اور فرقہ کی فقہ کی تاریخ لکھی ہے۔ یعنی فقہ اسلام کی تاریخ نہیں بلکہ اہل سنت کے فقہ کی تاریخ۔ ان مصنفین میں سے کسی نے بھی شیعوں کا اپنی کتاب میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ گویا ان کے خیال میں شیعوں کا کوئی وجود ہی نہیں یا ان کی کوئی فقہ نہیں یا وہ دراصل مسلمان ہی نہیں۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ شیعہ فقہ قدیم ترین فقہ ہے اور شیعوں کو فقہ کی تدوین میں دوسرے فرقوں پر سبقت حاصل ہے۔

اگر ہر کام کے لئے کوئی وجہ ضروری ہے تو پرزور طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس بات نے علامہ سید ہاشم معروف کو اس کتاب کی تالیف پر آمادہ کیا وہ ان لوگوں کا ظلم ہے جنھوں نے سابق میں اس موضوع پر لکھا ہے۔ ان مصنفین نے فقہ اسلامی کی تاریخ کو مسخ کر کے اسے بعض طبقوں سے مخصوص کردیا۔ شاید انہوں نے اپنی اُفتادِ طبع یا خاص نوع کی تعلیم کی وجہ سے یہ صورت اختیار کی ہے۔ لیکن اگر کسی دوسرے نے ہم پر ظلم کیا ہے تو یہ ہرگز مناسب نہیں کہ ہم خود بھی اپنے اوپر ظلم کریں جبکہ ہمارے پاس ضروری علمی اور انسانی وسائل موجود ہیں اور ہم ہمیشہ مختلف اسلامی علوم خصوصاً فقہ اور اصول فقہ میں دوسروں سے آگے رہے ہیں۔

مغربی مفکرین کو اعتراف ہے کہ شیعہ علماء نے فقہ کو نئی زندگی بخشی ہے اور اس کو ترقی دے کر جمود سے نجات دلائی ہے۔ مشہور جرمن مستشرق گول ڈزیہر (Ignaz Goldizher 1850-1921) اپنی کتاب ''عقیدہ اور شریعت'' میں کہتا ہے:

''اسلام کے علمی اور روحانی مباحث کو بارآور بنانے میں شیعوں کی برتری مسلّم تھی اور اب بھی مسلّم ہے۔ اسی طرح کی تیز کارروائی مذاہب کو جمود سے اور خشک سانچوں میں ڈھلنے سے محفوظ رکھتی ہے۔''

اسی نکتے کو علامہ سید ہاشم معروف نے ناقابل تردید دلائل سے ثابت کیا ہے۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے فقہ کی سرگزشت بیان کی ہے اور امام علی علیہ السلام کے زمانے سے لے کر امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے تک فقہی احکام کے شیعہ راویوں کا ان کے زمانے کی ترتیب کے لحاظ سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے احکام الٰہی کے استخراج اور استنباط کے طریقے اور ان کے ماخذوں کے بارے میں بھی مدلل اور مفصل بحث کی ہے۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مصنف نے اس اہم کام کو نہایت عمدگی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے کیونکہ ایک طرف انہیں فقہی مسائل اور ان کے ماخذ سے وسیع واقفیت ہے اور دوسری طرف وہ تمام احادیث اور اقوال کو دیانت داری سے بیان کرتے ہیں۔ وہ فقہ اور اصول فقہ پر پوری طرح حاوی ہیں اور اپنی تیز اور گہری نظر سے مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اگر ان کی تحریر میں کہیں کہیں ابہام نظر آتا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ یہ فقہ جعفری کی تاریخ پر پہلی کتاب ہے۔ مصنف نے فقہ کی تاریخ خود فقہ سے اخذ کی ہے اور اس کام میں کسی کتاب سے رہنمائی حاصل نہیں کی۔ اگر ان کے کام میں کسی کو کہیں نقص نظر آئے تو اس کے لئے یہی معذرت کافی ہے کہ ابھی تک کسی شیعہ نے اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔

بہرحال مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اہل فکر و دانش کے لئے اچھا مواد مہیا کرے گی کیونکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ یہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو پوری تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ جل شانہٗ مصنف کو اسلام اور امامانِ عالی مقام کی طرف سے عالمان باعمل کا اجر عطا فرمائے۔

مُقدّمہ

بے پایاں درود وسلام ہو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو افضل ترین خلائق، والا نسب اور پاکیزہ ترین جسم و جان کے مالک ہیں۔ درود آپ کے اہلبیت پر جن کے بارے میں اور کتاب اللہ کے بارے میں آپؐ نے فرمایا تھا: اِنِّیْ مُخَلِّفٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا مِنْ بَعْدِیْ اَبَدًا "میں تمہارے درمیان دو قیمتی چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت میرے اہلبیت۔ اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ہرگز کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔"

درود ہو آپ کے ان پاک اصحاب پر جنہوں نے آپ کی سنت پر عمل کیا اور آپ کے طریقے پر چلے اور ان پر بھی جو اُن کے بعد آئے۔ جنہوں نے راہ خدا میں جدوجہد کی اور اپنے مال و جان سے جہاد کیا تاکہ اس دین مبین کی بنیادیں مضبوط کریں اور اس کے احکام کی اشاعت کریں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکت ہو ان سب پر۔

کچھ مدت قبل مجھے خیال آیا کہ ایک کتاب فقہ جعفری کی تاریخ پر لکھوں۔ اس خیال کی تحریک علامہ شیخ محمد جواد مغنیہ نے کی تھی جو دین کی راہ میں جہاد اور مخالفین کے کذب و افتراء اور تہمت و بہتان کے مقابلے میں مذہب تشیع اور ائمہ اہلبیت علیہم السلام کا دفاع کرنے میں ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔

اس کے باوجود کہ مختلف اسلامی اور غیر اسلامی موضوعات پر بے شمار کتابیں لکھی

گئی ہیں، اس خاص موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ شیعہ تصانیف اس بحث سے یکسر خالی ہیں۔ اگرچہ شیعہ اپنی تاریخ کے آغاز سے ہی جس کی ابتدا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے ہوتی ہے، تمام اسلامی علوم اور ہر اس کام میں جس سے اسلامی وجود کو تقویت ملتی ہو ہمیشہ آگے آگے رہے ہیں اور انہیں گزشتہ ہر دور میں اسلامی سوچ کے نقطۂ نظر سے دوسروں پر فوقیت حاصل رہی ہے لیکن اس اہم کام کی طرف ابھی تک انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی اپنی کتاب دراسات الاسلامیہ کے "مقدمہ" میں شیعوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اسلامی فکر کے پھلنے پھولنے میں شیعوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ انہوں نے اس ثمر بخش زندگی کی توسیع میں بہت قیمتی کردار ادا کیا ہے جس نے اس دین کو یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ سرکش ترین روحوں کی ضرورت پوری کر سکے۔ اگر شیعہ نہ ہوتے تو یہ دین خشک سانچوں میں منجمد ہو کر رہ جاتا۔"[۱]

تاریخ کسی ایسے گروہ سے واقف نہیں جس کو شیعوں کی طرح اس قدر ظلم وستم اور دشمنی و عداوت کا سامنا کرنا پڑا ہو[۲] لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود اپنی تاریخ کے بدترین ادوار میں بھی شیعہ اہل قلم مذہب اسلام کی موثر خدمت کرتے رہے۔ شیعوں نے راہ خدا میں سب سے زیادہ سعی اور انسانیت کی خدمت کی سب سے زیادہ کوشش کی ہے۔

اسمائے رجال کی کتابوں اور تذکروں میں ایسے بہت سے شیعہ علماء کا نام بنام تذکرہ ہے جو فقہ، حدیث، فلسفہ، ادب اور دوسرے اسلامی اور غیر اسلامی علوم میں سرآمد روزگار ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان تمام ادوار میں تاریخ کا تعلق حکام وقت سے رہا

۱۔ مع الشیعہ الامامیہ ص ۱۷۲

۲۔ دیکھئے: علامہ محمد جواد مغنیہ کی کتاب شیعہ اور جابر حکمران، مطبوعہ مجمع علمی اسلامی

ہے اور شیعہ ان کے خلاف رہے ہیں اور باوجودیکہ قرون اولیٰ میں بنی امیہ، بنی عباس اور بعد کی صدیوں میں ایوبی اور عثمانی ترک شیعوں کے خلاف برسرپیکار رہے ہیں لیکن شیعہ ہمیشہ مکتب وحی کی توسیع و اشاعت کے سلسلے میں تخلیق افکار سے بہ افراط بہرہ یاب ہوئے ہیں۔

دو سال سے زیادہ ہوئے مجھے اس میں تذبذب تھا کہ اس طرح کی کتاب کی تالیف کا آغاز کروں یا نہیں کیونکہ موضوع بہت وسیع تھا اور مواد بکھرا ہوا اور الجھا ہوا تھا۔ مصنف کو بہت وقت اور اصل ماخذ پر مشتمل ایک بڑی لائبریری درکار تھی کیونکہ یہ ضروری تھا کہ شیعہ تاریخ اور اس کے مسائل اور مشکلات کا عمیق مطالعہ کیا جائے۔

صحابۂ کرام کے زمانے سے لے کر بعد کے ہر دور کے مشہور شیعہ فقہاء اور ان کی آراء کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں اور تدوین کے ابتدائی دور میں جو تصانیف ہوئیں ان کے متعلق واقفیت حاصل کی جائے۔ یہ معلوم کیا جائے کہ تقلید کی جگہ اجتہاد کا آغاز کیسے ہوا اور اس نے مرحلہ بمرحلہ کیسے ترقی کی۔ اسی طرح اس موضوع سے متعلق دوسرے مسائل سے آگاہی حاصل کی جائے۔

یہی وجہ تھی کہ میں ڈرتا تھا کہ میں اس موضوع کا حق ادا نہیں کرسکوں گا۔ کبھی پختہ ارادہ کرلیتا تھا اور بعد میں پھر خیال ترک کردیتا تھا۔ اسی اثناء میں میں نے تاریخ فقہ اسلامی کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا جو علمائے فقہ نے لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں آغاز سے تکمیل تک ہر دور کے اسلامی فقہ کا مطالعہ کیا گیا ہے اور فقہاء، راویان حدیث اور صاحبان فتویٰ کا نام بنام تذکرہ ہے لیکن ان میں کوئی ایسی بحث نہیں جس سے دوسرے فقہی مکاتب کی طرح قاری کو شیعہ فقہ سے بھی کوئی واقفیت حاصل ہوسکے۔

شیخ محمد خضری نے اپنی کتاب **تاریخ التشریع الاسلامی** (ص ۱۶۹) میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ شیعوں نے علی علیہ السلام اور ان کے اہلبیت کے

بارے میں غلو سے کام لیا ہے، اس لئے انہوں نے بہت سی ایسی روایات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کردی ہیں جن کا وضعی ہونا سب پر واضح ہے۔ اسی لئے اس نے شیعہ یا منسوب بہ تشیع راویوں کی روایات کو نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ اسی طرح خضری نے اسی کتاب میں (ص ۲۶۳) فرقۂ زیدیہ کی تعریف کی ہے اور بعض شیعہ فقہی آراء پر اعتراض کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے بھی اپنی کتاب تاریخ الفقه الاسلامی میں شیعوں کے مختصر تذکرے پر اکتفا کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''علم رجال کے معتبر اہل سنت مصنفین نے یا تو اکثر شیعہ رجال کا تذکرہ ہی نہیں کیا یا پھر ان پر دروغ گوئی اور وضع حدیث کا الزام عائد کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اہل سنت مصنفین کے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہیں۔''

ان وجوہ سے اور شیخ محمد جواد مغنیہ کے باربار شوق دلانے پر آخر میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کتاب کی تالیف کا آغاز کر ہی دوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صحیح راستے کی طرف میری رہنمائی فرمائے۔ میں اسی سے مدد کا خواہاں ہوں۔

وَهُوَ وَلِيُّنَا نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْر.

بیروت ۱۹۷۰ء

ہاشم معروف الحسنی

باب اوّل

قانون اور قانون سازی کی ضرورت

تشریع سے مراد ان عام قواعد و قوانین کا مجموعہ ہے جو کوئی شارع انسانی تعلقات کو منظم صورت دینے کے لئے وضع کرے اور جس کا کام افراد کے حقوق و فرائض کا تعین ہو۔

اگر قانون نہ ہو تو انتشار، اختلاف اور باہمی آویزش پھیل جائے۔ طاقتور اپنی طاقت کے بل بوتے پر جس چیز پر چاہے قبضہ جما لے اور کمزور ابتدائی ضروریات زندگی سے بھی محروم رہ جائے۔ جب قانون کا یہ مقصد ٹھہرا تو یہ بھی ضروری ہوا کہ قانون ساز کوئی ایسا ہو جس کی اپنی کوئی غرض نہ ہو تاکہ وہ نیک نیتی سے ایسے قوانین مدوّن کر سکے جو بڑے لوگوں کے مقابلے میں کمزوروں کے حقوق کے ضامن ہوں۔

انسان کے بنائے ہوئے قوانین سے عموماً یہ مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ جو انسان قانون بناتا ہے اسے یہ اختیار عموماً کسی حکومت کے طرف سے ملتا ہے جو اسے اس کام کے لئے مقرر کرتی ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ بہت سے قوانین میں حکام کا اپنا مفاد اور اپنی غرض شامل رہتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ قوانین اس خاص زمانے کے حالات سے جس میں یہ وضع کئے جاتے ہیں متاثر ہوتے ہیں اور قدرتی طور پر ان کا سرچشمہ طاقتور طبقہ کی خواہشات اور فرمائشیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے جب کبھی حکومت کی مصلحت بدلتی ہے یا حاکموں کے رجحان میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو یہ قوانین بھی بدل جاتے ہیں۔

مگر آسمانی قانون کا سرچشمہ وہ خدائے حکیم ہے جو ہر بات سے واقف ہے جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز ہے، جو ہر نقص اور عیب سے مبرا ہے، جو دھوکہ نہیں دیتا، جس کی کوئی ذاتی غرض نہیں، جو کسی شخص یا کسی بات سے متاثر نہیں ہوتا، جو ہر غلط چیز سے پاک ہے۔ آسمانی قانون انسان کے باطن کو متاثر کرتا ہے اور اس میں پاکیزگی، آگہی، ذمہ داری، خودداری اور تحمل و برداشت کے جذبات کی پرورش کرتا ہے۔ قانون الٰہی دینی بھائیوں اور خدا کے ساتھ آدمی کے تعلقات کو مستحکم بناتا ہے۔ یہ افراد کو اپنے فرائض کی ادائیگی کا شوق دلاتا ہے اور قانون پر عمل کرنے والوں کو اجر عظیم کا مژدہ سناتا ہے۔

حق تعالیٰ سبحانہ فرماتا ہے: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے، نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی، ان کے لئے اجر ہے ان کے پروردگار کے پاس۔ ان کو (روز حساب) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۷۷)

جو شخص قانون الٰہی پر جس میں اس کے فرائض کی نشان دہی کی گئی ہے عمل کرتا ہے وہ نہ صرف سزا سے محفوظ رہتا ہے بلکہ اپنے نیک اعمال کے بدلے میں انعام اور ثواب کا مستحق بھی قرار پاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص آسمانی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے اس سے نہ صرف محشر میں مواخذہ ہوگا اور اسے سزا ملے گی بلکہ اس قانون کے مطابق وہ بعض گناہوں کی سزا اس دنیا میں بھی پائے گا۔ اسی وجہ سے آسمانی قانون کا ان لوگوں پر جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہایت گہرا اثر ہوتا ہے۔ ایسا اثر ہوتا ہے کہ عمل سے بھاگنے اور خدا کی مقرر کردہ ذمہ داری سے بچنے کی راہ مسدود ہو جاتی ہے کیونکہ کوئی شخص کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس دنیا میں تو سزا سے بچ سکتا ہے لیکن اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اگلی دنیا میں بھی اپنی سرکشی کا نتیجہ بھگتنے سے بچ جائے۔

انسان ایسے قانون کو ماننے پر مجبور ہے جو ایک طرف تو اس کا تعلق خالق سے اور دوسری طرف اس کا تعلق معاشرے سے متعین کرتا ہو اور معاشرے میں افراد کے باہمی حقوق و فرائض کا تعین کر کے ان کی خود غرضی اور خود پسندی کے مواقع محدود کرتا ہو۔ اس وقت اسلام ہی تنہا وہ ادارہ ہے جو اس طرح کا جامع اور مکمل ضابطہ حیات پیش کرنے کا دعویٰ کرسکتا ہے کیونکہ اسلام ہی تمام انسانی ضرورتوں کے پورا کرنے کی ضمانت دیتا ہے اور اسی کا متوازن قانون بغیر کسی رد و بدل کے ہر دور اور ہر جگہ کے لئے مناسب ہے۔ اسلام بنیادی طور پر مادہ و روح اور دین و دنیا دونوں کا جامع ہے۔ اس کے قانون میں ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ دنیا سے بھی اپنا حصہ لے اور ایسے صالح معاشرے کے قیام میں بھی تعاون کرے جس میں بندگان خدا پر ظلم و تعدی نہ ہو۔ اس دین کے ہر پیروکار کے لئے ضروری ہے کہ خدا اور مخلوق خدا دونوں کے بارے میں اپنے فرائض دیانتداری سے انجام دے۔

ارشاد باری ہے: وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ

''جتنا کچھ اللہ نے تجھ کو دیا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش مت کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی لوگوں کے ساتھ احسان کر اور دنیا میں فساد کا خواہاں مت ہو۔'' (سورۂ قصص: آیت ۷۷)

ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

''اگر تم میں سے کوئی اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ کسی سے سوال کرے جبکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دے گا یا نہیں۔''

جو شخص بھی اسلام اور اس کے جاودانی قانون کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کرے گا وہ اس قانون کی وسعت اور گراں مائیگی کو دیکھ کر اس کی عظمت اور ہر پہلو سے اس کی جامعیت کے اعتراف پر مجبور ہوگا۔ طریقے جتنے بدلیں، زندگی کے مسائل میں

جتنی وسعت پیدا ہو اور علم اور آدمی کی سوچ میں جتنی پیش رفت ہو، اس قانون کی قدر و قیمت اور اس کی عظمت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا اور اس کے غیر فانی ہونے کا احساس اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے یہ نکتہ اور زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے کہ اسلام ایک ایسا چشمہ ہے جس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوں گے۔ یہ اپنے دامن میں ایک عظیم ترین فکری خزانہ لئے ہوئے ہے اور ہر دوسرے مکتب فکر سے بہتر ایک ایسے صالح معاشرے کی تعمیر کے لئے زمین ہموار کرسکتا ہے جس میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو اور خلوص و محبت کی فضا قائم ہو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا قانون انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں ہے کیونکہ انسان کا بنایا ہوا قانون اگر جذبات اور نفسانی خواہشات کے پنجے سے چھوٹ بھی جائے تب بھی غلطیوں سے مبرا نہیں ہوسکتا۔

اسلامی شریعت بنی نوع انسان کے لئے آخری آسمانی قانون ہے جو خاتم الانبیاء اور افضل الرسل حضرت محمد مصطفیؐ کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچا ہے۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ اس کو ایسا نظام ہونا چاہئے جو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہو۔ انسانی زندگی کی تمام ضروریات پوری کرے۔ انسان کی آزادی اور وقار کی ضمانت دے اور آدمی کو کامیاب اور خوشحال زندگی کی راہ دکھائے۔

اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم علم حاصل کریں تاکہ ہمیں روشنی ملے۔ ایسا علم حاصل کریں جس کے ذریعے سے ہوا و ہوس، توہمات و خرافات اور باطل و بے اصل خیالات کے اندھیروں سے عقل کو نجات ملے۔ ایسا علم حاصل کریں جس کے ذریعے سے لوگوں میں عدل و انصاف، محبت اور بھائی چارے کے جذبات جڑ پکڑیں۔ ایسا علم حاصل کریں جو ایک کی دوسرے پر برتری اور فوقیت کو لغو قرار دے سوائے اس برتری کے جو عمل صالح اور انسانیت کی خدمت پر مبنی ہو، جو دھوکہ، ظلم اور ان تمام برائیوں سے باز رکھے جو انسان کی ترقی میں حائل ہوتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام جو مبنی برحق ایک تعمیری مکتب فکر ہے ہمیں اس علم کی طرف دعوت دیتا ہے جو لوٹ کھسوٹ، مادیت اور لالچ کا مقابلہ کرے اور انسان کو ان ہتھیاروں سے مسلح کرے جو زندگی کو کامیاب بنا سکیں۔ اسلام کا منصفانہ معیار انسان کو عزت، وقار اور دنیا و آخرت کی کامیابی اور بھلائی کا تحفہ دیتا ہے اور جدید تمدن کی اس جھوٹی چمک دمک کا سختی سے مقابلہ کرتا ہے جو روحانیت اور اخلاق کو تباہ کرنے والی ہے اور جو ہمارے بہت سے نوجوانوں کو ہوس رانی اور تباہی کے راستے پر لگا دیتی ہے۔

اسلام ایسی دولت سے مالا مال ہے جس کی بدولت وہ دنیا کے لوگوں کو جگانے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے میں اساسی کردار ادا کرسکتا ہے۔ انسان کا بنایا ہوا کوئی قانون، جذبات اور خود غرضی کی آلائش سے کتنا ہی پاک کیوں نہ ہو، یہ کام انجام نہیں دے سکتا کیونکہ انسان فطرتاً غلطیوں کا پتلا اور اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کا اسیر ہے۔ اسلام کا قانون وہ قانون ہے جو انسان کے پروردگار کی طرف سے آیا ہے۔ وحدانیت کے قائل دوسرے ادیان کی طرح اسلام بھی اپنا پہلا ہدف خدا کے منکروں اور بت پرستوں سے مقابلے کو قرار دیتا ہے۔ اسلام سینکڑوں ایسی مضبوط دلیلیں لاتا ہے جن سے ملحدین کے تمام شکوک رفع ہو سکتے ہیں اور جن سے گمراہی کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

انسان دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں ایک ایسی قوت ہے جو دنیا کو حرکت اور وسعت عطا کرتی ہے۔ انسان کی سوچ اسے اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ یہی قوت ہر چیز کی علت ہے اور تمام اسباب کی انتہا اسی پر ہوتی ہے۔ اسی نے تمام موجودات کو طاقت بخشی ہے اور ان کے وجود میں یہ قابلیت رکھی ہے کہ وہ نیچر کے حقائق و اسرار کو سمجھ سکیں۔ انسانی علم و فکر میں جس قدر پیش رفت ہوتی جاتی ہے اور معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اتنا ہی انسان کو اپنی ناواقفیت کا علم بڑھتا جاتا ہے اور یہ احساس

گہرا ہوتا جاتا ہے کہ وہ اس کائنات کے اسرار کو سمجھنے سے عاجز ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ وہ ہمیشہ جہاں سے چلا تھا وہیں رہے گا، آدمی جتنا آگے بڑھے گا، جتنی نئی نئی ایجادات کرے گا، جتنی اس کی نظر میں وسعت پیدا ہوگی، اتنا ہی اس پر یہ واضح ہوتا جائے گا کہ اس دنیا کے جو حقائق اسے معلوم ہیں وہ ان حقائق کے مقابلے میں جو پوشیدہ ہیں سمندر میں ایک قطرہ بھی نہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا "تمہیں خزانۂ علم میں سے بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔" (سورۂ اسراء: آیت ۸۵)

نیو یارک اکاڈمی آف سائنسز کے سابق صدر کریسی موریسن[1] کہتے ہیں:

"علم کے سفر میں انسان ہمیشہ راستے کے شروع ہی میں رہتا ہے۔ جیسے جیسے علم کی روشنی بڑھتی جاتی ہے خدا کی نئی نئی مصنوعات ظاہر ہوتی جاتی ہیں۔"

اسلام چاہتا ہے کہ اس طاقت کی طرف انسان کی رہنمائی کرے جس کے ہاتھ میں اس دنیا کا نظام اور سب کام ہیں اور خدا اور اس کی وحدانیت پر ایمان لوگوں کے دلوں میں بٹھا دے کیونکہ اسی ایمان پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

ابتدائے بعثت میں قرآن مجید کی جو آیات نازل ہوئیں ان میں سے اکثر میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا بیان ہے بلکہ ہجرت سے پہلے مکہ میں جو آیتیں نازل ہوئیں وہ زیادہ تر مختلف طریقوں سے توحید کے مسئلے ہی سے بحث کرتی ہیں۔ کہیں دلائل دیئے گئے ہیں، کہیں مثال و تشبیہ سے کام لیا گیا ہے اور کہیں اس عذاب کی بات ہے جو اگلے جہان میں مشرکین کے لئے تیار ہے۔ قرآن مجید میں کم ہی کوئی سورت

۱۔ نیو یارک اکاڈمی آف سائنسز کے سابق صدر Prof. Abraham Cressy Morrison کی کتاب Man Does Not Stand Alone سے اقتباس جو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ العلم یدعو للایمان کے نام سے مصر سے شائع ہوا ہے۔ پروفیسر موریسن نے یہ کتاب معروف برطانوی ماہر حیاتیات اور فلسفی Sir Julian Huxley کی کتاب Man Stands Alone کے جواب میں لکھی تھی۔

ایسی ہوگی جس میں ایک یا چند آیتیں ایمان باللہ اور توحید کے بارے میں نہ ہوں۔
قرآن مجید مختلف انداز سے مختلف انسانوں کی سمجھ کے معیار کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔
اس موضوع کے بعد جس کا تعلق کائنات کے صحیح تصور سے ہے اور جو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے قرآن مجید کا دوسرا موضوع تشریع یا قانون سازی ہے۔
تشریع سے مراد وہ نظام ہے جس کی پیروی کرنا امت پر لازم ہے۔ اس نظام کے کچھ حصے کی تو قرآن میں تصریح ہے اور کچھ حصہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی کے ذریعے معلوم کر کے مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق ان تک پہنچایا ہے۔
کتاب الٰہی میں ان آیتوں کی مجموعی تعداد جن کا تعلق احکام سے ہے اور احکام میں عبادات، ضابطہ دیوانی (Civil) فوجداری (Criminal) شخصی (Personal) اور اجتماعی (Social) معاملات سب شامل ہیں، پانچ سو تک پہنچتی ہے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مسلمان آپ سے براہ راست احکام معلوم کرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ کتاب اللہ میں مسئلہ تلاش کرتے اور اگر واضح طور پر قابل عمل حکم مل جاتا تو اس پر عمل کرتے لیکن جو مسلمان مدینہ سے باہر رہتے تھے وہ اس طریقے سے محروم رہ جاتے تھے اس لئے گاہے بگاہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابۂ کرام کی جماعتیں ان کی تعلیم کے لئے روانہ فرماتے تھے یا جب آپ کوئی حاکم یا قاضی ان کے سیاسی یا مذہبی امور کے انتظام کے لئے بھیجتے تھے تو ان کے ذریعے سے احکام بھی ان تک پہنچاتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جب مسلمانوں کی قیادت خلفاء کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے بھی حکومت کے انتظامات کے ساتھ اسلامی احکام کے نفاذ کی کوشش جاری رکھی۔ مدینے میں ایک جماعت نے اسلام اور اس کے مقدس احکام کو پھیلانے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ جماعت صحابۂ کرام میں سے سابقین اولین اور کچھ دوسرے ایسے افراد پر مشتمل تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت

میں حاضر رہ کر اسلام اور اس کے اصول پر ایمان لائے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں ایسے لوگ شامل تھے جو قرآن مجید کے احکام سے بخوبی واقف تھے اور کتاب اللہ کے ظاہری نصوص اور ان کے رموز و اسرار کا علم رکھتے تھے۔ جن احکام کے متعلق قرآن مجید میں کوئی اشارہ نہیں ان میں سے بہتوں نے وہ احکام حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سنے تھے۔ یہی وہ صحابہ تھے جو تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں اخذ احکام الٰہی کا مرجع قرار پائے۔ یہ جماعت فقہائے صحابہ کے نام سے مشہور ہے۔

ہم انشاء اللہ اس کتاب کے آخری حصے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخلص صحابۂ کرام اور ان لوگوں کی کوششوں کا ذکر کریں گے جنہوں نے احکام الٰہی کی نشر و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ ایک صالح معاشرے کے لئے ایک صالح قانون کا ہونا ناگزیر ہے۔ اسلام ایک ایسا ہی قانون ہے جو آدمی کی دنیا و آخرت کی ضرورتیں پوری کرتا ہے، اسے عمل اور کوشش کا حکم دیتا ہے، سستی اور کاہلی سے باز رکھتا ہے اور مساوات قائم کرتا ہے۔ یہ دھونس اور دھاندلی کا نظام نہیں اور کسی پر ظلم روا نہیں رکھتا۔

حدیث پاک میں ہے کہ اَلنَّاسُ كُلُّهُمْ لِآدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ لَا فَضْلَ لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى "سب انسان آدم زاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے تھے چنانچہ گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں بجز تقویٰ کے۔"

اسلام خود انسان کو اپنا علاج کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اسے اپنے باطن کو ایسی آلودگیوں سے پاک صاف کرنے کی تلقین کرتا ہے جو اگر باقی رہ جائیں تو ان کا نتیجہ کفر و شرک ہوسکتا ہے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ انسان کا باطن ایسا تاریک ہوجائے کہ اس کو حق سجھائی نہ دے اور وہ حقیقت کا ادراک نہ کرسکے۔ اسلام انسان کو متنبہ

کرتا ہے کہ شیطان اس کے راستے میں تاک لگائے بیٹھا ہے۔ اسلام انسان کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے اور اس کو نیک انجام اور خوش باش زندگی کی بشارت دیتا ہے۔

حق سبحانہٗ نے فرمایا ہے: وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ''جو شخص خدا کی یاد کو بھلا دیتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے اور یہ (شیاطین) لوگوں کو راہ حق سے روکتے رہتے ہیں اور لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں۔ یہاں تک کہ جب ایسا شخص ہمارے پاس آئے گا تو وہ (اس شیطان سے) کہے گا کہ اے کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کے برابر فاصلہ ہوتا، تو کتنا برا ساتھی تھا۔'' (سورۂ زخرف: آیت ۳۶ تا ۳۸)

توحید کے بارے میں قرآن مجید کی دعوت

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مبارک دعوت کا آغاز کیا تو ابتدا میں آپ نے لوگوں کو اس خدائے واحد پر ایمان لانے کے لئے کہا جس کا کوئی شریک نہیں اور جو زن و فرزند سے بے نیاز ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں اتمام حجت کیا اور سبب و مسبب اور علت و معلول کا تعلق لوگوں کے ذہن نشین کیا۔ یہ ایسی بات تھی کہ ایک چھوٹا بچہ بھی فطری طور پر سمجھتا ہے کہ ہر چیز اپنے وجود کے لئے کسی سبب اور علت کی محتاج ہے۔ یہی انسانی فطرت ایک عام آدمی کو کم عمری ہی میں اس اعتراف پر مجبور کرتی ہے کہ کائنات کا کوئی خالق ہے۔

اس طرح اسلام دین فطرت ہے یعنی اسلام میں جو کچھ ہے وہ فطرت اور عقل کے عین مطابق ہے۔

قرآن مجید میں بکثرت آیات ہیں جو بندوں کو خالق کائنات پر ایمان لانے

کی دعوت دیتی ہیں اور اس طرف توجہ دلاتی ہیں کہ وہی اس جہان کا خالق ہے، وہی اس کا انتظام چلاتا ہے اور اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ان میں سے ہر آیت ہماری سوچ کو خدا کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی بے شمار نعمتوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔کبھی یہ آیات زمین کی تخلیق اور اس پر موجود گوناگوں نعمتوں کی طرف توجہ دلاتی ہیں، کبھی آسمانوں اور ستاروں کے خالق کی حیرت انگیز عظمت کی یاد دلاتی ہیں، کبھی انسان کی تخلیق کی کیفیت پر اور اس کی زندگی کے مراحل پر جن کا انجام آخر موت ہے غور وفکر پر مجبور کرتی ہیں، اسی قبیل کے اور مضامین ہیں۔ مقصد سب کا یہ ہے کہ انسان کو توحید اور خدا پرستی کے فطری رجحان پر قائم رکھا جائے تا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم خالق کائنات کے وجود اور اس کی وحدانیت سے بے خبر تھے۔مشرکین کے لئے کفر وشرک کا کوئی عذر باقی نہ رہے اور کوئی گروہ قرآن مجید کے الفاظ میں یہ نہ کہہ سکے کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ”درحقیقت شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا۔ان کے بعد ان کی نسل میں ہم ہوئے۔تو کیا اُن اہل باطل کے فعل کی سزا میں آپ ہم کو ہلاک کردیں گے؟“(سورۂ زخرف: آیت ۲۳)

توحید کے بارے میں قرآن مجید کی وضاحت

ان آیات میں قرآن زمین، آسمان اور وجود خدا کی دوسری نشانیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے:اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ”کیا ان کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ پہلے آسمان اور زمین بند تھے۔ پھر ہم نے ان دونوں کو کھول دیا۔اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا ہے۔کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے؟“(سورۂ انبیاء: آیت ۳۰)

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ”ہم نے زمین میں اس لئے پہاڑ بنائے تا کہ وہ ان لوگوں کو لے کر

ہلنے نہ لگے۔ اور ہم نے پہاڑوں میں راستے اور درّے رکھے۔ شاید کہ یہ لوگ ہدایت حاصل کریں۔" (سورۂ انبیاء: آیت ۳۱)

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَّاَسْقَيْنَاكُمْ مَّآءً فُرَاتًا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ "کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مُردوں کی سمیٹنے والی نہیں بنایا۔ اور اس میں اونچے اونچے پہاڑ نہیں بنائے۔ اور ہم نے تم کو میٹھا پانی نہیں پلایا۔ پس اس روز حق کے جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔" (سورۂ مرسلات: آیت ۲۵ تا ۲۸)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ "کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیا عجیب طور پر پیدا کیا گیا ہے؟ اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح نصب کئے گئے ہیں؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی ہے؟" (سورۂ غاشیہ: آیت ۱۷ تا ۲۰)

خداوند سبحان انسان کی توجہ مخلوقات سے ہونے والے فوائد، حسن و زیبائی اور مرغوب چیزوں کی طرف مبذول کراتا ہے: وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "اور اسی نے چوپایوں کو بنایا جن میں تمہارے لئے جاڑے کا سامان بھی ہے اور دوسرے بہت سے فائدے بھی ہیں۔ تم ان کا (گوشت کھاتے اور دودھ) پیتے ہو۔ ان کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جب تم ان کو شام کے وقت لاتے ہو اور صبح کے وقت چھوڑ دیتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے ہیں جہاں تم سخت تکلیف کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ واقعی تمہارا پروردگار بڑا شفیق اور مہربان ہے۔ اسی نے گھوڑے، خچر اور گدھے

پیدا کیئے تمہاری سواری اور زینت کے لیے۔ وہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں۔" (سورۂ نحل: آیت۵تا۸)

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ "وہ ایسا ہے جس نے تمہارے واسطے آسمان سے پانی برسایا۔ جس میں سے تم کو پینے کے لئے ملتا ہے اور جس سے درخت شاداب ہوتے ہیں جن میں تم مویشی چرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہو اور اس (پانی) سے وہ تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اُگاتا ہے۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانی ہے۔ اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ بے شک اس میں بھی سمجھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔" (سورۂ نحل: آیت۱۰تا۱۲)

خداوند کریم محسوسات میں اپنے وجود کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ لوگوں کو خالق کائنات کو پہچاننے میں آسانی ہو: وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ "اہل یقین کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی۔ کیا تم چشم بصیرت سے نہیں دیکھتے؟ تمہارا رزق اور وہ سب جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، آسمان میں ہے۔ قسم ہے زمین و آسمان کے پروردگار کی۔ یہ ایسا ہی برحق ہے جیسا تم باتیں کررہے ہو۔" (سورۂ ذاریات: آیت۲۰تا۲۳)

قرآن مجید انسان کو خود اس کی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خود انسان کی تخلیق باری تعالیٰ کے وجود کی عمدہ دلیل ہے۔ باری تعالیٰ نے انسان کو ایسی

بہترین شکل و صورت پر پیدا کیا کہ عقل حیران ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ''پڑھواپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو علق سے پیدا کیا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔'' (سورۂ علق: آیت ۱ تا ۵)

اس طرح کی محسوس دلیلیں قرآن مجید میں بکثرت دی گئی ہیں۔ مشرکوں کو جو قیامت کا انکار کرتے ہیں سرزنش کرتے ہوئے حضرت متعال کا ارشاد ہے: اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ''کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا یہ شخص محض ایک قطرۂ منی نہیں تھا جو ٹپکایا گیا تھا۔ پھر وہ خون کا ایک لوتھڑا ہو گیا۔ پھر اللہ نے اس کو انسان بنایا اور اس کے اعضاء درست کیئے۔ پھر اس کی دو قسمیں کردیں مرد اور عورت۔ کیا وہ اللہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کردے؟'' (سورۂ قیامت: آیت ۳۶ تا ۴۰)

هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ''کیا انسان پر ایسا وقت نہیں گزرا جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا؟ ہم نے پیدا کیا انسان کو مخلوط نطفے سے تاکہ اس کو آزمائیں۔ اس لئے ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔''

(سورۂ دہر: آیت ۱ و ۲)

حضرت متعال نے اپنی ان بے شمار نعمتوں میں سے جو اس نے انسان کو عطا کی ہیں چند کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ نعمتیں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ شکرگزار ہو اور ان نعمات کی خوبیوں کا اعتراف کرے۔ وَاللّٰهُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ اَلَمْ یَرَوْا

اِلَی الطَّیْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا وَّجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَھَا یَوْمَ ظَعْنِکُمْ وَیَوْمَ اِقَامَتِکُمْ وَمِنْ اَصْوَافِھَا وَاَوْبَارِھَا وَاَشْعَارِھَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ "اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس نے تم کو کان، آنکھ اور دل دیئے تا کہ تم شکر کرو۔ کیا لوگوں نے پرندوں کو فضائے آسمان میں مسخر نہیں دیکھا؟ ان کو کوئی نہیں تھامتا بجز اللہ کے۔ اس میں ایمان والے لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اللہ نے تمہارے واسطے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی اور تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام کے دن ہلکا پاتے ہو اور ان (جانوروں) کی اون، ان کے روؤں اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں بنائیں جو ایک مدت تک کام آتی ہیں۔" (سورۂ نحل: آیت ۷۸ تا ۸۰)

میں نے کتاب اللہ کے مطالعے کے دوران اکثر محسوس کیا ہے کہ قرآن مجید خدا پر ایمان اور اس کے وجود کا اعتراف منکرین اور متشککین کے دلوں میں اُتارتا ہے اور معترضین کے لئے راستہ بالکل بند کر دیتا ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرَاھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ اِذْ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرَاھِیْمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ "کیا تم اس شخص کے قصے سے واقف نہیں جس نے اپنے پروردگار کے بارے میں ابراہیمؑ سے بحث کی تھی کیونکہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا پروردگار تو ایسا ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے تو وہ کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال دے۔ اس پر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا کیونکہ اللہ ناانصافوں کو ہدایت نہیں دیتا۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۵۸)

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے محسوسات کے مشاہدے کے ذریعے سے منکرین کو روشنی دکھائی ہے جس سے وہ حیران اور خوفزدہ ہو کر اس حکیمانہ نظام کے چلانے والے پر ایمان لانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔

اسی سورت میں یہ قصہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پروردگار سے پوچھتے ہیں کہ آپ مُردہ کو اس کو فنا ہو جانے اور اس کے جسم کے گل سڑ جانے کے بعد کیسے زندہ کرتے ہیں؟ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی شبہ تھا بلکہ ان منکرین کے سامنے ایک دلیل پیش کرنی مقصود تھی جو محسوسات کے سوا کوئی بات نہیں مانتے۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ''تم چار پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلالو، پھر (ان کے ٹکڑے کر کے برابر برابر) ہر پہاڑ پر ایک حصہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ، وہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس چلے آئیں گے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۶۰)

اس طرح کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں۔ کبھی ایسی مثالیں بطور دلیل پیش کی جاتی ہیں جو اُن لوگوں کے خیالات اور ذہنی ساخت کے مناسب ہیں جن سے خطاب مقصود ہے۔ اور کبھی ایسی مستحکم دلیلیں پیش کی جاتی ہیں کہ توحید اور معاد و نبوت کے منکرین کے شبہات دھواں بن کر اُڑ جاتے ہیں کیونکہ ان منکرین کے دلائل علم و منطق کی بنیاد پر قائم نہیں ہیں بلکہ وہ دراصل جہل و عناد کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں اور اپنی خواہشات نفسانی اور شیطان کے گمراہ کن وسوسوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ قرآن مجید ان لوگوں کے متعلق فرماتا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِىَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ''کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے بارے میں بغیر کسی واقفیت، بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی روشن کتاب (کی سند

کے) محض تکبر کی وجہ سے جھگڑا کرتے ہیں تا کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکادیں۔ ایسے شخص کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور قیامت کے دن بھی ہم ان کو آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔" (سورۂ حج: آیت ۸و۹)

قرآن میں معاد کے دلائل

اللہ تعالیٰ ایسے دلائل بیان کرنے کے بعد جو منکرین اور شک کرنے والوں پر فرار کی راہ بند کردیتے ہیں، ان لوگوں کو جو ضد پر قائم اور شیطان کے پیرو ہیں دنیا میں رسوائی اور آخرت میں دردناک عذاب کی وعید سناتا ہے۔ ارشاد ہے: وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يَّسْمَعُ آيَاتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ "بڑی خرابی ہے ہر اس شخص کے لئے جو جھوٹا الزام لگانے والا گنہگار ہے۔ اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے جب وہ اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں۔ پھر بھی تکبر سے اپنی بات پر اڑا رہتا ہے جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ سو اسے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے اور جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی آیت کی خبر پاتا ہے تو اس کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ یہی لوگ تو ہیں جن کے لئے ذلّت کا عذاب ہے۔" (سورۂ جاثیہ: آیت ۷تا۹)

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ "جب نکالا آپ کے پروردگار نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی نسل کو اور خود ان ہی کو ان کی جانوں پر گواہ کیا اور کہا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو وہ بولے کہ ضرور ہے۔ ہم گواہی دیتے ہیں (یہ اس لئے ہوا) کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ شرک تو

ہمارے باپ دادا پہلے ہی سے کرتے آئے تھے اور ہم تو ان کی نسل میں بعد میں ہوئے۔ تو کیا تو ہلاک کردے گا ہمیں اہل باطل کے کرتوتوں کی وجہ سے؟"

(سورۂ اعراف: آیت ۱۷۲ و ۱۷۳)

اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو اپنی مادّی زندگی شروع کرنے سے پہلے جبکہ وہ ابھی ذرات کی شکل میں تھے جمع کیا اور ان کو خود ان کے اوپر گواہ بنایا اور ان سے اپنے وجود اور یکتائی کا اعتراف کرایا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! ہم گواہی دیتے ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنے لوگ قیامت تک نسلاً بعد نسلٍ پیدا ہونے والے تھے، ان کو ان کے باپوں کی پشتوں سے نکالا۔ چنانچہ وہ ذرات کی شکل میں نکلے۔ حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو ان سے پہچنوایا اور اپنی صنعت ان کو دکھائی۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ کسی کو کفر و شرک میں مبتلا ہونے کے لئے یہ عذر باقی نہ رہے کہ ہم خدا اور اس کی توحید سے بے خبر تھے۔ چنانچہ مندرجہ بالا آیت میں اس عذر کی تردید کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں توحید اور قیامت کے بارے میں زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آیتیں تو ہیں ہی جتنی احکام کے بارے میں۔ کیونکہ توحید اور قیامت ہی وہ دو اصول ہیں جن پر اسلام کے پیغام اور اس کی تعلیمات کی بنیاد ہے۔ اسی لئے ضروری ہوا کہ ان دو مضامین کو مختلف آیات میں باربار دہرایا جائے تاکہ جس ماحول میں کفر و شرک کا راج ہو اس ماحول پر کچھ اثر ہو۔ خصوصاً جاہل عربوں کا ماحول کہ اسلام کے جاودانی پیغام کی ابتدا وہیں سے ہوئی۔ چونکہ جاہل عربوں نے مدتوں سے خدا کی عبادت کی جگہ بت پرستی کو اپنا شیوہ بنایا ہوا تھا اس لئے ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس تخم فاسد کو جو اُن کے آباء نے ان کے دلوں میں بو دیا تھا، اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور ایک نیا نظریہ جس سے اس وقت تک عرب قطعاً ناآشنا تھے ان کے دلوں میں بٹھایا جائے۔

قرآن مجید مختلف طریقوں سے توحید پر زور دیتا ہے جو لوگوں کے خیالات اور ان کی سمجھ میں تفاوت کی وجہ سے ضروری تھا۔ قرآن مجید توحید کی اہمیت ایسے گوناگوں طریقوں سے بیان کرتا ہے کہ کسی کو اس سے انکار کی مجال نہیں رہتی۔ قرآن مجید کے اسی طریقے کی بدولت بہت سے منکرین اسلام کے گرویدہ ہو گئے اور اس کے اصول وفروع پر ایمان لے آئے۔

توحید اور دوسرے اسلامی اصولوں سے متعلق اکثر آیات مکے میں اور احکام کی اکثر آیات مدینے میں نازل ہوئیں۔ یعنی احکام سے متعلق آیات اس وقت نازل ہوئیں جب خدا اور رسول پر ایمان ہزاروں افراد کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محنت اور آپ کے جہاد کی بدولت کثیر تعداد میں لوگ اسلام لے آئے۔

قرآن میں احکام شریعت سے متعلق آیات

قرآن مجید میں تشریع سے متعلق آیات کا بیان شروع کرنے سے پہلے دو سوالوں کا جواب جاننا ضروری ہے:

۱۔ فقہ کی اصطلاح میں مکلف سے کیا مراد ہے اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

۲۔ قرآن مجید تشریعی احکام کس طرح بیان کرتا ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو قرآن مجید یا سنت نے جو احکام وضع کیے ہیں ان کی کئی قسمیں ہیں:

کچھ آیات تو انسان کے خدا کے ساتھ تعلق کے بارے میں ہیں یعنی عبادات کے بارے میں۔ان پر عمل اس وقت تک درست نہیں ہوگا جب تک قرب کی نیت اور قصد نہ ہو۔ یعنی جب تک ان آیات پر فرمان الٰہی بجالانے کی نیت سے عمل نہ کیا جائے۔ فقہاء کی زبان میں ان اعمال کو بدنی عبادات کہا جاتا ہے جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔

ان اعمال کو بجالانے سے مکلف کا مقصد ان ہی اعمال کو بجالانا ہوتا ہے کوئی اور مقصد نہیں ہوتا۔ گو ان اعمال پر اخلاقی اور اجتماعی آثار بھی مرتب ہوتے ہیں۔ جب کوئی مسلمان ان اعمال کو پورے خلوص سے انجام دیتا ہے اور خدا کی بے شمار نعمتوں اور اس کی بندگی کا اقرار کرتا ہے تو پھر ان اعمال کے نتائج اور آثار خود بخود اس کے لئے اور معاشرے کے لئے نکلنے لگتے ہیں۔

ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ''نماز گندے کاموں اور بری باتوں سے روکتی ہے۔'' (سورۂ عنکبوت: آیت ۴۵)

ان عبادات میں سے جو درست نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتیں ایک زکوٰۃ ہے جو اسلام نے دولت مندوں کے اموال پر عائد کی ہے۔ یہ ایک طرح کا محصول ہے جو واجب ہے اور جس سے غریبوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ صدر اسلام میں حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ زکوٰۃ ہی تھی۔ اگر زکوٰۃ اپنے مخصوص مصارف میں خرچ کی جائے تو اس عبادت میں بہت سی مصلحتیں ہیں جن میں سب سے اہم غریبوں اور حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرنا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ عَلَی اَغۡنِیَاءِ الۡمُسۡلِمِیۡنَ فِیۡ اَمۡوَالِهِمۡ بِقَدۡرِ الَّذِیۡ یَسَعُ فُقَرَآئَهُمۡ ''اللہ تعالیٰ نے دولتمند مسلمانوں کے اموال میں سے اتنا حصہ واجب قرار دیا ہے جو غریبوں کی ضرورت کے لئے کافی ہو۔'' نیز امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اَیُّمَا مُؤۡمِنٍ حَبَسَ مُؤۡمِنًا عَنۡ مَّالِهٖ وَهُوَ مُحۡتَاجٌ اِلَیۡهِ ، لَمۡ یُذِقۡهُ اللّٰهُ مِنۡ طَعَامِ الۡجَنَّةِ وَلَا یَشۡرَبُ مِنَ الرَّحِیۡقِ الۡمَخۡتُوۡمِ ''جو مومن احتیاج کے باوجود دوسرے مومن کو اپنے مال سے محروم رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا کھانا چکھنے نہیں دے گا اور نہ سربمہر شراب پینے دے گا۔'' (وسائل الشیعہ ج ۱۶، ص ۳۸۹)

ایک اور واجب جو نیت کے بغیر درست نہیں حج ہے۔ فقہاء اس کا بھی عبادات میں شمار کرتے ہیں۔ حج میں مکلف کو اعمال بجالانے کے علاوہ کچھ روپیہ بھی خرچ کرنا

پڑتا ہے لیکن شارع نے مال کو حج کا جزو قرار نہیں دیا ہے۔ مال کا ہونا اس عبادت کے وجوب کی شرط ضرور ہے مگر مکلف پر اس مقصد کے لئے مال کمانا واجب نہیں ہے۔ اصولی طور پر تمام شرائط وجوب کا جن کو علم اصول کی اصطلاح میں مقدمات واجب کہا جاتا ہے یہی حال ہے۔ اس عادت سے معاشرے کو متعدد فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر مسلمان اس پُرشکوہ اجتماع سے جس میں دنیا بھر سے لاکھوں مسلمان شریک ہوتے ہیں، صحیح فائدہ اٹھائیں تو ان روحانی فوائد کے علاوہ جو اس عبادت کے اکثر اعمال میں موجزن ہیں، مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کو اور بہت سے فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

قرآنی آیات کے ایک دوسرے حصے میں افراد کے مابین تعلقات سے متعلق احکام کا بیان ہے۔ ان آیات میں سے کچھ کا تعلق عائلی قوانین سے ہے جیسے نکاح، طلاق، رشتہ داروں سے تعلقات، میراث اور وصیت وغیرہ۔ کچھ آیات لین دین اور اس کی شرائط سے متعلق ہیں جیسے خرید و فروخت، اجارہ اور صلح وغیرہ۔ ان امور کو فقہاء "معاملات" کہتے ہیں۔ کچھ آیات میں مختلف جرائم کی سزاؤں اور حدود کا بیان ہے۔ کچھ آیات میں شکار اور جانوروں کے ذبح کرنے سے متعلق احکام بھی ہیں۔

یہ عنوان ہیں ان احکام کے جو کتاب اللہ یا سنت رسولؐ میں بیان کئے گئے ہیں جیسے نکاح اور اس سے متعلق مسائل، خرید و فروخت اور دوسرے معاملات، مختلف جرائم کی سزائیں وغیرہ۔ یہ احکام فقہی نقطۂ نظر سے عبادات کے تحت نہیں آتے اور ان کے صحیح ہونے کے لئے قربت و طاعت کا قصد ضروری نہیں۔ ان احکام میں وجوب کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان احکام پر عمل کرنا اور ان کو بجالانا واجب ہے قصد و نیت شرط نہیں۔ اس طرح کے احکام کو "واجب توصلی" کہا جاتا ہے اور بعض دفعہ ان کے لئے معاملات کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ شہید ثانی علیہ الرحمہ اپنی کتاب "قواعد" میں لکھتے ہیں:

"جس شرعی حکم کا اصل مقصود آخرت ہو خواہ یہ مقصد آخرت میں جلب منفعت

ہو یا دفع ضرر، اس کو عبادت کہا جاتا ہے۔"

آگے کہتے ہیں: "جس شرعی حکم کا مقصود دنیا ہو خواہ مقصد جلب منفعت ہو یا دفع ضرر اسے معاملہ کہا جاتا ہے۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جلب منفعت اور دفع ضرر ہدف اصلی ہے یا وہ نتیجہ جو اس کام پر مرتب ہوتا ہے۔"

احکام کے بیان کا قرآنی اسلوب

ایک اور نکتہ قابل توجہ ہے اور اس میں دوسرے سوال کا جواب بھی آجاتا ہے کہ قرآن مجید نے مختلف احکام کی نوعیت یعنی واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کے بیان کرنے کے لئے کوئی ایک طریقہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ اس مقصد کے لئے مختلف اور گوناگوں طریقوں سے کام لیا ہے۔

کچھ آیات میں واجب یا مستحب کے بیان کے لئے امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ "اللہ انصاف اور بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے۔" (سورۂ نحل: آیت ۹۰)

ایک اور جگہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کو واپس کردو جن کا ان پر حق ہے۔"

(سورۂ نساء: آیت ۵۸)

کبھی کسی کام کا حکم ان الفاظ میں دیا جاتا ہے کہ یہ بات تم پر لکھ دی گئی ہے:

وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ "تم پر مقتولین کا قصاص لکھ دیا گیا ہے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۷۹)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨالْوَصِيَّةُ "تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت نزدیک ہو تو وہ اگر کچھ مال چھوڑے تو وصیت کردے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۰)

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
''اے ایمان والو! تم پر روزہ لکھ دیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر لکھا گیا تھا جو تم سے پہلے ہوئے ہیں۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۳)

کبھی جملہ خبریہ کے ذریعے سے کسی عمل کو واجب بتلایا جاتا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ''اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس گھر کا حج کرنا ہے یعنی جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔''
(سورۂ آل عمران: آیت ۹۷)

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ''جس کا بچہ ہے اس کے ذمے ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدے کے مطابق۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۳)

بعض جگہ جو عمل جس سے مطلوب ہے اس سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسا کرے:

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ ''مطلقہ عورتیں اپنے تین بار پاک ہونے کا انتظار (عدت) کریں۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۲۸)

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ''تم میں سے جو لوگ فوت ہوجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں چار مہینے دس دن تک اپنے آپ کو انتظار میں روکے رکھیں۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۴)

کبھی کسی کام کا حکم یوں دیا جاتا ہے کہ یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کام واجب نہیں:

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ''اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلائیں (یہ مدت اس کے لئے ہے) جو شیر خوارگی کی مدت کی تکمیل چاہے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۳)

آخری فقرے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ لازمی حکم نہیں اور یہ کہ شیر خوارگی کی زیادہ سے زیادہ حد دو سال ہے۔

کبھی کسی عمل کا وجوب یا تو صیغۂ امر سے ظاہر کیا جاتا ہے یا ایسے جملہ خبریہ

سے جس میں عربی فعل پر لام طلب داخل ہو:

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰى "نمازوں کی پابندی رکھو خصوصاً درمیانی نماز کی۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۸)

مذکورہ آیت میں نماز کی پابندی کے حکم کیلئے فعل امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

کبھی کسی کام کا حکم جملہ شرطیہ کے ذریعے دیا جاتا ہے یعنی اگر ایسا ہو تو ایسا کرو:

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ "حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو۔ اور اگر تم (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو (اسے ذبح کردو)۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۶)

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ "اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو وہ (سر منڈوانے کا بدلہ) روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے فدیہ دیدے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۶)

بعض آیات میں کسی کام کی ترغیب دینے کے لئے اس کے اچھے انجام کا ذکر ہوتا ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کام مطلوب ہے: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً "کون ایسا ہے جو اللہ کو اچھا قرضہ دے پھر اللہ اس کو بڑھا کر اس کے لئے کئی گنا کردے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۴۵)

کبھی مطلوبہ عمل کا حکم اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس کی کوئی ایسی خوبی بیان کردی جاتی ہے جو عمل کرنے والے کے لئے مفید مطلب ہو: وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ "یہ تو کچھ بھی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔ بلکہ نیکوکار وہ ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔"

(سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۹)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ "جب تک اپنی محبوب چیزوں کو (راہ خدا میں) خرچ نہیں کروگے نیکی کے مرتبہ کو نہیں پہنچوگے۔" (سورۂ آل عمران: آیت ۹۲)

ان کے علاوہ اور بھی طریقے ہیں جو مختلف موقعوں پر مختلف وجوہ سے استعمال کئے گئے ہیں۔

کچھ اعمال ایسے ہیں کہ شارع کے نزدیک اچھا یہ ہے کہ ان کو ترک کردیا جائے کیونکہ ان میں فرد یا معاشرے کا کوئی دنیاوی یا اخروی فائدہ نہیں جس طرح کسی کام کے حکم کے لئے مختلف صیغے اور مختلف طریقے استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح کسی کام سے روکنے اور منع کرنے کے لئے بھی مختلف صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔

کبھی کسی کام کی ممانعت کے لئے ''نہی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جیسے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ''بے شک اللہ عدل کا اور حسنِ سلوک کا اور اہل قرابت کو دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور گندی بات سے اور برائی سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔''
(سورۂ نحل: آیت ۹۰)

اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ''اللہ تم کو صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی۔'' (سورۂ ممتحنہ: آیت۹)

ان دونوں آیتوں میں جملہ خبریہ ہے لیکن ممانعت کے لئے ''نہی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے حکم کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اس نہی یا ممانعت کے لئے تحریم کا لفظ آیا ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْىَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ''آپ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے تو بس گندی باتوں کو حرام کیا ہے، ان میں سے جو ظاہر ہوں ان کو بھی اور جو پوشیدہ ہوں ان کو بھی اور گناہ کو اور ناحق کسی پر

زیادتی کو اور اس کو کہ تم اللہ کے ساتھ شریک کرو جس کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور اس کو کہ تم اللہ کے ذمہ ایسی جھوٹ بات لگادو جس کی تم کوئی سند نہیں رکھتے۔" (سورۂ اعراف: آیت۳۳)

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ "آپ کہہ دیجئے کہ آؤ میں تمہیں پڑھکر سناؤں وہ چیزیں جو تم پر تمہارے پروردگار نے حرام کی ہیں" (سورۂ انعام: آیت۱۵۱)

اسی طرح قرآن مجید میں متعدد آیتیں آئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ فلاں عمل جائز نہیں، اس سے خودبخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ عمل حرام ہے: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا آتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا "تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو مال تم ان عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو" (سورۂ بقرہ: آیت۲۲۹)

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ "ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں جو پیدا کر رکھا ہے وہ اسے چھپائیں۔"

(سورۂ بقرہ: آیت۲۲۸)

کبھی کسی عمل کو ترک کردینے کا حکم دینے کے لئے نہی کا صیغہ یعنی فعل مضارع علامت نہی "لا" کے ساتھ استعمال ہوتا ہے: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ "یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ مگر اس طریق پر جو مستحسن ہو۔"

(سورۂ انعام: آیت۱۵۲)

کبھی اسی مقصد کے لئے امر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے: وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ "چھوڑ دو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی۔"

(سورۂ انعام: آیت۱۲۰)

بعض موقعوں پر اللہ تعالیٰ یہ کہہ کر کہ اس کام میں کوئی فائدہ نہیں یا یہ کوئی نیکی کی بات نہیں اس کام سے منع فرماتا ہے: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ

''یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔''
(سورۂ بقرہ: آیت ۱۷۷)

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ
''جو کوئی ان مہینوں میں اپنے اوپر حج مقرر کرلے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہے، نہ کوئی نافرمانی اور نہ کوئی لڑائی جھگڑا۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۷)

ان امور کے نہ ہونے کا حقیقت میں مطلب یہ ہے کہ شریعت میں ان کی ممانعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ کوئی بندہ یہ کام کرے۔ کبھی بات کے مفہوم سے ممانعت کا حکم نکلتا ہے جیسا کہ اُن مثالوں میں جہاں کسی عمل پر خدا کے غصے یا اخروی عذاب کا ذکر ہے: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيمٍ ''جو لوگ کہ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اس کو راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے آپ انہیں ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔''
(سورۂ توبہ: آیت ۳۴)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَآ آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ''جو لوگ کہ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔ نہیں بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے۔'' (سورۂ آل عمران: آیت ۱۸۰)

خلاصہ یہ ہے کہ امر و نہی کے بیان کے لئے قرآن مجید نے کوئی ایک روش نہیں اپنائی بلکہ ان تمام طریقوں پر عمل کیا ہے جو لوگ اپنا مقصد بیان کرنے کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ لوگ جس طرح مختلف موقعوں پر اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں اسی طرح قرآن مجید نے بھی گوناگوں طریقے اختیار کئے ہیں۔ جیسے واجب اور حرام کو قرآن مجید نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسی

طرح مباح کو بھی کہیں حلال کہا ہے اور کہیں یہ کہا ہے کہ اس میں کوئی گناہ یا عیب نہیں۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔ بہرحال شرعی احکام کے بیان کے لئے قرآن مجید کا کوئی مخصوص طریقہ یا مخصوص الفاظ نہیں ہیں۔ مقتضائے مقام کے لحاظ سے گوناگوں طریقوں سے کام لیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں نماز کا ذکر

ہم نے پہلے کہا تھا کہ کچھ احکام کا محور بندے کا اپنے پروردگار سے تعلق ہوتا ہے۔ ایسے احکام کو عبادات کہا جاتا ہے اور عبادات قربت کی نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتیں۔ اس طرح کے احکام میں نمایاں ترین نماز ہے۔ عربی میں نماز کو صلوٰۃ کہتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صلوٰۃ کا لفظ اسلام کا وضع کیا ہوا نہیں ہے کیونکہ عربی زبان میں اسلام سے پہلے بھی یہ لفظ دعا اور استغفار کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ دورِ جاہلیت کے مشہور شاعر اعشیٰ کا شعر ہے:

وَصَهْبَاءُ طَافِ يَهُوْدِيُّهَا وَاَبْرَزَهَا وَعَلَيْهَا خَتَم
وَقَابَلَهَا الرِّيْحُ فِيْ دَنِّهَا وَصَلّٰى عَلٰى دَنِّهَا وَارْ تَسَم

یہاں صلّٰی دعا کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد اس کی دعا ہے کہ شراب خراب نہ ہو۔

قرآن مجید میں لفظ صلوٰۃ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً اس آیت میں:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوَاتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ''اگر اللہ لوگوں کا زور ایک دوسرے سے نہ گھٹاتا رہتا تو (راہبوں کی) خانقاہیں (عیسائیوں کے) گرجے (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، سب منہدم کر دیئے گئے ہوتے۔'' (سورۂ حج: آیت ۴۰)

صلوٰۃ کا لفظ صلوٰۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی عبرانی میں "نماز خانہ" کے ہیں۔ عربوں نے صلوٰۃ کا لفظ دعا کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ادبی قاعدے کے مطابق اسم مکان کو مجازاً اس کام کے معنی میں استعمال کیا جاسکتا ہے جو وہاں انجام دیا جاتا ہو۔ دوسری جگہ عربی میں صلوٰۃ کا لفظ درود اور دعا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ "آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے۔اس کے ذریعے سے آپ انہیں پاک کردیں گے اور آپ ان کے لئے دعائے خیر کیجئے۔بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے باعث تسکین ہے۔" (سورۂ توبہ: آیت ۱۰۳) اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَآئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا "بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود وسلام بھیجتے ہیں۔اے ایمان والو!تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو اور ان کے حکم کے آگے خوشدلی سے سر تسلیم خم کردو۔" (سورۂ احزاب: آیت ۵۶)

ان دو آیتوں میں صلوٰۃ کے معنی دعا اور درود کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

جاہل عربوں کی نماز بھی ایام حج میں سوائے دعا کے اور کچھ نہ تھی۔ابن عباسؓ کہتے ہیں: "قریش ننگ دھڑنگ خانۂ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے اور تالیاں بجایا کرتے تھے۔" ان ہی کاموں کا نام عربوں نے صلوٰۃ رکھا ہوا تھا۔اللہ تعالیٰ ان کی اس عادت کو اس طرح بیان کرتا ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً "ان کی صلاۃ خانۂ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔" (سورۂ انفال: آیت ۳۵)

حضرت مجاہدؒ اور حضرت قتادہؒ سے روایت ہے کہ:

"پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو کافر ان کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور لگے شور مچانے اور تالیاں بجانے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز میں خلل ڈال کر آپ کو اس فریضہ الٰہی کے ادا کرنے سے باز رکھیں۔"

اس روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شور مچانا اور تالیاں بجانا ان کے نزدیک عبادت میں شمار نہیں تھا بلکہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف دینے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ لیکن مندرجہ بالا آیت بظاہر ابن عباسؓ کی اس روایت کی تائید کرتی ہے کہ وہ ان دونوں کاموں کو عبادت سمجھتے تھے۔ متعدد مفسرین نے بھی لکھا ہے کہ عرب ننگے بدن خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جن کپڑوں میں وہ گناہ کرتے ہیں ان ہی کپڑوں میں خدا سے راز و نیاز میں مشغول ہوں۔ جب اسلام آیا تو اس نے حکم دیا کہ عبادت کے وقت کپڑے پہنے رہا کریں۔

يَا بَنِيٓ آدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا

"اے اولاد آدم ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہن لیا کرو۔ اور کھاؤ پیو لیکن اسراف سے کام نہ لو۔" (سورۂ اعراف: آیت ۳۱)

اسلام سے قبل صلوٰۃ کے کچھ بھی معنی کیوں نہ ہوں اسلام میں اور قرآن مجید کی زبان میں اس کے وہی معنی ہیں جو مسلمانوں میں معروف ہیں اور اسی معنی میں صلوٰۃ کو اللہ نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے خواہ یہ معنی لغوی معنی سے ہٹ کر ہوں یا اس لفظ کے اس مفہوم میں کثرت استعمال کی وجہ سے یہ معنی اس لفظ کے مجازی معنی بنا لئے گئے ہوں اور اب یہی معین معنی بن گئے ہوں۔ بہرحال یا تو شارع نے یہ لفظ پہلے معنی کو بدل کر نئے معنی کیلئے وضع کیا ہے یا نئے معنی میں مجازاً استعمال کیا ہے۔ دوسری صورت میں یہ لفظ نئے اور پرانے دونوں معنوں کے لئے مشترک ہوگا۔

قرآن مجید میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس پر اس قدر زور دیا گیا ہو اور اتنی تاکید کی گئی ہو جتنی نماز کی۔ قرآن مجید نے بہت سی جگہوں پر نماز کے وجوب اور اس کی اہمیت کی اس طرح تصریح کی ہے کہ کسی تفسیر اور تاویل کی گنجائش نہیں۔ کسی جگہ صراحت کے ساتھ نماز کا حکم دیا گیا ہے، کسی جگہ تارکین نماز کو سرزنش کی گئی ہے اور کسی جگہ نماز کی پابندی کرنے والوں کی تعریف اور ان کی ہمت افزائی کی گئی ہے۔

ہر صورت میں مقصد نماز کی اہمیت بیان کرنااوراس کے وجوب کی طرف توجہ دلانا ہے۔احادیث نبوی میں بھی نماز کی اسی طرح تاکید آئی ہے جس طرح قرآن مجید میں۔

ایک حدیث میں منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اِنَّهَا اِنْ قُبِلَتْ قُبِلَ مَا سِوَاهَا مِنَ الْاَعْمَالِ الَّتِیْ فَرَضَهَا الْاِسْلَامُ وَاِنْ رُدَّتْ رُدَّمَا سِوَاهَا ''اگر نماز اللہ تعالیٰ کے دربار میں قبول ہوجائے تو آدمی کے دوسرے اعمال بھی قبول ہو جائیں گے اور اگر نماز قبول نہ ہوتو اس کے دوسرے اعمال کا بھی کوئی اجر وثواب نہ ہوگا۔''

ایک اور حدیث میں آیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ اَوَّلُ مَا یُسْاَلُ عَنْهُ الْعَبْدُ یَوْمَ یَقِفُ النَّاسُ الْحِسَابَ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ ''پہلی چیز جس کی روز حشر پرسش ہوگی وہ نماز ہے۔''

ایک اور حدیث کہتی ہے: اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ ''نماز مومن کی معراج ہے۔''

خود قرآن مجید میں ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ یعنی نماز آدمی کو گناہوں اور برائیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ (سورۂ عنکبوت : آیت ۴۵)

گو قرآن مجید نے اس فریضے کو بڑی اہمیت دی ہے اور مسلمانوں کو اس کی پابندی کی تلقین کی ہے لیکن اس کی بعض جزئیات کو جیسے نمازوں کی تعداد، ہر نماز کی رکعات کی تعداد وغیرہ، ان چیزوں کو وضاحت سے بیان نہیں کیا ہے۔

نماز کے بارے میں قرآنی آیات چند مضامین پر مشتمل ہیں۔کچھ آیات میں تو اس کے وجوب کا بیان ہے۔کچھ دوسری آیات میں نماز پڑھنے کی تاکید اور ترغیب ہے۔بعض آیات میں اجمالی طور پر نماز کی کیفیت کا بیان ہے اور بعض دوسری آیات میں مختصر طور پر اس کے اوقات بتلائے گئے ہیں مگر دوسرے مضامین کے ذیل میں اسی اجمال کی وجہ سے مسلمان علماء میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے جس کو ہم مختصراً بیان کریں گے۔قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسلامی فرائض کے اصول اور ان کی بنیادی باتیں بیان کرتا ہے۔جزئیات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چھوڑ دیتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ''ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ آپ جو کچھ ان لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے

اس کی وضاحت کردیں تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں۔" (سورۂ نحل: آیت ۴۴)

قرآن مجید نے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغام الٰہی پہنچانے کا ذمے دار قرار دیا ہے اسی طرح امت کے لئے بھی یہ لازمی قرار دیا ہے کہ وہ رسول کے کلام (حدیث) اور خدا کے کلام (قرآن) میں فرق نہ سمجھیں کیونکہ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى "وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں نہیں بناتے۔ان کی بات (خدا کی بات ہے یعنی) وحی ربانی ہے جو اُن پر بھیجی جاتی ہے۔" (سورۂ نجم: آیت ۳و۴)

قرآن مجید نے براہ راست مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا ہے: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا "جو کچھ رسولؐ تمہیں دیں اسے قبول کرلو اور جس سے وہ منع کریں اس سے رک جاؤ۔"[۱] (سورۂ حشر: آیت ۷)

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوامر و نواہی اور قرآن مجید کے اوامر و نواہی کے درمیان کچھ فرق نہیں۔ چنانچہ آپ نے ان ہی باتوں کی تفصیل بیان کی ہے جن کا قرآن مجید میں مجمل تذکرہ تھا۔قرآن مجید نے جن امور کو واجب یا حرام کہا ہے آپ نے ان کی تشریح کی ہے۔ اس طرح آپ نے حجت تمام کردی اور یہ گنجائش نہیں چھوڑی کہ بالفاظ قرآن کوئی یہ کہہ سکے کہ:

رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى "پروردگار تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم تیرے احکام کی پیروی کرنے لگتے اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوں۔" (سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۳۴)

ہم یہاں اس مسئلے کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے بلکہ نماز سے متعلق چند آیات نقل کرتے ہیں جو طرز بیان کے اختلاف کے باوجود اس عظیم عبادت کے وجوب کی گواہ ہیں۔

۱۔ کسی نے معصومؑ سے پوچھا کہ آپ اہلبیتؑ کو قرآن کی کون سی آیت پر فخر ہے تو معصومؑ نے جواب میں یہی آیت تلاوت فرمائی کیونکہ یہ آیت رسول اکرم ﷺ کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔

نماز کے بارے میں آیات قرآنی

قرآن مجید میں ارشاد ہے: اَقِمِ الصَّلاۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا "نماز ادا کیا کیجئے آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کا اندھیرا ہونے تک اور فجر کی نماز بھی۔ بے شک فجر کی نماز گواہی شدہ ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۷۸) وَاَقِمِ الصَّلاۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ "نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں۔" (سورۂ ہود: آیت ۱۱۴) حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوَاتِ وَالصَّلاۃِ الْوُسْطٰی "نمازوں کی پابندی رکھو خصوصاً درمیانی نماز کی۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۸)

اور بھی آیات ہیں جو اسلام کے ایک اعلیٰ اصول کی حیثیت سے نماز کی اہمیت بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ آیات مختصر طور پر نماز کے ارکان جیسے رکوع، سجود اور شرائط جیسے طہارت وغیرہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ نماز کی باتیں جزئیات کی تشریح اور نماز کے اوقات کی تفصیل جس کا قرآن میں اجمالی تذکرہ ہے رسول اکرمؐ پر چھوڑ دی گئی ہے۔ یہ فرض آپ نے اپنی حیات کے دوران میں انجام دیا اور باقی جس چیز کی امت کو دین و دنیا میں ضرورت تھی اس کا بیان آپ نے اپنے فرزندوں اور بعض اصحاب کو سونپ دیا اور امت مسلمہ کو اس راہ پر چلنے کی ہدایت کی جس راہ پر چل کر وہ کبھی گمراہ نہیں ہوسکتی۔ یہ راہ وہی ہے جس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا:

"میں تم میں دو قیمتی چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں ایک قرآن اور دوسرے میری عترت یعنی اہلبیتؑ۔ اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہوگے تو میرے بعد ہرگز کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔"[1] (یہ حدیث ثقلین امت کے لئے سامان ہدایت ہے)

---

[1] امام مالک اپنی موطا میں نقل کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا:
میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ اگر تم ان سے وابستہ رہوگے تو میرے بعد گمراہی سے بچ جاؤگے (اور وہ ہیں) قرآن اور میری سنت۔ (یہ حدیث مرسل ہے اور صحاح ستہ

یہ حدیث مختلف طرق سے مروی ہے اور متن میں تھوڑے تھوڑے فرق سے

میں بھی موجود نہیں ہے۔ اس حدیث پر شیعہ مذہب قبول کرنے والے جناب شیخ معتصم سید احمد سوڈانی نے اپنی کتاب حقیقت گمشدہ ،مطبوعہ مجمع علمی اسلامی میں بڑی عمدہ بحث کی ہے)۔ کتاب اللہ وسنتی کی حدیث کو جان بوجھ کر شہرت دی گئی اور اس حدیث کو کتابوں میں اتنی بار نقل کیا گیا اور منابر پر اس کا اتنا چرچا کیا گیا کہ صحیح مسلم کی حدیث کتاب اللّٰہ و عترتی اھل بیتی گوشۂ گمنامی میں چلی گئی بلکہ اگر آج کوئی مسلم کی حدیث بیان بھی کرے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث میں رسول خداؐ نے اپنے خلفاء کی تعداد بارہ بیان فرمائی ہے اور اس حدیث کے معیار پر شیعوں کے بارہ ائمہ کے علاوہ کوئی پورا نہیں اترتا مگر یہاں بھی حدیث کا رخ ائمہ اہلبیتؑ سے ہٹا کر بنی امیہ کے حکمرانوں کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ شیعہ اس حدیث سے اپنے ائمہ کی تعداد کے لئے استدلال نہ کرسکیں۔

یہاں ہم حضرت علامہ سید عبد الحسین شرف الدین کی المراجعات پر جناب حسین علی الراضی کے ضمیمہ سے حدیث ثقلین کے چند نمونے محترم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَّا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا، کِتَابُ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلُ بَیْتِیْ

دیکھئے:

(۱) صحیح ترمذی، ج۵، ص۳۲۸، حدیث۳۸۷۴، مطبوعه دارالفکر بیروت اور ج۱۳، ص۱۹۹، مطبوعه الصاوی مصر اور ج۲، ص۳۰۸، طبع بولاق مصر. نظم دررالسمطین زرندی حنفی، ص۲۳۳، مطبوعه القضاء نجف، ینابیع المودة، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۳۳، ۴۵، ۲۲۵، مطبوعه الحیدریه، اور ص۳۰، ۴۱، ۳۷۰، طبع استنبول. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ص۴۴، جلداول، طبع اول، اور ص۱۵۴، طبع دوم. تفسیرابن کثیر، ج۴، ص۱۱۳، مطبوعه دار احیاء الکتب العربیه مصر. مصابیح السنه، بغوی، ص۲۰۶، طبع قاهره. اور ج۲، ص۲۷۹، مطبوعه محمد علی صبیح. جامع الاصول، ابن اثیر جزری، ج۱، ص۱۸۷، حدیث۶۵، طبع مصر. معجم الکبیر، ابوالقاسم سلیمان بن احمد خمی طبرانی، ص۱۳۷. مشکوٰة المصابیح، ج۳، ص۲۵۸، طبع دمشق. فصل الخطاب (مخطوط)، خواجه محمد بخاری حنفی. احیاء المیت، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، برحاشیه الاتحاف بحب الاشراف،

ص۱۱۴، مطبوعه الحلبي. مفتاح النجا (مخطوط)، بدخشي، ارجح المطالب، عبيدالله امرتسري حنفي، ص۳۳۶، طبع لاهور. رفع اللبس والشبهات، ادريسي، ص۱۱، طبع مصر. السيف اليماني المسلول، ص۱۰، مطبوعه الترقي دمشق.

(۲) اني تارك فيكم ما ان تمسكتم به لن تضلوا بعدي احدهما اعظم من الأخر كتاب الله حبل ممدود من السمآء الي الارض و عترتي اهل بيتي ولن يفرقا حتي يردا عليّ الحوض فانظروا كيف تخلفوني فيهما.

صحيح ترمذي، ج۵، ص۳۲۹، حديث۳۸۷۶، مطبوعه دارالفكر بيروت، اور ج۲، ص۳۰۸، مطبوعه بولاق مصر، اور ج۱۳، ص۲۰۰، مطبوعه مكتبه الصاوي مصر. نظم درر السمطين زرندي حنفي، ص۲۳۱، مطبوعه القضا نجف. الدر المنثور في التفسير بالماثور، حافظ جلال الدين عبدالرحمن بن ابي بكر سيوطي شافعي، ج۶، ص۷و۳۰۶، طبع مصر. ذخائر العقبي، ص۱۶، مطبوعه مكتبة القدسي. الصواعق المحرقه في رد علي اهل البدعة والزندقه، شهاب الدين ابن حجر مكي هيثمي، ص۱۴۷و۲۲۶، مطبوعه المحمديه، اور ص۸۹، مطبوعه الميمنيه مصر. ينابيع المودة، سليمان ابراهيم قندوزي حنفي، ص۳۳، ۳۰، ۲۲۶، ۳۵۵، مطبوعه الحيدريه، اور ص۳۰، ۳۶، ۱۹۱، ۲۹۶، طبع استنبول. معجم الصغير، ابوالقاسم سليمان بن احمد خمي طبراني، ج۱، ص۱۳۵، مطبوعه دارالنصرمصر. اسدالغابه في معرفة الصحابه، ابن اثير جزري شافعي، ج۲، ص۱۲، آفست طبع مصر. تفسيرابن كثير، ج۴، ص۱۱۳، مطبوعه داراحياء الكتب العربيه مصر. عبقات الانوار، حامد حسين موسوي هندي، ج۱، ص۲۵، طبع اصفهان. كنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شيخ علاؤالدين علي المتقي حسام الدين برهانپوري، ج۱، ص۴۴، حديث۸۷۴، طبع اول، جلداول، طبع دوم، ص۱۵۴. الفتح الكبير، نبهاني، ج۱، ص۴۵۱، مطبوعه دارالكتب العربيه مصر. تفسيرالخازن، علاؤالدين علي بن محمد بغدادي، ج۱، ص۴، مطبوعه مصطفي محمدمصر. مصابيح السنه، بغوي، ص۲۰۶، مطبوعه الخيريه مصر، اور ج۲، ص۲۷۹، مطبوعه محمد علي صبيح مصر. الجمع بين الصحاح (مخطوط)، عبدري. جامع الاصول، ابن اثيرجزري، ج۱، ص۱۸۷، حديث۶۶، طبع مصر. المنتقي في سيرة المطفيٰ (مخطوط)، شيخ سعيد شافعي. علم الكتاب، سيد خواجه حنفي، ص۲۶۴، طبع دهلي.

بعض لوگ اس راستے سے ہٹ گئے اور ایک دوسرا راستہ اختیار کرلیا۔ اس

منتخب تاریخ، ابوالقاسم علی بن حسن المعروف به ابن عساکر دمشقی شافعی، ج۵، ص۴۳۶، طبع دمشق. مشکوۃ المصابیح، عمری، ج۳، ص۲۵۸، طبع دمشق (بحواله احقاق الحق، ج۹). تیسیر الوصول ابن دیبع، ج۱، ص۱۶، مطبوعه نول کشور، لکهنؤ. التاج الجامع للاصول، ج۳، ص۳۰۸، طبع قاهره. رفع اللبس والشبهات، ص۵۲، طبع مصر. ارجح المطالب، شیخ عبیداللّٰه امرتسری حنفی، ص۳۳۶، طبع لاهور. السیف الیمانی المسلول، ص۱۰، مطبوعه ترقی دمشق.

(۳) انی تارک فیکم خلیفتین: کتاب اللّٰه حبل ممدود ما بین السمآء والارض ـ او ما بین السمآء الی الارض ـ وعترتی اهل بیتی، وانهما لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض.

مسند احمد بن حنبل، ج۵، ص۱۸۲و۱۸۹، مطبوعه المیمنیه. تفسیر درمنثور، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، ج۲، ص۶۰، طبع مصر. احیاء المیت، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، برحاشیه الاتحاف بحب الاشراف، ص۱۱۶، مطبوعه الحلبی مصر. ینابیع الموده، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۳۸و۲۱۷، طبع استنبول، اور ص۴۲، ۲۱۷، مطبوعه الحیدریه. مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حافظ نورالدین علی بن ابی بکر هیثمی شافعی، ج۹ ص۱۶۲، مطبوعه القدسی. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ج۱، ص۴۴، حدیث ۸۷۳، طبع اول، اور ج۱، ص۱۵۴، طبع دوم. عبقات الانوار، حامد حسین موسوی هندی، ج۱، ص۱۶، طبع اصفهان. جامعه الصغیر، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، ج۱، ص۳۵۳، طبع مصر. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ج۱، ص۱۵۴، حدیث۸۷۳، ۹۴۸، طبع دوم. مفتاح النجا (مخطوط)، بدخشی، ص۹. فتح الکبیر، نبهانی، ج۱، ص۴۵۱، مطبوع دارالکتب مصر. ارجح المطالب، شیخ عبیداللّٰه امرتسری حنفی، ص۳۳۵، طبع لاهور.

(۴) انی تارک فیکم الثقلین: کتاب اللّٰه واهل بیتی، وانهمالن یفترقاحتی یردا علیّ الحوض.

طرح بہت سے اصول وفروع میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا۔

مستدرک علی الصحیحین، محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری، ج۳، ص۱۴۸، طبع حیدرآباد دکن۔ تلخیص المستدرک، ذھبی، بذیل المستدرک، مناقب علی ابن ابی طالبؑ، شیخ علی بن محمد بن مغازلی شافعی، ص۲۳۴، حدیث۲۸۱، طبع اول تھران۔ المناقب، خطیب خوارزمی حنفی، ص۲۲۳، مطبوعہ حیدریہ۔ فرائد السمطین، حموینی شافعی، ج۲، باب۳۳، وعترتی اھل بیتی کے بعد یہ الفاظ ہیں: الا وھما الخلیفتان من بعدی (مخطوط)۔

(۵) انی اوشک ان ادعی، فاجیب وانی تارک فیکم الثقلین: کتاب اللہ عزوجل وعترتی کتاب اللہ حبل ممدود... الخ۔

مسند احمد بن حنبل، ج۳، ص۱۷، ۲۶، مطبوعہ المیمنیہ مصر۔ کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برھان پوری، ج۱، ص۴۷، طبع اول، جلداول، ص۱۶۵، حدیث۹۴۵، طبع دوم، مناقب علی بن ابی طالبؑ۔ شیخ علی بن محمد بن مغازلی شافعی، ص۲۳۵، حدیث۲۸۳، طبع اول تھران۔ الصواعق المحرقہ فی رد علی اھل البدعۃ والزندقہ، شھاب الدین ابن حجر مکی ھیثمی، ص۱۴۸، مطبوعہ المحمدیہ، اس اشاعت میں لم یفترقا ہے جبکہ طبع اول، ص۸۹، مطبوعہ المیمنیہ مصر میں لفظ لن یفترقا لکھا ہے۔ ذخائر العقبی، ص۱۶، مطبوعہ مکتبۃ القدسی اور دارالمعرفہ۔ اسعاف الراغبین، محمد علی صبان مصری شافعی حاشیہ بر نورالابصار، ص۱۰۸، مطبوعہ السعیدیہ مصر، اور ص۱۰۱، مطبوعہ العثمانیہ مصر۔ ینابیع المودہ، سلیمان ابراھیم قندوزی حنفی، ص۳۵، ۴۰، ۳۵۵، ۲۲۶، مطبوعہ الحیدریہ، اور ص۳۱، ۳۶، ۱۹۱، ۲۶۹، طبع استنبول۔ السیرۃ النبویۃ، مفتی مکہ احمد زینی دحلان شافعی، برحاشیہ السیرۃ الحلبیۃ، ج۳، ص۳۳۱، مطبوعہ البھیۃ مصر۔ المعجم الصغیر، ابوالقاسم سلیمان بن احمد لخمی طبرانی، ج۱، ص۱۳۱، مطبوعہ دارالنصر مصر، اور ص۷۳، طبع دھلی۔ مقتل الحسین، خطیب خوارزمی حنفی، ج۱، ص۱۰۴، مطبوعہ الزھرا۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حافظ نورالدین علی بن ابی بکر ھیثمی شافعی، ج۹، ص۱۶۳، مطبوعہ القدسی۔ احیاء المیت، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، برحاشیہ الاتحاف بحب الاشراف، ص۱۱۱، مطبوعہ الحلبی۔ طبقات الکبری،

محمد بن سعد بصری، ج۲، ص۱۹۴، مطبوعه دارصادر بیروت. اور ج۲، ق۲، ص۲، طبع لیڈن. جامع الاصول، ابن اثیر جزری، ج۱، ص۱۸۷، مطبوعه السنة المحمدیة. رموز الاحادیث، شیخ احمد حنفی، ص۱۴۴، مطبوعه الاستانة. ارجح المطالب، شیخ عبداللّٰه امرتسری حنفی، ص۱۳۶، طبع لاهور. الانوار المحمدیه، نبهانی، ص۴۳۵، مطبوعه الادبیه بیروت.

(۶) کأنی دعیت فأجبت انی قد ترکت فیکم الثقلین، احدهما اکبر من الاخر: کتاب اللّٰه تعالیٰ و عترتی... الخ (خطبهٔ غدیر)

مستدرک علی الصحیحین، محمد بن عبداللّٰه حاکم نیشاپوری، ج۳، ص۱۰۹، طبع حیدرآباد دکن. تلخیص المستدرک، ذهبی، بذیل المستدرک. خصائص امیرالمومنین، حافظ ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی شافعی، ص۲۱، مطبوعه التقدم مصر. اور ص۹۳، مطبوعه الحیدریه. اور ص۳۵، طبع بیروت. المناقب، خطیب خوارزمی حنفی، ص۹۳، مطبوعه الحیدریه. الصواعق المحرقه فی رد علی اهل البدعة والزندقه، شهاب الدین ابن حجر مکی هیثمی، ص۱۳۶، مطبوعه المیمنیه مصر. اور ص۲۲۶، المحمدیه مصر. ینابیع المودة، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۳۲، طبع استنبول. اور ص۳۶، مطبوعه الحیدریه. الغدیر فی الکتاب والسنة والادب، علامه عبدالحسین احمد امینی، ج۱، ص۳۰، طبع بیروت. کنزالعمال من سنن الاقوال والافعال، شیخ علاؤالدین علی المتقی حسام الدین برهانپوری، ج۱، ص۱۶۷، حدیث۹۵۳، اور ج۱۵، ص۹۱، حدیث۲۵۵، طبع دوم.

(۷) الست اولی بکم من انفسکم؟ قالوا: بلی یارسول اللّٰه. قال: فانی سائلکم عن اثنین القرآن، وعترتی.

مجمع الزوائد و منبع الفوائد، حافظ نورالدین علی بن ابی بکر هیثمی شافعی، ج۵ ص۱۹۵، مطبوعه القدسی. اسدالغابه فی معرفة الصحابه، ابن اثیر جزری، ج۳، ص۱۴۷، طبع مصر. احیاء المیت، حافظ جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی شافعی، برحاشیه الاتحاف بحب الاشراف، ص۱۱۵، مطبوعه الحلبی مصر. عبقات الانوار، حامد حسین موسوی هندی، ج۲، مجلد۱۲، ص۲۲۵.

حرف گیری کرنے اور اپنی من مانی کرنے کا موقع ملتا ہے۔

(۸) ایها الناس یوشک ان اقبض قبضا سریعا، فینطلق، بی، وقد قدمت الیکم القول معذرة الیکم، الا انی مخلف فیکم کتاب الله (ربی) عزوجل، وعترتی اهل بیتی، پھر آنحضرت نے حضرت علیؑ کا ھاتھ بلند کیا اور فرمایا: هذا علی مع القرآن، والقرآن مع علی، لا یفترقان حتی یردا علیّ الحوض...الخ.

الصواعق المحرقه فی رد علی اهل البدعة والزندقه، شهاب الدین ابن حجر مکی هیثمی، ص۱۲۴، اور ص۷۵، مطبوعه المیمنیه مصر. ینابیع المودہ، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۲۸۵، طبع استنبول. اور ص۳۴۲، مطبوعه الحیدریه.

(۹) ایها الناس فانما انا بشر یوشک ان یأتی رسول ربی فأجیب، وانا تارک فیکم الثقلین: اولها کتاب الله فیه الهدی والنور فخذوا بکتاب الله واستمسکوا به فحث علی کتاب الله ورغب فیه، ثم قال:

واهل بیتی، اذکر کم الله فی اهل بیتی، اذکر کم الله فی اهل بیتی، اذکر کم الله فی اهل بیتی.

صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل علی بن ابی طالبؑ، ج۲، ص۳۶۲، مطبوعه عیسی الحلبی، اور ج۷، ص۱۲۲، مطبوعه محمد علی صبیح، اور ج۱۵، ص۱۷۹، ۱۸۰، درشرح نووی، طبع مصر. مصابیح السنة بغوی شافعی، ج۲ ص۲۷۸، مطبوعه محمد علی صبیح، اور ج۲، ص۲۰۵، مطبوعه الخیریه مصر. نظم دررالمسطین، زرندی حنفی، ص۲۳۱، مطبوعه القضاء نجف. تفسیر الخازن، علاؤالدین علی بن محمد بغدادی، ج۱، ص۴، مطبوعه مصطفی محمد. تفسیر ابن کثیر، ج۴، ص۱۱۳، طبع دوم، داراحیاء الکتب العربیه. مشکوٰة المصابیح، عمری، ج۳، ص۲۵۵، طبع دمشق. اور ص۵۶۸، طبع دهلی. اسعاف الراغبین صبان شافعی برحاشیه نورالابصار، ص۱۰۰، مطبوعه العثمانیه. اور ص۱۰۸، مطبوعه السعیدیه. ینابیع المودہ، سلیمان ابراهیم قندوزی حنفی، ص۲۹، ۱۹۱، ۲۹۶، طبع استنبول. اور ص۲۳، ۲۲۶، ۳۵۵، مطبوعه الحیدریه. السیرة النبویه، مفتی مکه احمد زینی دحلان شافعی، برحاشیه سیرت حلبیه، ج۳، ص۳۳۰، مطبوعه البهیه مصر. الفتح الکبیر، نبهانی، ج۱، ص۲۵۲، مطبوعه داراحیاء الکتب العربیه مصر.

فقہ جعفری پر گفتگو کرتے ہوئے ان اسباب کی طرف اشارہ ناگزیر ہے جن کی وجہ سے شیعوں اور دوسروں کے مابین بعض ایسے فقہی مسائل میں اختلاف پیدا ہوگیا جن کی اصل قرآن یا حدیث نبوی میں ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قرآن مجید میں نماز کے وجوب کی تو تصریح ہے لیکن نماز کے اوقات کی پوری تعیین کے ساتھ ایسی صراحت نہیں ہے کہ پھر کسی تشریح اور گفتگو کی گنجائش ہی نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت اور شیعوں میں ظہر وعصر اور مغرب و عشاء کی نماز کے اوقات کے بارے میں آپس میں اختلاف ہے۔

شیعہ اپنے ائمہ کی پیروی میں ظہر وعصر اور اسی طرح مغرب وعشاء کی نمازوں کا اکٹھا پڑھنا سفر میں اور بغیر سفر کے، عذر کی حالت میں اور بغیر کسی عذر کے، عرفات میں اور غیر عرفات میں، غرض ہر حال میں جائز سمجھتے ہیں اور دوسرے، باختلاف آراء، سوائے خاص حالات کے جمع بین الصلوٰتین کو جائز نہیں سمجھتے۔ حنفی صرف عرفات اور مشعر الحرام میں نمازوں کو اکٹھا پڑھنے کے قائل ہیں۔ اہل سنت کے دوسرے مسلک، شافعی، مالکی اور حنبلی سفر میں بھی اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ دوسرے موقعوں پر کسی عذر کی وجہ سے مثلاً بارش، خوف یا بیماری کی حالت میں جمع بین الصلوٰتین جائز ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔[1]

شیعہ اپنے مسلک کی صحت پر ان صحیح احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو اہلبیت رسولؐ سے مروی ہیں۔ ان احادیث کے مطابق اکٹھی نماز پڑھنا ہر حالت میں جائز ہے۔ اس مسلک کو درست ثابت کرنے کے لئے ان صحیح احادیث سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے جو خود اہل سنت کے طریقے سے روایت ہوئی ہیں۔

۱۔ علامہ سید شرف الدین موسوی عاملی، مسائل فقہیہ ص ۴

مسلم نے اپنی صحیح کے باب جمع بین الصلوٰتین فی غیر السفر میں یحییٰ بن یحییٰ سے روایت کی ہے:

''میں نے یہ ابن عباسؓ کی روایت مالک کے سامنے پڑھی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازیں اکٹھی پڑھیں جبکہ نہ آپ سفر میں تھے اور نہ کوئی خوف تھا۔''

مسلم ہی نے ''صحیح'' میں ابو ربیع زہرانی سے، انہوں نے حماد بن زید سے انہوں نے عمر بن دینار سے انہوں نے جابر بن زید سے انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے میں ستاسی نمازیں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء ملا کر پڑھیں۔

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازیں اکٹھی ملا کر پڑھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا: صَنَعْتُ هٰذَا لِئَلَّا تَحْرُجَ أُمَّتِيْ میں نے اس لئے ایسا کیا کہ میری امت کو زحمت نہ ہو۔[1]

اس مضمون کی روایتیں بکثرت ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے میں بغیر کسی عذر کے صرف امت کی سہولت کے خیال سے دو نمازیں جمع کیں۔ چونکہ یہ روایتیں اہل سنت کے نزدیک بھی صحیح ہیں اس لئے مختلف سنی مسلک اپنے عقیدے کے مطابق ان کی تاویل اور اپنے نظریے کے مطابق ان کی تشریح کرتے ہیں۔

۱۔ علامہ سید شرف الدین موسوی عاملی، مسائل فقہیہ ص ۱۰

اوقات نماز

پنجگانہ نمازوں کے وقت کے تعین کے لئے ہمیں حسب ذیل آیت کی طرف رجوع کرنا چاہئے:

"ادا کیجئے نماز سورج ڈھلنے کے بعد سے (دلوک الشمس) رات کی تاریکی بڑھنے (غسق اللیل) تک اور فجر کی نماز بھی پڑھیئے۔ بے شک فجر کی نماز گواہی شدہ ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۷۸)

دلوک اور غسق کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ ان الفاظ کے کئی معنی آئے ہیں۔

امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

"اگر ہم غسق کو اندھیرا شروع ہونے کے معنی میں لیں تو اس سے مراد غروب آفتاب کے فوراً بعد کا وقت ہوگا۔ اس صورت میں اس آیت میں تین وقتوں کا بیان ہوگا۔ اول ظہر، دوسرا غروب اور تیسرے فجر۔ اس طرح اول ظہر نماز ظہر اور عصر کا وقت ہوگا اور اول غروب نماز مغرب اور عشاء کا۔ یہ ان نمازوں کے مشترک اوقات ہوں گے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ان نمازوں کا اکٹھے پڑھنا ہمیشہ جائز ہے۔[1]

امام فخر الدین رازی آگے چل کر لکھتے ہیں: "چونکہ ایسے دلائل موجود ہیں کہ جمع بین الصلوٰتین سفر کی حالت کے علاوہ بغیر کسی عذر کے جائز نہیں اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ سفر کی حالت میں اور بارش وغیرہ کی صورت میں جمع بین الصلوٰتین بغیر کسی اشکال کے صحیح ہے۔[2]

یہ تو اس صورت میں ہے کہ غسق سے مراد تاریکی کی ابتدا ہو لیکن اگر اس لفظ کے معنی آدھی رات کے وقت تاریکی کی شدت کے لئے جائیں جیسا کہ طبری نے امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام[3] سے روایت کی ہے تو ظہر، عصر، مغرب

۱و۲ علامہ سید شرف الدین موسوی عاملی، مسائل فقہیہ ص ۱۵

۳۔ علامہ طبری، مجمع البیان ج ۳، ص ۴۳۳، مطبوعہ العرفان

اور عشاء چار نمازوں کا وقت آدھی رات تک رہے گا۔ ظہر اور عصر کا وقت غروب آفتاب تک اور مغرب اور عشاء کی نمازوں کا وقت غروب آفتاب سے آدھی رات تک اور صبح کی نماز کا وقت صبح صادق ہونے پر ہوگا۔ جیسا کہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے: ''فجر کی نماز بھی ادا کرو کیونکہ فجر کی نماز گواہی شدہ ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ دُلوک کے معنی غروب کے ہیں اور غسق کے معنی تاریکی کے ملنے کا وقت۔ اس صورت میں اس آیت سے فقط تین نمازوں کا وقت معلوم ہوتا ہے۔ مغرب، عشاء اور صبح۔[1]

علامہ طبرسی مجمع البیان جلد سوم میں لکھتے ہیں:

''حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے چار نمازوں کا وقت زوال آفتاب کے بعد سے ایک پہر رات گزرنے تک رکھا ہے مگر ظہر اور عصر کی نماز کا مشترک وقت ظہر سے مغرب تک اور مغرب اور عشاء کی نمازوں کا مشترک وقت آدھی رات تک ہے۔ صبح کی نماز کا وقت الگ سے ''قرآن الفجر'' کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ اس وضاحت کی بناء پر غسق اللیل سے اس آیت میں مراد آدھی رات ہے یعنی وہ وقت جب گہری تاریکی چھا جائے۔ آیت میں ان نمازوں کا اول وقت اور آخر وقت بتلایا گیا ہے لیکن اس کی تصریح نہیں کہ ظہر اور عصر کی نمازوں کا وقت کب ختم ہوگا اور مغرب اور عشاء کی نمازوں کا وقت کب شروع ہوگا۔ یہ وضاحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چھوڑ دی گئی ہے۔ علامہ طبرسی نے اپنی اس رائے کی تائید میں اس آیت کی تفسیر سے متعلق ایک روایت امام جعفر صادق علیہ السلام کی پیش کی ہے:

''انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ کوئی محقق مندرجہ بالا آیت پر غور کرنے اور مختلف آراء کے مطالعے کے بعد قطعی طور پر کسی ایک رائے کا انتخاب کر کے اطمینان بخش طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیت کا مقصود یہی ہے۔ دوسری طرف آیت کے الفاظ اور ان کے لغوی معنی کے لحاظ سے دونوں مفہوموں میں سے کوئی مفہوم بھی

۱۔ علامہ طبرسی، مجمع البیان ج ۳، ص ۳۴۳، مطبوعہ العرفان

بعید از قیاس نہیں ہے۔ اس لئے کوئی گروہ بھی اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے صرف اس آیت کو سند کے طور پر پیش کرسکتا ہے۔ رہا سوال دو نمازوں کو جمع کرنے یا ان میں فاصلہ رکھنے کا تو ظاہر آیت سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دُلوک سے جس وقت کا آغاز ہوتا ہے اور جو غسق پر ختم ہوتا ہے ـــ ان دو لفظوں کے جو بھی معنی لئے جائیں ـــ اس درمیانی مدت میں چار نمازیں صحیح ہیں۔ کوئی ایسی دلیل آیت میں موجود نہیں جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ نمازوں کے درمیان فاصلہ ضروری ہے جیسا کہ اہل سنت کے چاروں مذاہب کا دعویٰ ہے، نہ ہی آیت میں جمع بین الصلوٰتین جس کے شیعہ قائل ہیں اس کا کوئی ثبوت ہے۔ بہرحال شیعہ اپنے ائمہ علیہم السلام کی پیروی میں جس طریقے پر کاربند ہیں وہ ظاہر آیت کے منافی نہیں، بالخصوص جبکہ صحیح احادیث سے بھی اس طریقے کی تائید ہوتی ہے۔

واجب نمازوں کی اقسام

جن نمازوں کا اسلام نے حکم دیا ہے ان میں سے ایک نماز جمعہ ہے۔ قرآن کریم نے اس نماز کو بڑی اہمیت دی ہے اور مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ''اے ایمان والو! جب جمعہ کی اذان ہوجائے تو دوڑ کر نماز کے لئے جاؤ اور خرید و فروخت بند کردو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تمہیں معلوم ہے۔'' (سورۂ جمعہ: آیت ۹)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بکثرت احادیث اس فریضہ کی تاکید میں آئی ہیں۔ مسلمانوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں بھی اور آپ کے بعد بھی اس نماز کی ادائیگی کو بہت اہمیت دی ہے اور آج بھی اکثر اسلامی ممالک میں یہ نماز ہوتی ہے۔

مسلمانوں میں اس فریضے کی اہمیت اور فضیلت میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن شیعوں میں اس کی ادائیگی کا طریقہ دوسرے مسلمان بھائیوں سے ذرا مختلف ہے۔ شیعوں کے نزدیک یہ نماز حاکم عادل کے زمانے میں واجب تعیینی ہے اور ظالم حاکم کے دور میں ظہر کی نماز کے مقابلے میں واجب تخییری۔ فقہاء کا ایک گروہ ظالم حاکم کے دور میں اسے مستحب کہتا ہے۔

شہید ثانی اپنی کتاب ''لمعہ'' باب الصلوۃ میں کہتے ہیں:

''غیبت امام زمانہؑ میں نماز جمعہ کا وجوب اکثر علماء کے نزدیک مسلم ہے۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس کے واجب تعیینی ہونے پر کامل اتفاق ہے تو یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا۔ کم از کم یہ صحیح ہے کہ ظہر کے مقابلے میں نماز جمعہ واجب تخییری ہے۔[۱] البتہ شیعوں کا ایک طبقہ غیبت امام زمانہؑ کے زمانے میں اس نماز کو جائز نہیں سمجھتا۔''

سورۂ جمعہ کی آیت میں اس نماز کے وجوب کی تصریح ہے لیکن یہ آیت اس کی شرائط اور کیفیت کے بارے میں خاموش ہے اس لئے مسلمان علماء میں اس بارے میں اختلاف ہے۔ آیت یہ بیان نہیں کرتی کہ اس فریضے کا وجوب مطلق ہے یا امام عادل یا اس کے خاص نائب کے وجود کے ساتھ مشروط۔ دوسرے مسلمانوں میں سے حنفی اس بات پر شیعوں کے ساتھ متفق ہیں کہ حاکم یا اس کے نائب کا وجود اس نماز کے وجوب کی شرط ہے۔ فرق یہ ہے کہ شیعہ حاکم یا اس کے نائب کے لئے عادل ہونا ضروری سمجھتے ہیں لیکن حنفیوں کے نزدیک سلطان کا وجود کافی ہے عادل ہونا ضروری نہیں۔ اس کے برعکس شافعی، مالکی اور حنبلی حاکم کے وجود کو نماز جمعہ کے وجوب کی شرط قرار نہیں دیتے۔[۲]

اس میں بھی اختلاف ہے کہ جمعہ کی نماز کے صحیح ہونے کے لئے اس میں کم از کم کتنے آدمیوں کی شرکت ضروری ہے۔ شیعوں کے ایک گروہ کے نزدیک علاوہ امام

۱و۲ علامہ شیخ محمد جواد مغنیہ، الفقہ علی المذاھب الخمسہ ص ۱۵۰

کے پانچ افراد کا ہونا ضروری ہے اور ایک دوسرے گروہ کے نزدیک امام کے علاوہ سات افراد کا۔ شافعیوں اور حنبلیوں کے نزدیک کم از کم تعداد امام سمیت چالیس ہے۔ مالکیوں کے نزدیک امام کے علاوہ کم از کم بارہ مرد نماز میں شریک ہونے ضروری ہیں جس پر نماز جمعہ واجب ہے۔ حنفیوں کے نزدیک اس کے لئے ظہر سے قبل تنہا سفر پر جانا جائز ہے۔ دوسرے مذاہب نیز شیعہ ایسی صورت میں سفر پر جانا جائز نہیں سمجھتے۔ [۱]

تمام اسلامی مذاہب جمعہ کی نماز سے قبل اور نماز کا وقت ہوجانے کے بعد دو خطبوں کو واجب کہتے ہیں لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کیا ان خطبوں کا کھڑے ہو کر ہی پڑھنا واجب ہے۔ شیعہ شافعی اور مالکی وجوب کے قائل ہیں مگر حنفیوں اور حنبلیوں کے نزدیک خطبہ کھڑے ہو کر پڑھنا واجب نہیں۔ [۲] شیعہ خطبے میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور رسولؐ اور اہلبیت رسولؐ پر درود کو بھی واجب سمجھتے ہیں۔ نیز ان کے نزدیک یہ بھی واجب ہے کہ ایک خطبے میں وعظ و نصیحت اور دوسرے خطبے میں قرآن کی آیات پڑھی جائیں اور مؤمنین و مؤمنات کے لئے دعا اور استغفار ہو۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ خطیب دونوں خطبوں کے درمیان ذرا دیر بیٹھ جائے تاکہ دونوں خطبوں کے درمیان فاصلہ ہوجائے۔ [۳]

اہل سنت کے چاروں مذاہب کے نزدیک دونوں خطبوں کی کیفیت میں بھی کچھ اختلاف ہے۔ اور ان تمام صورتوں میں اختلاف کا منشاء جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے اس آیت کا اجمال ہے جس سے نماز جمعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے عقیدے کے مطابق صحیح احادیث نبوی پر ہی اپنی رائے کی بنیاد رکھی ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اہلبیتؑ عصمت علیہم السلام کی طرف رجوع نہیں کیا جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے علم کا وارث قرار دیا تھا اور جن کو آپ نے قرآن مجید کے اسرار اور نکات سکھائے تھے اور خدا کی طرف سے امام مقرر کیا تھا۔

---

۱ تا ۳ علامہ شیخ محمد جواد مغنیہ، الفقہ علی المذاہب الخمسہ ص ۱۵۰

مسافر کی نماز

اسلام نے مسلمانوں پر ہر حال میں نماز واجب کی ہے۔ سفر میں بھی، حضر میں بھی، خوف میں بھی، امن میں بھی، بیماری میں بھی، تندرستی میں بھی، کمزوری کی حالت میں بھی اور طاقت کی حالت میں بھی۔ لیکن نماز سے متعلق قوانین میں ان تمام حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ بندگان خدا بہ سہولت احکام الٰہی بجالاسکیں۔ سفر میں نماز کم کردی گئی ہے اور چار رکعتوں کی جگہ دو رکعتیں مقرر کی گئی ہیں۔

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنَّ الْکَافِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ''جب تم سفر کرو تو اس میں کوئی گناہ نہیں کہ نماز کو کم کر کے پڑھو بشرطیکہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر لوگ تمہیں ستائیں گے۔ بے شک کافر تو تمہارے کھلے دشمن ہیں۔'' (سورۂ نساء: آیت ۱۰۱)

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ سفر کی حالت میں نماز قصر کرنے میں کسی طرح کا کوئی گناہ نہیں لیکن قصر نماز کی کیفیت اور اس کے لئے شرعی مسافت کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ ایسی صورت میں تفصیل سنت نبوی ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اس کی تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے دی ہے۔ اس قول وفعل کی روایت ان دیانتدار راویوں نے کی ہے جو آنحضرتؐ کی سنت کے والا وشیدا تھے۔ چونکہ آیت میں اجمال ہے اور روایات میں بھی اختلاف ہے اور پھر روایات کی تشریح میں بھی اختلاف ہوا ہے اس لئے مسلمان علماء میں شرعی مسافت کی حد اور سفر کی کیفیت کے بارے میں اختلاف رونما ہوگیا۔ نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا سفر کی حالت میں مسافر کو نماز قصر کرنے کی صرف اجازت ہے یا یہ لازمی حکم ہے۔

شیعہ قصر نماز کے حکم کو لازمی اور حتمی سمجھتے ہیں۔ اہل سنت میں سے حنفی بھی اسی کے قائل ہیں۔ اہلبیت علیہم السلام کے پیروکاروں کے نزدیک اس حکم کے لئے شرعی مسافت آٹھ فرسخ جانا یا آٹھ فرسخ کی آمد و رفت ہے۔ حنفیوں کے نزدیک یہ

مسافت ۲۴ فرسخ ہے اور وہ اس سے کم میں قصر نماز کو جائز نہیں سمجھتے۔ اہل سنت کے دوسرے تین مذاہب حالت سفر میں نماز قصر کرنے کو لازمی قرار نہیں دیتے۔ البتہ قصر کے جواز کے لئے ان کے نزدیک شرعی مسافت ۱۶ فرسخ یا کچھ کم ہے۔

یہ ہیں قرآن مجید کی تجویز کردہ مسافر کی نماز کے بارے میں شیعوں اور دوسروں میں بڑے اختلافات۔ دوسرے فروعی اختلافات وہ ہیں جو کسی خاص مسئلہ میں ایک ہی مذہب کے علماء کے درمیان ہیں۔ ایسے اختلافات اہل سنت کے مذاہب اربعہ میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان میں سے بعض علماء کچھ فروعی مسائل میں شیعوں کے ہم خیال ہیں لیکن ان اختلافی مسائل کے بارے میں کلام الٰہی میں کوئی تصریح نہیں۔ قرآن مجید میں صرف اتنا ہے کہ دشمنوں سے خوف کی صورت میں نماز قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ بات مسافر کی نماز سے زیادہ خوف پر صادق آتی ہے۔ چنانچہ اس آیت کی اس طرح بھی تفسیر کی گئی ہے۔

مجاہدؒ اور جابرؓ سے روایت ہے کہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ حالت خوف میں دو رکعت کی بجائے ایک رکعت پڑھی جائے۔ بعض صحابہ اور تابعین سے بھی جیسے جابر بن عبداللہؓ، حذیفہ یمانیؓ، زید بن ثابتؓ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ نماز خوف مسافر کی نماز سے کم ہے نہ کہ غیر مسافر یعنی مقیم کی نماز سے۔ ان لوگوں کے نزدیک مسافر کی نماز کم نہیں کی گئی کیونکہ مسافر کی نماز پہلے ہی سے چار رکعت نہیں دو رکعت تھی۔ چار رکعت نماز تو مقیم کے لئے ہے۔ ظاہر آیت سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قصر کرنے سے مراد حالت خوف میں دو رکعت کے بجائے ایک رکعت نماز پڑھنا ہے۔ لیکن اہلبیت علیہم السلام کی روایت یہ ہے کہ اس آیت میں قصر سے مراد حالت سفر میں چار رکعت کے بجائے دو رکعت نماز پڑھنا ہے۔ ظاہر آیت سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے۔ رہا آیت میں خوف کا ذکر تو اس سے مقصد صرف اس زمانے کی حالت کا بیان کرنا ہے جبکہ عربوں

کو سفر میں عموماً دشمنوں کی طرف سے خوف لاحق رہتا تھا۔ اسی کو قرآن مجید نے ایک عام قاعدے کے طور پر بیان کیا ہے اور اسی بنیاد پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی ہے۔

سفر کی حالت میں نماز قصر کرنے کے وجوب کے بارے میں اس آیت سے امام باقر علیہ السلام کا استدلال اس مفہوم کی تائید کرتا ہے۔ زرارہ اور محمد بن مسلم کی روایت میں آیا ہے کہ کسی نے امام کی خدمت میں عرض کیا: آپ مسافر کی نماز کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ یہ نماز کتنی رکعت ہے؟ امام نے فرمایا: اللہ کہتا ہے کہ ''جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر نماز قصر کر دو'' لہٰذا سفر کی حالت میں قصر نماز اسی طرح واجب ہے جیسے حضر میں پوری نماز۔

اس پر زرارہ اور محمد بن مسلم نے عرض کیا: آیت کہتی ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ نہیں کہتی کہ اس طرح ضرور کرو۔ لہٰذا قصر نماز پوری نماز کی طرح کیسے ہوئی؟

امام علیہ السلام نے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

''یہاں گناہ کی نفی ایسی ہی ہے جیسی صفا و مروہ والی آیت میں گناہ کی نفی۔ وہاں بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا " اس پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ ان دونوں کا طواف کرے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۵۸)

جب ہم اس آیت سے صفا اور مروہ کے وجوب کا حکم اخذ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ مسافر کی نماز میں بھی قصر واجب ہی ہوگا کیونکہ دونوں جگہ ''لاجُناحَ'' ہی کے الفاظ آئے ہیں۔

نمازِ خوف

قرآن مجید میں نماز خوف ادا کرنے کا طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے: ''جب آپ ان کے درمیان ہوں اور ان کے ساتھ نماز پڑھنا چاہیں تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار اپنے ساتھ لئے رہے۔

جب یہ لوگ سجدہ کر چکیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی آگے آجائے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے۔ یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنا اسلحہ ساتھ رکھیں کیونکہ کافروں کی خواہش یہ ہے کہ تم اپنے اسلحہ اور سامان جنگ سے ذرا غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔" (سورۂ نساء: آیت۱۰۲)

اس آیت میں تصریح ہے کہ حالت خوف میں بھی نماز واجب ہے۔ اس کا طریقہ اس طرح متعین کیا گیا ہے کہ دشمنوں کے مقابلے میں مسلمان نمازیوں کی سلامتی کو یقینی بنایا جا سکے۔

نماز خوف کا طریقہ یہ ہے:

"مسلمان اہل لشکر کا ایک گروہ دشمن کے سامنے کھڑا رہتا ہے اور ایک دوسری جماعت نماز کے دوران میں امام اور نمازیوں کی حفاظت پر مامور رہتی ہے۔ جو جماعت نماز ادا کر چکتی ہے وہ دوسرے گروہ کی جگہ لے لیتی ہے اور وہ دوسرا گروہ آ کر نماز ادا کرتا ہے۔ یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ تمام لشکر نماز سے فارغ ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں رکعات کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ رکعات کی تعداد اور ان کی کیفیت کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کیا ہے۔ درحقیقت ان تمام قوانین کی شرائط اور کیفیت کی وضاحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی پر چھوڑی گئی ہے جن کا ذکر اصلاً قرآن مجید میں آیا ہے۔

ائمہ مذاہب اور ان کے متبعین کے درمیان اس نماز کی کیفیت اور اس کی رکعات کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس طرح کا اختلاف دوسرے مسائل کے بارے میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ آج جو اختلاف موجود ہے یہ اختلاف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی زمانے میں اتنا نہیں تھا جتنا تابعین اور ان کے بعد کے دور میں ہو گیا۔ یہ اختلافات صحابۂ کرامؓ کے بعد پیدا ہوئے۔ یعنی جب مسلمان صحابہؓ کی تقلید اور ان کی رائے کی پیروی کے مرحلے سے گزر کر خود بالاستقلال احادیث

کا مطالعہ اور راویوں کی چھان بین کرنے لگے۔ اس دور میں فقہاء صحابہ کے اقوال و افعال اور ان کی بیان کردہ حدیثوں کا اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھتے تھے۔ اس دور میں تابعین نے بعض راویوں کی بیان کردہ ایسی احادیث کو بھی صحیح قرار دیدیا جن کو صحابہ صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ اگلے جن احادیث پر عمل کرتے تھے، بعد میں آنے والوں نے ان احادیث پر عمل جائز نہیں سمجھا۔ یہیں سے اختلافات پیدا ہوگئے اور بہت سے فقہی مسائل کے بارے میں مختلف رائیں وجود میں آگئیں۔

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مجمع البیان جلد دوم میں لکھا ہے کہ شیعوں کے نزدیک نماز خوف دو رکعت ہے اس طرح کہ پہلا گروہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھ کر دوسری رکعت کے لئے اٹھ جائے اور اسے پورا کرے۔ اس دوران میں امام کھڑا رہے۔ جب یہ گروہ نماز پوری کر کے سلام پھیر لے تو اپنے ان ساتھیوں کی جگہ لے لے جو دشمن سے حفاظت کا کام انجام دے رہے تھے۔ اب یہ دوسرا گروہ آ کر نماز شروع کرے۔ امام ان کے ساتھ دوسری رکعت پڑھے اور تشہد کو اتنا طول دے کہ وہ کھڑے ہو کر ایک رکعت پڑھ لیں اور امام کے ساتھ تشہد میں شامل ہوجائیں۔ اب امام اور یہ مقتدی سلام پھیردیں۔ اس طرح دونوں گروہ ایک ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھ لیں گے۔ یہی رائے شافعی سے بھی منسوب کی گئی ہے۔

جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ نماز خوف مسافر کی نماز کی مختصر شدہ صورت ہے ان کے نزدیک نماز خوف صرف ایک رکعت ہے۔ یہ جابر، مجاہد اور بعض دوسرے صحابہ کا مذہب ہے۔ ان کے مطابق پہلا گروہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے گا اور جا کر دوسرے گروہ کی جگہ لے لے گا۔ اس کے بعد دوسرا گروہ آ کر امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے گا۔

ایک اور رائے یہ ہے کہ امام دونوں گروہوں کے ساتھ دو دو رکعت نماز پڑھے گا اور اس طرح امام دو بار نماز ادا کرے گا۔

وضو

اسلام نے تمام واجب نمازوں کی کچھ شرائط مقرر کی ہیں جو بذات خود نماز کا جزو نہیں بلکہ ایسے اعمال ہیں جن کی نماز سے پہلے بجاآوری مکلّف کے لئے ضروری ہے اور ان کو بجالائے بغیر نماز درست نہیں ہوگی۔ نماز جب تک اپنی تمام شرائط اور اجزاء کے ساتھ ادا نہیں کی جائے گی وہ مقصد اور ثمرہ حاصل نہیں ہوگا جو ہونا چاہئے۔

قرآن مجید میں ان شرائط کے وجوب کی تصریح ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا

"اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے آمادہ ہو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لیا کرو اور اپنے سروں اور پاؤں پر ٹخنوں تک مسح کر لیا کرو اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو سارا جسم (غسل کرکے) پاک صاف کر لیا کرو۔" (سورۂ مائدہ: آیت ۶)

اس آیت میں چہرے اور دونوں ہاتھوں کے کہنیوں تک دھونے اور سر اور پاؤں کے مسح کرنے کا ذکر ہے۔ اس آیت کی مختلف قرأتوں سے اس حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس قرأت میں اَرْجُلِكُمْ ہے اس کے مطابق تو پاؤں پر مسح کرنے کے وجوب کی تصریح ہے ہی لیکن جس قرأت میں اَرْجُلَكُمْ ہے اس میں بھی اس لفظ کا رُؤُسِكُمْ پر جو مفعول ہے عطف ہونے کی وجہ سے یہی معنی نکلتے ہیں۔

کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ اَرْجُلَكُمْ کا عطف وُجُوهَكُمْ پر ہے اور اس سے انہوں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وضو میں دونوں پاؤں کا دھونا واجب ہے لیکن اس طرح کا عطف صحیح نہیں ہے کیونکہ درمیان میں ایک طویل عبارت وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ آ گئی ہے حالانکہ معطوف اور معطوف علیہ میں ایک لفظ کا بھی فاصلہ نہیں ہونا چاہئے چہ جائیکہ ایک پوری عبارت۔ اس طرح کی کلام عرب میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ جر کی صورت میں بھی وُجُوهَكُمْ پر ہی عطف ہے

اور جو جواد کا ہے۔ کلام عرب میں اس طرح کی بھی مثال نہیں ملتی۔ جو چند مثالیں نقل کی گئی ہیں اول تو وہ شاذ ہیں دوسرے ان میں جر کی وجہ صفت یا تاکید ہے۔

پاؤں پر مسح واجب ہونے کا عقیدہ شیعوں نے ائمہ معصومینؑ اور بعض کبار صحابہ سے لیا ہے۔ دوسرے لوگ جو پاؤں دھونے کے قائل ہیں ان کی دلیل وہ قرأت ہے جس میں اَرْجُلَکُمْ منصوب ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اَرْجُلَکُم کا عطف وُجُوْھَکُمْ پر ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ پاؤں پر مسح کرنے کے بعد پاؤں دھویا کرتے تھے۔ بعض اہل تسنن کہتے ہیں کہ استحسان کے اصول سے بھی پاؤں دھونے کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی عقلاً سر کے لئے مسح اور پاؤں کے لئے دھونا ہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ پاؤں کو اکثر گندگی لگنے کا احتمال رہتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ عبادات سے متعلق احکام میں عقلی مصلحتیں بھی ہوں اور شارع نے بھی دوسروں کی طرح عقلی مصالح کا خیال رکھا ہو مگر ظاہر ہے کہ اس طرح کا استحسان ظن وتخمین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اس کو احکام الٰہی کے لئے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

غسل

جہاں تک غسل جنابت کا تعلق ہے تو سورۂ مائدہ میں اس کے وجوب کی تصریح ہے: ''اگر تم حالت جنابت میں ہو تو سارا جسم (غسل کرکے) پاک صاف کرلیا کرو۔'' لیکن اس آیت میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ جنابت سے پاک ہونے کا طریقہ کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں احکام کی تفصیل قرآن مجید میں نہیں ہوتی۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ طہارت جس کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی اس کی دو قسمیں ہیں جن میں سے ایک کو اختیار کرنا ضروری ہے لیکن دوسری نوع کی طہارت

سے شرعی پاکیزگی اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک پہلی نوع کی طہارت غیر ممکن نہ ہو، یا اس میں کوئی جانی یا مالی نقصان نہ ہوتا ہو۔ سورۂ مائدہ میں کچھ ایسی باتوں کا بیان موجود ہے جن کی وجہ سے مکلف طہارت کی دوسری قسم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ''اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی پیشاب پاخانے سے آئے یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو پھر تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرلو یعنی اپنے چہرے اور ہاتھوں پر اس سے مسح کرلو۔'' (سورۂ مائدہ: آیت ۶)

پاک مٹی پر مسح کرنے کی تفصیل کہ کس کس جگہ کا مسح کرنا چاہئے اور کس کس چیز سے کرنا چاہئے اس کی وضاحت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرمائی ہے لیکن اس کے باوجود ان تمام مسائل میں مسلمان عالموں میں اختلاف ہے۔ حنفی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تندرست ہے اور سفر میں نہیں ہے تو اگر اسے پانی نہ ملے تو تیمم نہ کرے اس پر نماز واجب نہیں ہے کیونکہ آیت کے مطابق تیمم اس وقت واجب ہے جب کوئی بیمار یا مسافر ہو اور پھر اسے پانی نہ ملے۔ (الفقه علی المذاهب الخمسة از علامہ محمد جواد مغنیہ، ص۹۲) لیکن دوسرے مذاہب اس وقت تک کے لئے جب تک پانی دستیاب نہ ہو تیمم کو واجب قرار دیتے ہیں چاہے کوئی بیمار ہو یا تندرست، مسافر ہو یا مقیم۔

شافعیوں کے نزدیک غیر عورت کو چھونے سے خواہ محض ہاتھ ہی کیوں نہ لگ جائے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (تم نے عورت کو چھوا ہو) کے اطلاق سے استدلال کرتے ہیں۔ شیعوں کے نزدیک اس آیت میں لمس سے مراد عورت سے مقاربت ہے۔ صعید سے مراد مٹی، ریت اور پتھر ہے۔ وجہ سے مراد چہرے کا کچھ حصہ ہے اور ایدی سے مراد دونوں ہتھیلیاں ہیں۔ اس ضمن میں چاروں مذاہب

کے خیالات میں اختلاف ہے۔ بعض صعید کے معاملے میں شیعوں کے ہم خیال ہیں اور بعض کی رائے صرف وجہ اور ایدی کے بارے میں ان سے مختلف ہے۔ مجموعی طور پر یہ اختلافات بنیادی نہیں، سطحی ہیں۔

قبلہ

اسلام نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں کعبہ کی تعظیم کے خیال سے اور اس کی پاکیزگی پر زور دینے کے لئے صدق دل اور اطمینان قلب سے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کریں۔ ہجرت سے قبل مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ اس زمانے کے یہودی کہا کرتے تھے کہ مسلمان ہمارے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور پھر بھی مذہب کے معاملے میں ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ اگر ہم رہنمائی نہ کرتے تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کو اپنے قبلے کی بھی خبر نہیں تھی۔

یہ بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو بہت گراں گزرتی تھی۔ ان کی آرزو تھی کہ حق سبحانہٗ انہیں کسی دوسری طرف منہ کرنے کا حکم نازل فرمادے۔ آخر یہ آیت نازل ہوئی:

(اے محمدؐ) ہم نے دیکھ لیا آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا۔ چنانچہ اب ہم ضرور آپ کو اس قبلے کی طرف پھیردیں گے جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ اچھا! تو اب کرلیجئے اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف۔ اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ کرلو اسی کی طرف۔ جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حکم واقعی ان کے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اور خدا ان کی کاروائیوں سے بے خبر نہیں۔

(سورۂ بقرہ: آیت ۱۴۴)

اس آیت نے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کے حکم کو جو پہلے لازمی تھا منسوخ کردیا۔ یہ سنت کا حکم قرآن مجید سے منسوخ[۱] ہونے کی ایک مثال ہے کیونکہ قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں جس میں مسلمانوں کے قبلۂ اول کی طرف اشارہ ہو۔ جیسا کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے فرمایا ہے۔اور درج ذیل آیت کا تعلق تو صرف دوران سفر میں نوافل سے ہے:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ "اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی۔ تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ ہے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۱۵)

روزے کے بارے میں قرآنی تعلیم

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر روزہ واجب کیا ہے۔ خود قرآن مجید میں اس کی تصریح موجود ہے:

۱۔ مفتی جعفر حسین نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱ کے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ سورۂ نساء کی آیت ۱۵ و ۱۶ "(اے مسلمانو!) تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں ان پر اپنے میں سے چار آدمی گواہ کرلو۔ سو اگر وہ گواہی دیدیں تو ان عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے یا اللہ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکال دے..." میں بیان کردہ یہ سزا اوائل اسلام میں دی جاتی تھی لیکن شوہر دار عورتوں کے لئے اس حکم کو سنت پیغمبرؐ نے "حکم رجم" سے منسوخ کردیا جبکہ کتاب ہذا کے مصنف نے صفحہ ۱۹۵ پر لکھا ہے کہ سورۂ نور کی آیت ۲ نے سورۂ نساء کی آیت ۱۵ اور ۱۶ کو منسوخ کیا ہے۔

برسبیل تذکرہ ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ جب کبھی عالم احکام کی بجائے یہی نسخ عالم تکوین میں واقع ہوتو اسے بداء کہا جاتا ہے۔ بداء لوح محفوظ میں نہیں بلکہ لوح محو و ثبت میں ہوتا ہے جس میں ان باتوں کا تذکرہ ہے جو تمام کی تمام مشروط ہیں اور جن میں مصلحتوں کی بنا پر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بداء کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو انسانوں کی آزمائش ہوتی رہتی ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی خوئے تسلیم پروان چڑھتی رہتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات اس کی واضح دلیل ہیں۔ اگر بداء نہ ہوتو دعاء وتصدق، شفاعت وتوسل اور انبیاء و اولیاء کی گریہ وزاری کے کوئی معنی نہیں۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کر دیئے گئے ہیں جیسے ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے ہوئے ہیں تاکہ تم تقویٰ شعار بن جاؤ اور یہ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۳ و ۱۸۴)

جہاں یہ آیت روزے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے وہاں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت اسلام ہی سے مخصوص نہیں بلکہ پہلی امتوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ قریش ایام جاہلیت میں بھی بطور عبادت روزہ رکھتے تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

زمانۂ جاہلیت میں قریش دسویں محرم کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کی ابتدا میں اسی دن کے روزے کا حکم دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کر دیئے تو آپ نے دسویں محرم کو افطار کی اجازت دیدی اور فرمایا:

"جس کا دل چاہے روزہ رکھے اور جس کا دل چاہے افطار کرے۔"

دسویں محرم چونکہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام، آپ کی اولاد اور آپ کے جاں نثار اصحاب کا یوم شہادت ہے اس لئے شیعہ امامی اثناء عشری اب اس دن کے روزے کو ناپسندیدہ اور مذموم سمجھتے ہیں۔ اس میں بھی تعجب نہیں کہ فضائل عاشورا کی روایات سرے سے ہی بنی امیہ نے قیام امام حسین علیہ السلام کی وقعت کم کرنے کے لئے گھڑ لی ہوں۔

مذکورہ بالا آیت میں گنتی کے چند روزے سے مراد ماہ رمضان ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ "رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل

ہوا۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۵)

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ چند روز سے مراد ہر مہینے کے تین دن ہیں۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ یہ حکم ماہِ رمضان کے روزوں کے حکم سے منسوخ ہوگیا۔

مذکورہ آیت میں اس کی وضاحت نہیں ہے کہ روزے سے کیا مراد ہے اور کتنی دیر کا روزہ واجب ہے۔ نہ یہ وضاحت ہے کہ روزہ دار کے لئے کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ ان امور کی تفصیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کی ہے۔ قرآن مجید میں صرف مریض اور مسافر کے بارے میں حکم ہے جن کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی اور کہا گیا ہے کہ مسافر اپنے سفر سے واپسی پر روزوں کی قضا کرلیں۔

ظاہر آیت سے یہ حکم نکلتا ہے کہ مریض اور مسافر پر افطار واجب ہے کیونکہ اللہ تعالٰی نے صرف سفر اور بیماری میں روزہ چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ یہ رائے متعدد صحابۂ کرام اور دوسروں کی ہے جن میں حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عروہ بن زبیرؓ بھی شامل ہیں۔ شیعوں کا بھی اپنے ائمۂ طاہرینؑ کی پیروی میں یہی عقیدہ ہے۔ جب حضرت عمرؓ سے مسافر کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

"اگر تم کسی کو کوئی چیز دو اور وہ لوٹا دے تو کیا تمہیں غصہ نہیں آئے گا۔ یہ تو تمہیں خدا کی دین ہے۔"

عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں:

"سفر میں روزہ رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ غیر سفر میں روزہ نہ رکھنا۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

"اگر کوئی شخص سفر میں مرجائے اور وہ روزہ دار ہو تو میں اس کے جنازے کی نماز نہیں پڑھوں گا۔"

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ''جن کو استطاعت ہو وہ روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا دیدیں۔ اور جو کوئی بھلائی کرے اس کے لئے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۴)

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو روزہ رکھنے پر قادر ہوں لیکن عمداً روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے کفارے میں ایک مسکین کو کھانا دے دیں۔ یعنی وہ روزے اور فدیے میں سے ایک کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں روزہ رکھنا کھانا دینے سے بہتر ہے۔ اگر آیت کے یہ معنی لئے جائیں تو یہ حکم سورۂ بقرہ کی اس دوسری آیت سے منسوخ سمجھا جائے گا:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ''تم میں سے جو اس مہینے (رمضان) کو پائے لازم ہے کہ اس کے روزے رکھے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۵)

اس آیت کے بارے میں علی بن ابراہیم سے روایت ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا:

''یہ آیت اس شخص کے بارے میں ہے جو رمضان کے مہینے میں بیمار ہو اور اس کے بعد اچھا ہوجائے۔ اگر یہ اگلے رمضان تک چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا نہ کرے تو اس کو قضا روزے بھی رکھنے ہوں گے اور مسکین کو کھانا بھی دینا ہوگا کیونکہ اس نے بغیر کسی عذر کے اس واجب کو ادا نہیں کیا۔

اہلسنت کے مذاہب اربعہ کے مطابق اگر کوئی شخص شرعی سفر کی تمام شرائط کے ساتھ سفر کرے تو اسے اختیار ہے کہ وہ روزہ رکھے اور چاہے افطار کرے۔ وہ اپنی رائے کی بنیاد ان احادیث پر رکھتے ہیں جن میں آیا ہے کہ بعض اصحاب رسول اکرمؐ کے ساتھ اپنے سفروں میں روزہ رکھتے تھے اور بعض نہیں رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کہتے ہیں کہ: ''روزہ نہ رکھنا مسافر کی سہولت کے لئے ہے اور اس سے محض جواز پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔''

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

قرآن میں کچھ ایسے کاموں کا ذکر ہے جو روزہ دار کے لئے جائز یا ناجائز ہیں:

''جائز کردی گئی ہے تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی بیویوں سے مقاربت۔ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا کرتے رہتے تھے۔ مگر اللہ نے تم کو معاف کردیا اور تمہارے گناہوں سے درگزر کی۔ اب تم اپنی بیویوں سے ملو اور اسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۔ اور کھاتے پیتے رہو جب تک کہ صبح کا سفید خط رات کے سیاہ خط سے نمایاں نہ ہو جائے۔ پھر روزے کو رات ہونے تک پورا کرو۔''

(سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۷)

اوپر کی آیت میں روزے کے بعض احکام کا بیان ہے اور روزہ شروع ہونے اور ختم ہونے کا وقت بتلایا گیا ہے۔ آیت کے ابتدائی فقروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ماہ رمضان میں بیویوں سے صحبت حرام تھی لیکن چونکہ اس حکم کی پابندی بہت سے لوگوں کے لئے دشوار تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعے رمضان کی راتوں میں اس کی اجازت دے دی تاکہ اس کے بندوں کو دقت نہ ہو۔

قرآن مجید میں حج کا بیان

اللہ تعالیٰ نے سال کے خاص دنوں میں اپنے گھر کا حج مسلمانوں پر واجب کیا ہے۔ ان ایام میں اسلام کے پیرو دنیا کے دور دراز گوشوں سے آکر جمع ہوتے ہیں اور اللہ کے حکم کی تعمیل میں فریضۂ حج انجام دیتے ہیں اور ساتھ ہی اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کے تعاون سے اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن مجید اور تاریخ کی کتابوں سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ دنیا کی سب قوموں

کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ مقررہ دنوں میں اکٹھے ہو کر عبادت اور اپنے معبودوں سے اپنی وفاداری کا اور ان کی اطاعت کا اعلان کرتی رہی ہیں: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ "ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کے دن مقرر کئے تاکہ وہ ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کا نام ان چوپایوں پر لیں جو اس نے انہیں عطا کئے۔ پس تمہارا خدا خدائے واحد ہی ہے۔"
(سورۂ حج: آیت ۳۴)

علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر امت کی ایک عبادت گاہ قرار دی تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔

کعبہ اسلام سے پہلے سے عربوں کی عبادت گاہ رہا ہے۔ اس کی تعمیر حضرت اسماعیلؑ اور ان کے والد حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمَاعِيْلُ "جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانۂ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۷)

ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقَائِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ "جب ہم نے ابراہیمؑ کو کعبہ کی جگہ بتادی اور حکم دیا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھنا۔ اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ لوگ تمہارے پاس آئیں گے پیدل اور دبلی اونٹنیوں پر دور دراز راستوں سے تاکہ اپنے فائدے کے کام دیکھیں اور اللہ کا نام لیں مقررہ دنوں میں۔" (سورۂ حج: آیت ۲۶ تا ۲۸)

جب سے خانۂ کعبہ کی تعمیر ہوئی ہے عرب ہر سال مقررہ ایام میں جمع ہوتے،

بتوں کو پوجتے اور چوپایوں کی قربانی کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کے بہت سے عقائد کو بدل دیا تھا اور بت پرستی اختیار کرلی تھی۔ خانۂ کعبہ کے اندر اس کی دیواروں پر اور اس کی چھت پر بت رکھ دیئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بتوں کی مدد سے وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا تقرب حاصل کرسکتے ہیں۔ بتوں پر جانوروں کی قربانی دیتے۔ انہوں نے حج میں بہت سی ایسی بدعتوں اور غلط رسوم کا اضافہ کرلیا تھا جن کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے زمانے میں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ آخر اسلام نے آکر ان کے بتوں کو توڑا۔ ان کی عادتوں کو بدلا اور مقررہ ایام میں خانۂ کعبہ کا حج واجب قرار دیا۔ حج کا حکم حسب ذیل آیات میں ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ''لوگوں پر واجب ہے کہ جو کوئی وہاں پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اللہ کے لئے بیت اللہ کا حج کرے۔'' (سورۂ آل عمران: آیت۹۷) وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ''پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے لئے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت۱۹۶)

علاوہ ازیں حج کی مدت کے لئے اللہ تعالیٰ نے خشوع وخضوع کے علاوہ کچھ خاص ہدایات جاری کی ہیں جن پر مسلمانوں کے لئے عمل کرنا ضروری ہے: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ''حج کے مہینے معین ہیں۔ جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرلے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے، نہ اللہ کی نافرمانی اور نہ کوئی لڑائی جھگڑا۔''

(سورۂ بقرہ: آیت۱۹۷)

قرآن مجید میں حج کے بعض ارکان اور آداب کا بیان بھی ہے: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ''بیشک صفا اور مروہ اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں۔ سو جو کوئی کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کے بھی چکر لگائے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت۱۵۸)

نیز ارشاد ہے: فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ ''جب عرفات سے کوچ کرو تو مشعر الحرام میں خدا کو یاد کرو۔ اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔''

(سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۸)

حج کے کچھ احکام اور شرائط کا سورۂ بقرہ، سورۂ مائدہ اور سورۂ حج میں ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ۶ ھ میں یہ فریضہ مسلمانوں پر واجب کیا۔ رسول اکرمؐ نے اسی وقت عمرہ ادا کرنے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ مکے کی طرف کوچ کیا مگر مشرکین نے آپ کو مکے میں داخل نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ آپ نے ۷ ھ میں صرف عمرہ ادا کیا۔ ۹ ھ میں متعدد مسلمانوں نے حج ادا کیا۔ ۱۰ ھ میں رسول اکرمؐ بنفس نفیس حج کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ حج حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سال آپ نے حج کے احکام بیان فرمائے اور لوگوں کو حکم دیا کہ آپ سے حج کے احکام سیکھ لیں۔

حج میں مسلمانوں کے لئے بڑے فوائد ہیں۔ کچھ فائدے اہل مکہ سے مخصوص ہیں اور کچھ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ہیں۔ اہل مکہ جو بنجر ریگستان میں رہتے ہیں جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا حج سے بہت فائدے اٹھاتے ہیں۔ ان کی تجارت کو ترقی اور کاروبار کو رونق ملتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے التجا کی تھی کہ لوگوں کے دل اس سرزمین کی طرف مائل کردے تاکہ لوگ ان کے اور ان کی اولاد کے پاس آئیں ــــ جو اس وادی میں بس گئی تھی ــــ اور اس سے مانوس ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کی اولاد کو اپنی نعمتوں سے روزی عطا کرے۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ '' اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو تیرے

بیت الحرام کے قریب آباد کیا ہے تاکہ اے ہمارے پروردگار! یہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں۔ تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے اور ان کو پھل کھانے کو دے تاکہ یہ لوگ شکر ادا کریں۔" (سورۂ ابراہیم: آیت ۳۷)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور اس وادی مقدس کو لاکھوں مسلمانوں کی زیارت گاہ بنادیا۔ اس کو ایک پاک نشان قرار دیا تاکہ لوگ وہاں پہنچنے کے لئے اپنا مال خرچ کریں اور سختیاں برداشت کریں۔ اس وادی میں چھوٹے بڑے، بادشاہ اور رعیت، امیر اور غریب، گورے اور کالے سب برابر ہیں۔ اس پُرشکوہ اجتماع میں کسی نافرمانی، لڑائی جھگڑے، عناد، مکروفریب اور کمینہ پن کی آمیزش نظر نہیں آتی۔ یہاں جو اعمال بجالائے جاتے ہیں ان میں صلح، دوستی، پاکی اور ہر پستی اور گناہ سے احتراز کے سوا کچھ نہیں۔ ہر سال ہر طبقے اور ہر رنگ و نسل کے لوگ یہاں آکر جمع ہوتے ہیں: لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ "تاکہ (حج سے) جو فائدے انہیں پہنچتے ہیں وہ دیکھیں اور مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔" (سورۂ حج: آیت ۲۸)

خدا کی دعوت پر لبیک کہیں اور اس کی طرف اسی طرح لوٹیں جیسے بروز قیامت حساب کے لئے اٹھیں گے۔ اپنے انکار و سرکشی سے پشیمان اور خدا کے فضل و رضا کے امیدوار۔

قرآن مجید میں زکوٰۃ کا بیان

اسلام نے اموال پر ایک طرح کا محصول مقرر کیا ہے جس کا نام زکوٰۃ رکھا ہے۔ قرآن مجید نے بعض آیات میں اس واجب کی تاکید کی ہے اور بعض آیات میں اس کا نماز کے ساتھ ذکر کیا ہے:

وَاَقِیْمُوا الصَّلاۃَ وَآتُوا الزَّکَاۃَ ''نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

(سورۂ بقرہ: آیت۸۳)

ایک اور جگہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے نتیجے سے ڈرایا ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ترغیب دی ہے: وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِکِیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکَاۃَ ''افسوس ان مشرکوں پر جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔'' (سورۂ حٰم سجدہ: آیت۶۔۷)

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ وَاللّٰہُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ جس میں سات بالیں اُگیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے کئی گنا دے دیتا ہے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت۲۶۱)

قرآن مجید نے ان جانوروں اور غلّے کی ان قسموں کا جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ اس کی تفصیل شارع مقدس یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چھوڑ دی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرتؐ نے ہجرت کے بعد حکم دیا کہ زکوٰۃ کے احکام جن چیزوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ان کا بیان اور ان کا نصاب لکھ لیا جائے۔ چنانچہ یہ دو ورق پر لکھ لیا گیا۔ یہ ورق حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکر بن عمر بن حزمؒ کے گھروں میں بحفاظت رکھے ہوئے تھے۔ (تاریخ الفقہ الاسلامی از ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ص۱۷۲)

عہد رسولؐ میں اسلامی حکومت کی خاص آمدن یہی زکوٰۃ تھی۔ مال غنیمت البتہ گاہے بگاہے لڑائیوں میں مل جاتا تھا۔ قرآن مجید میں اس محصول کا مصرف اس طرح بتایا گیا ہے: اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاکِیْنِ وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْھَا وَالْمُؤَلَّفَۃِ قُلُوْبُھُمْ وَفِی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَابْنِ السَّبِیْلِ فَرِیْضَۃً مِّنَ اللّٰہِ

''صدقات حق ہیں صرف فقیروں کا اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا جو صدقات پر متعین ہیں۔ اور ان کا جن کی دلجوئی کرنا منظور ہے۔ اور (ان کو خرچ کیا جاسکتا ہے) غلاموں کی گردن چھڑانے میں، قرضداروں پر، اللہ کی راہ میں اور مسافروں پر۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔'' (سورۂ توبہ: آیت ۶۰)

اسلام نے جو زکوٰۃ مقرر کی ہے اس میں معاشرے کے لئے بڑے فوائد مضمر ہیں۔ اس سے ایک طرف عوامی بہبود کے ترقیاتی کاموں اور دفاع پر خرچ کرنے کے لئے حکومت کو سرمایہ مہیا ہوتا ہے جس سے حکومت اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکتی ہے تو دوسری طرف غریبوں اور محتاجوں کی ان تکلیفوں میں کمی کی جاسکتی ہے جو اُن کے دلوں میں دولتمندوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکاتی ہیں۔

زکوٰۃ کے بارے میں اسلام کا حکم اس کے دوسرے احکام کی طرح سماجی انصاف کے اصول پر مبنی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کسی ایک طبقہ کی دوسروں پر بالادستی قائم نہ ہونے پائے کہ طبقاتی نظام جڑ پکڑے۔ اسلام کی رُو سے دولتمندوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنی دولت کا ایک حصہ حکومت کے سپرد کردیں اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کو عوام کی ضرورتیں پوری کرنے اور فقر و فاقہ دور کرنے کے لئے استعمال کرے۔ اور اس طرح وہ کینہ اور عداوت جو حاجتمندوں کے دل میں جڑ پکڑ لیتا ہے اکھاڑ پھینکے۔

اسلام انسان کی تمام ضرورتوں کی طرف توجہ دیتا ہے۔ اس نے ہر ایک کے لئے قانون بنایا ہے یہاں تک کہ حلال و حرام غذا اور حلال و حرام جانوروں کی بھی تفصیل دی ہے۔ اور ان کو طیب اور خبیث کے الفاظ سے بیان کیا ہے:

''ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں: فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ''اللہ نے جو تمہیں حلال طیب رزق عطا کیا ہے اس میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی پرستش کرتے ہو۔'' (سورۂ نحل: آیت ۱۱۴)

قُلْ لَّا اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّا اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ "آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر جو وحی آتی ہے اس میں تو میں کچھ حرام نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لئے بجز اس کے کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت ہو جو گندا ہے یا جو فسق کا ذریعہ ہو یعنی غیراللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، سوائے اس کے کہ کوئی شخص مجبور ہوجائے بشرطیکہ طالب لذت نہ ہو اور حد سے تجاوز نہ کرے۔ ایسی حالت میں بے شک آپ کا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔" (سورۂ انعام: آیت۱۴۵)

حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّیَةُ وَالنَّطِیْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّیْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ "تم پر حرام کردیے گئے ہیں مردار اور خون اور سور کا گوشت اور جو جانور غیراللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو یا جس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو یا جو کسی ضرب سے یا بلندی سے گرنے یا سینگ لگنے سے مرجائے یا جسے کسی درندے نے چیر پھاڑ دیا ہو، سوائے اس صورت کے کہ تم اسے ذبح کرلو اور حرام ہے وہ جو کسی استھان پر بھینٹ چڑھایا گیا ہو اور حرام ہے یہ کہ تم جوئے کے تیروں سے تقسیم کرو۔ یہ سب گناہ کے کام ہیں۔" (سورۂ مائدہ: آیت۳)

پہلی آیت میں حرام گوشت کی تین قسموں کا بیان ہے۔ دوسری آیت میں اس پر مزید اضافہ کیا گیا ہے لیکن ان آیتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ پہلی آیت مکے میں نازل ہوئی اور دوسری مدینے میں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی ابتدا سے آپ کی مبارک زندگی کے آخری لمحات تک اسلامی قانون میں ارتقاء کا عمل جاری رہا۔ شاید دوسری آیت میں اسی گوشت کی مختلف مثالیں دی گئی ہیں جس کو پہلی

آیت میں اجمالی طور پر مردار کہا گیا تھا۔ بعبارت دیگر دوسری آیت میں پہلی آیت ہی کی وضاحت اور تفصیل ہے۔

ایک اور آیت میں ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّا اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ''یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور تمہارے سدھائے ہوئے شکاری جانوروں کا شکار بھی جو شکار پر چھوڑے جاتے ہیں جن کو تم اس طریقے پر سدھاتے ہو جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے۔ پس کھاؤ اس شکار کو جسے شکاری جانور تمہارے لئے پکڑیں اور لو اس پر اللہ کا نام۔'' (سورۂ مائدہ: آیت۴)

یہ آیت بتاتی ہے کہ خدا نے سب چیزوں کی پاکیزہ اقسام اپنے بندوں کے لئے حلال کی ہیں۔ کتاب و سنت میں طیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے حرام ہونے کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔ اس آیت کی شان نزول کے بارے میں ابوحمزہ اور حکم بن ظہیرہ سے روایت ہے کہ: ''زید الخلیل اور عدی بن حاتم آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ہم دو آدمیوں کے پاس چھ کتے ہیں جن سے ہم جنگلی گائے اور ہرن کا شکار کرتے ہیں۔ کچھ شکار زندہ ہاتھ آتا ہے اور کچھ جانور مر جاتے ہیں۔ اللہ نے مردہ جانوروں کا گوشت حرام کیا ہے۔ اب ہمارے لئے کون سا شکار حلال ہے۔ اس وقت یہ آیت کتوں کے شکار کے بارے میں نازل ہوئی۔

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں اور بھی اقوال ہیں۔ بہرحال شان نزول کچھ بھی ہو اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو آیت قبل جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان کے علاوہ سب کھانے کی چیزیں حلال ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتوں اور دوسرے سدھائے ہوئے جانوروں کا شکار جو شکاری کے پہنچنے سے پہلے ہی مر جائے وہ بھی حلال ہے۔ اس آیت میں ''تمہارے لئے پکڑیں'' سے

مراد یہ ہے کہ شکاری کتا یا کوئی اور شکاری جانور مالک کے لئے شکار کرے خود اپنے لئے نہیں۔ شکاری کے لئے ضروری ہے کہ کتے وغیرہ کو چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ لیا کرے۔ اس آیت میں مُکَلِّبِیْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو شکاری جانوروں کو سدھاتے اور تربیت دیتے ہیں۔ فقہاء نے شکار کے احکام میں شکاری کتے کے لئے کچھ اور بھی شرائط بیان کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۂ انعام کی آیت ۴۴ میں ایسی چیزیں گنوانے کے بعد جن کا کھانا حرام ہے فرماتا ہے کہ ایسی حالت میں جب آدمی بھوک سے لاچار ہوجائے ان چیزوں کا کھانا جائز اور مباح ہے۔ البتہ یہ شرط ہے کہ حرام چیز سرکشی کی نیت سے نہ کھائی جائے اور اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ یہ جواز صرف اس صورت میں ہے کہ بقدر ضرورت حلال غذا موجود نہ ہو۔ اس بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ فِی مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ "اگر کوئی بھوک کی شدت سے نڈھال ہو جائے بشرطیکہ گناہ کی طرف رغبت نہ ہو تو اللہ بڑا بخشنے والا اور بہت مہربان ہے۔" (سورۂ مائدہ: آیت ۳)

اس آیت میں مَخْمَصَةٍ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی بھوک کی شدت سے کھال کا ہڈیوں سے چپک جانا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰیٰتِهٖ مُؤْمِنِیْنَ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَیْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْهِ "کھاؤ اس میں سے جس پر خدا کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔ اور تمہارے لئے کیا وجہ ہے کہ تم اس (جانور کے گوشت) میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا جاچکا ہے جبکہ اللہ نے تمہیں تفصیل بتادی ہے ان (جانوروں) کی جو تم پر حرام کئے گئے ہیں سوائے ایسی حالت کے کہ تم مجبور ہوجاؤ ان کے کھانے پر۔" (سورۂ انعام: آیت ۱۱۸-۱۱۹)

ان دونوں آیات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا

ضروری ہے اور جس جانور پر بسم اللہ (یا اللہ اکبر) نہ کہا جائے وہ اسلام کی نظر میں مردار ہے۔ اس کا کھانا مجبوری کی حالت کے علاوہ جائز نہیں۔ جس طرح قرآن مجید میں تصریح ہے کہ جس پر بسم اللہ کہا جائے وہ حلال ہے اسی طرح اس کی بھی تصریح ہے کہ جس پر بسم اللہ نہ کہا جائے وہ حرام ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيَآئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ

''اس (جانور کے گوشت) میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو کیونکہ یہ حکم عدولی ہے۔ شیطان اپنے یاروں کو پٹی پڑھا رہے ہیں کہ تم سے حجت کریں۔ اگر ان کی بات مانو گے تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔'' (سورۂ انعام: آیت ۱۲۱)

جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں آیا ہے ''نہی'' کا صیغہ صریحاً حرمت پر دلالت کرتا ہے۔

اس آیت کی شان نزول میں لکھا ہے کہ کچھ ایرانی مجوسیوں نے مشرکین قریش کو جن سے ان کی اسلام سے پہلے کی دوستی تھی چٹھی لکھی:

''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ وہ خدا کے حکم کی پیروی کر رہے ہیں... اور سمجھتے ہیں کہ جو جانور وہ خود ذبح کریں وہ تو حلال ہے اور جس کو خدا ذبح کر دے وہ حرام ہے۔''

مشرکین کو ان کی یہ بات پسند آئی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین اور مجوس کو شیطان کہا ہے اور جو بات انہیں پسند آئی تھی اس کو شیاطین کے اپنے یاروں کو پٹی پڑھانے سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کام سے منع فرمایا اور مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ ان کی باتوں پر کان نہ دھریں۔ ان کے کام کو نافرمانی اور حکم عدولی قرار دیا اور ان کے اتباع کو جو دوسروں کو قرآن مجید کے اوامر ونواہی سے سرکشی پر ابھارتے ہیں شرک کا نام دیا۔

اسلام سے پہلے صدقات کا نظام

بعض قرآنی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں میں صدقات کا ایک مخصوص نظام موجود تھا جو جانوروں اور زرعی پیداوار سے متعلق تھا۔ جب اسلام کا لازوال قانون ان کی زندگی میں داخل ہوا تو اس نے ان کے صدقات کے نظام کو بدل دیا اور زکوٰۃ کو جو حکومت کی آمدنی کا ذریعہ اور غریبوں کی حاجت روائی کا وسیلہ ہے ان پر واجب قرار دیا۔ اسلام سے پہلے عربوں کا یہ طریقہ تھا کہ اپنی دولت کا ایک حصہ خدا کے لئے اور ایک حصہ بتوں کے لئے مخصوص کردیتے تھے۔ بتوں کا حصہ تو بتوں کے لئے ہی خرچ کرتے تھے لیکن خدا کے حصے میں سے بھی ضرورت پڑنے پر بتوں کے لئے خرچ کردیتے تھے۔ اگر جو حصہ بتوں کے لئے رکھ چھوڑتے تھے وہ بڑھ جاتا تھا اور خدا کے حصے میں کمی پڑتی تھی جب بھی وہ بتوں کے حصے میں سے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے تھے کیونکہ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے۔ قرآن مجید میں اس شرک آلود طریقے کا رَد کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالٰی ہے: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ "ان لوگوں نے کھیتی اور مویشیوں میں سے جو اللہ ہی نے پیدا کئے ہیں کچھ حصہ اللہ کا مقرر کر رکھا ہے اور اپنے خیال کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے دیوتاؤں کا۔ اب جو حصہ ان کے دیوتاؤں کا ہے وہ تو اللہ تک نہیں پہنچتا اور جو حصہ اللہ کا ہے وہ ان کے دیوتاؤں تک پہنچ جاتا ہے۔ کیسا برا ہے ان کا فیصلہ۔" (سورۂ انعام: آیت ۱۳۶)

یہ دیوتا ان کے وہ بت تھے جن کا حصہ وہ اپنے اموال میں لگاتے تھے۔ ایک اور آیت میں بتوں کے حصے کے مصارف کا بیان ہے: وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا

يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ'' کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور یہ کھیتی ممنوع ہیں۔ اپنے خیال کے مطابق سمجھتے ہیں کہ ان کو کوئی نہیں کھا سکتا سوائے اس کے جسے ہم چاہیں۔ اور (کہتے ہیں کہ) یہ چوپائے ہیں جن پر سواری حرام ہے۔ اور کچھ چوپائے ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یہ سب اللہ پر بہتان ہے۔ اللہ اس بہتان کا انہیں جلد بدلہ دے گا۔'' (سورۂ انعام: آیت ۱۳۸)

قرآن مجید میں ان مویشیوں اور اس کھیتی کا ذکر ہے جو جاہل عرب اپنے معبودوں کے لئے مخصوص کر دیتے تھے اور ان چیزوں کو بتوں کے خادموں کے سوا کسی دوسرے کے لئے حلال نہیں سمجھتے تھے۔ قرآن مجید میں ان جانوروں کا بھی ذکر ہے جن پر وہ سواری حرام سمجھتے تھے۔ ذیل کی آیت میں ان میں سے چار قسم کے جانوروں کا نام لیا گیا ہے: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ''اللہ نے کوئی (جانور) بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام قرار نہیں دیئے ہیں۔ دراصل یہ جو کافر ہیں اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔'' (سورۂ مائدہ: آیت ۱۰۳)

بحیرہ وہ اونٹنی ہے جو پانچ بچے جنتی اور ان میں کا آخری نر ہوتا۔ عرب نہ اس پر سوار ہوتے تھے نہ ذبح کرتے تھے بلکہ اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے جہاں چاہے چرتی پھرے۔ کیسی ہی ضرورت ہو کوئی اس پر سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ سائبہ اس جانور کو کہتے تھے جس کا مالک منت مان لیتا تھا کہ اگر سفر سے بخیریت واپس آ گیا یا بیماری سے اچھا ہو گیا تو اسے کھلا چھوڑ دے گا۔ اس جانور پر بھی بحیرہ کی طرح سوار نہیں ہوتے تھے اور اسے بھی پانی اور چراگاہ سے نہیں روکا جاتا تھا۔ وصیلہ اس بھیڑ بکری کو کہتے تھے جو ایک ہی جھول میں ایک نر اور ایک مادہ دو بچے دیا کرے۔ اگر یہ کسی دفعہ صرف نر جنتی تو اسے اپنے دیوتاؤں کے نام پر قربان کر دیتے اور اگر صرف مادہ جنتی تو اسے اپنے لئے رکھ لیتے۔ حام ایسے نر اونٹ کو کہا جاتا تھا جس سے دس اونٹ پیدا

ہو چکے ہوں۔ اس کو بھی کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا اور پانی چارے سے نہیں روکا جاتا تھا۔ ان الفاظ کے معنی میں اختلاف ہے۔ کچھ مختلف معنی بھی بیان کئے گئے ہیں۔(ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان جلد دوم)

قرآن مجید مشرکین عرب کے اس عقیدے کو نقل کر کے کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹ اور اللہ پر بہتان ہے۔

ان کا ایک اور عقیدہ یہ تھا کہ جو جانور زندہ پیدا ہوتا ہے اس پر صرف مردوں کا حق ہے اور جو مرا ہوا پیدا ہو وہ مردوں اور عورتوں دونوں کا ہے۔ اسلام نے اس خیال کی بھی تردید کی ہے اوراس طرح کی باتوں کے خلاف متنبہ کیا ہے: وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ ''اور کہتے ہیں کہ ان چوپایوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے اور ہماری بیویوں کے لئے حرام ہے لیکن اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ اللہ ان کے اس بیان کا جلد ان سے بدلہ لے گا۔'' (سورۂ انعام: آیت ۱۳۹)

قرآن مجید دلیل سے ان کے بیان کی تکذیب کرتا ہے اور ان کے قول کو جھوٹ اور بہتان قرار دیتا ہے۔ حق سبحانہٗ کا ارشاد ہے: ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَیْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَیْنِ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ '' آٹھ جوڑے (اللہ نے پیدا کئے) دو قسمیں بھیڑ کی اور دو بکری کی۔ آپ کہئے کہ اللہ نے آیا دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادوں کو یا ان بچوں کو جن کو دونوں مادائیں اپنے رحم میں لئے ہوئے ہیں۔ کیا

تم موجود تھے اس وقت جب اللہ نے یہ حکم دیا تھا؟ اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے بغیر جانے بوجھے اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے اللہ یقیناً بے انصاف لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (سورۂ انعام: آیت ۱۴۳۔۱۴۴)

بہرحال قرآن مجید سب چیزوں کو بجز ان چند چیزوں کے جن کی حرمت گزشتہ آیات میں بیان ہوئی ہے حلال قرار دیتا ہے۔ جو لوگ اپنی غلط روش سے باز نہیں آتے، بتوں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، بہت سی حلال چیزوں کو حرام کہتے ہیں، زندہ پیدا ہونے والے جانوروں کو مردوں سے مخصوص سمجھتے ہیں اور اسی طرح کے اور غلط عقیدے رکھتے ہیں، ان لوگوں کو قرآن مجید نے دردناک عذاب کی وعید دی ہے۔

قرآن مجید نے طیب چیزوں کو حلال اور خبیث چیزوں کو حرام کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ طیب چیزیں وہی ہیں جن کی قرآن و سنت میں ممانعت نہیں آئی ہے۔ احادیث جن کا کام حرام اور حلال جانوروں کی تفصیل بتلانا ہے کہیں تو ان جانوروں کی جن کا گوشت حرام ہے نام لے کر تصریح کرتی ہیں اور کہیں حرام و حلال میں فرق کی کچھ نشانیاں بتلاتی ہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ

جان اور دین کا دفاع ان مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں متعدد آیات قرآن مجید میں آئی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت کے بعد تقریباً تیرہ سال مکے میں گزارے اور لوگوں کو کھلے دلائل کے ساتھ اسلام کی دعوت دی۔ اس تمام مدت میں مشرکین کی طرف سے دی گئی ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کیں۔ مشرکین نے طرح طرح سے تکلیفیں بھی دیں اور آپ کا اور آپ کے اصحاب کا مذاق بھی اڑایا لیکن آپ ثابت قدم رہے یہاں تک کہ آپ نے مجبور ہو کر اپنے

اصحاب کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔ کیونکہ آپ کو اپنے اصحاب کے خلاف قریش کی طرف سے کارروائی کا خوف تھا اور ابھی آپ کے پاس اتنی کافی طاقت نہیں تھی کہ ان کا دفاع کر سکیں۔

خود آنحضرتؐ اپنے صحابہ کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ مکے ہی میں قیام فرما رہے۔ آپ کے صحابہ نے اسلام کی دعوت کو پھیلانے میں ہر طرح کے مصائب برداشت کئے یہاں تک کہ قریش کو احساس ہونے لگا کہ آپ کی دعوت کے مقابلے کے لئے جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ چنداں مؤثر نہیں۔ اسلام کا اثر روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور اسلام کے اصول لوگوں کے دل میں گھر کرتے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج ان کے خیال میں سوائے جنگ اور حضور کے قتل کے کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ اس بات پر وہ سب متفق ہوگئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو تو یہ منظور تھا کہ آنحضرتؐ کو دین حق کا ہادی اور مبشر بنائے اور مشرکین کی خواہش کے برخلاف آپ کے دین کو تمام ادیان پر غلبہ عطا کرے۔ اس لئے اللہ نے ان کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔

اللہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے رسولؐ ان سرکشوں کے جال میں گرفتار ہوں۔ اس لئے آپ پر وحی آئی کہ آپ مکے سے چلے جائیں۔ چنانچہ آپ مکے سے روانہ ہوگئے۔ آپ کے جاں نثار چچازاد بھائی امام علیؑ نے اپنی جان پر کھیل کر اس بستر پر سونا منظور کر لیا تھا جس پر قریش کے منصوبے کے مطابق رسول اکرمؐ کو قتل کرنا طے ہوا تھا۔ چنانچہ رات کو موت آنکھوں کے سامنے تھی۔ آپ آنحضرتؐ کے بستر پر قریش کی سونتی ہوئی تلواروں اور زہر آلود تیروں کی پروا کئے بغیر سو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ابھی زندگی کی تمام رعنائیاں اور دلکشیاں باقی تھیں۔ پھر بھی آپ موت کو گلے لگانے کے لئے تیار تھے۔ زندگی کے اس نازک ترین مرحلے پر موت آپ کے لئے خوشگوار ترین آرزو تھی جسے آپ عین سعادت سمجھتے تھے۔ ان لمحات میں آپ کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ رسول اکرمؐ

محفوظ رہیں اور دشمنوں سے آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے تاکہ آپ منصب رسالت کے فرائض بے کم و کاست انجام دے سکیں اور اس دین کی بنیادیں قائم کرسکیں جو عدل و مساوات اور حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے اور ہر ظلم و زیادتی اور برائی سے روکتا ہے۔

بچپن، جوانی اور میانہ سالی میں امام علی علیہ السلام کی ہمیشہ یہی ایک تمنا رہی اور اس خیال کے تحت آپ نے میدان جنگ میں ظلم و شقاوت کی طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ آپ نے خود فرمایا: "وَاللّٰهِ لَوْ اُعْطِيْتُ الْاَقَالِيْمَ السَّبْعَةَ بِمَا تَحْتَ اَفْلَاكِهَا عَلٰى اَنْ اَعْصِيَ اللّٰهَ فِيْ نَمْلَةٍ اَسْلُبُهَا جُلْبَ شَعِيْرَةٍ مَا فَعَلْتُهُ اگر ہفت اقلیم اور ان میں زیر آسمان جو کچھ بھی ہے سب دے کر مجھ سے یہ کہا جائے کہ میں ایک چیونٹی کے بارے میں اللہ کی نافرمانی کر کے اس کے منہ سے ایک جو کا چھلکا چھین لوں تو بھی میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔" (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۱، ترجمہ مفتی جعفر حسین)

خدا نے اپنے رسولؐ اور اپنے دین کی نصرت کیلئے امام علیؑ کو منتخب کیا اور عربوں میں سے اہل یثرب کو یہ عزت بخشی کہ وہ اس کے رسولؐ کے استقبال کیلئے دوڑیں۔ دین حق پر ایمان لائیں اور یہ عہد کریں کہ قریش کی دشمنی اور ان کی چالوں سے نبی کریمؐ کی حفاظت کے لئے وہ کسی جانی و مالی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

وہ پہلی آیتیں جن میں اپنے مقدس مذہب اسلام کے دفاع کی اجازت دی گئی مدینہ میں نازل ہوئیں۔

جہاد سے متعلق پہلی آیت یہ تھی: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ "اب لڑنے کی ان لوگوں کو اجازت دیدی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔"
(سورۂ حج: آیت ۳۹)

مکہ میں مشرکین مسلمانوں سے وعدہ خلافی کرنے اور انہیں آزار دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ مسلمان تکلیفیں اٹھا کر اور زخمی ہو کر آنحضرتؐ کی خدمت میں

حاضر ہوتے تھے۔ آپ ان کو صبر و استقامت کی تلقین فرماتے۔ کیونکہ ابھی تک جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ مکے سے ہجرت کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس نے مشرکین کے ظلم و تعدی کو روکنے کے لئے ان سے جنگ کی اجازت دے دی۔ کیونکہ مشرکین نے مسلمانوں کو صرف اس قصور پر شہر بدر کیا تھا کہ مسلمان کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار خدائے واحد ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی کوئی خطا نہیں تھی۔

اس آیت کریمہ کے بعد اور آیات بھی نازل ہوئیں جن میں جان اور مذہب کے دفاع کو جائز قرار دیا گیا منجملہ ان کے ایک آیت یہ ہے: وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ''لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں لیکن حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۰)

اس آیت کی شان نزول کے متعلق ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ کے رسولؐ اپنے صحابہ کے ساتھ عمرے کی نیت سے تشریف لے گئے تو ان کی تعداد چودہ سو تک پہنچتی تھی۔ ان لوگوں نے حدیبیہ میں پڑاؤ کیا تھا۔ مشرکین چونکہ ان کے خانۂ کعبہ تک جانے میں مزاحم ہوئے اس لئے مسلمانوں نے وہیں قربانی کی۔ اس موقع پر مشرکین سے ان شرائط پر صلح ہوئی:

اس سال مسلمان واپس چلے جائیں اور اگلے سال آکر کعبہ کا طواف کریں۔ اس وقت قریش تین دن کے لئے مکہ خالی کردیں گے تاکہ مسلمان عمرہ کے مراسم حسب دلخواہ انجام دے سکیں۔ چنانچہ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس چلے آئے اور اگلے سال عمرۂ قضا کے لئے روانہ ہوئے۔

آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قریش پیمان شکنی کریں اور جنگ چھڑ جائے۔ آپ ماہ حرام میں اور خانۂ کعبہ میں لڑنا نہیں چاہتے تھے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر مشرکین لڑنے ہی کا فیصلہ کرلیں تو ان

سے لڑو خواہ حرام مہینوں (رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم) میں ہی لڑنا پڑے۔
(تفسیر مجمع البیان و دیگر کتب تفسیر)

کہتے ہیں کہ یہ پہلی آیت ہے جو جنگ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد سے رسول اکرمؐ نے ہر اس شخص سے جنگ کی جس نے آپ سے لڑنا چاہا لیکن جس نے بھی لڑائی سے ہاتھ اٹھالیا تو آپ نے بھی پھر اس سے تعرض نہیں کیا۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قَاتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكَافِرِيْنَ ''ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ اور نکال دو انہیں جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے کیونکہ فتنہ جنگ سے بھی بدتر ہے۔ اور ان سے مسجد الحرام میں قتال نہ کرو جب تک کہ وہ لوگ تم سے خود وہاں نہ لڑیں۔ ہاں اگر وہ لڑیں تو تم بھی ان کو مارو۔ یہی سزا ہے کافروں کی۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۱)

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین جہاں بھی ہوں ان سے جنگ کرو سوائے مسجد الحرام کے۔ لیکن اگر مشرکین خود وہاں جنگ کا آغاز کریں تو دوسری بات ہے۔ آیت کہتی ہے کہ ان کے ''شرک کا فتنہ'' ماہ حرام میں جنگ سے شدید تر ہے کیونکہ شرک ناقابل بخشش ہے۔ اس سے جو مفاسد پیدا ہوتے ہیں وہ ان اعلیٰ اقدار کے لئے سمِ قاتل ہیں جن پر اسلام زور دیتا ہے۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت میں ارشاد ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ''ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہوجائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو سختی کسی پر نہیں سوائے ظالموں کے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۹۳)

یعنی اس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ شرک مٹ نہ جائے۔ اسلام کو

دوسرے سب ادیان پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے اور کافروں اور مشرکوں کی حکومت کمزور نہ ہو جائے۔ اس آیت کے یہ معنی ابن عباسؓ، مجاہدؒ نیز امام جعفر صادقؑ سے منقول ہیں۔ لیکن اگر مشرکین اسلام لے آئیں اور خدا اور اس کے رسول کو تسلیم کر لیں تو پھر ان سے لڑنا ناانصافی ہوگا اور اسلام ناانصافی کا ہرگز قائل نہیں۔

جہاد سے متعلق قرآنی آیات سے مجموعی طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے بلاوجہ جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس لئے لڑنا ضروری قرار دیا تاکہ مشرکین کے ظلم کا خاتمہ ہو اور دین خالص اللہ کے لئے ہو جائے۔ اس کے علاوہ کوئی غرض نہیں۔

عمومی طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی بنیاد حکمت اور خیر کی تبلیغ پر ہے جنگ اور سختی پر نہیں۔[1]

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ "آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلایئے حکمت اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجئے پسندیدہ طریقے سے۔" (سورۂ نحل: آیت ۱۲۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ اسی تعلیم پر عمل کیا سوائے ان مخصوص موقعوں کے جہاں آپ کے لئے ضروری ہوا کہ دشمنوں کی چالوں اور عداوت کا خاتمہ کر دیں تاکہ شرک توحید پر اور کفر اسلام پر غالب نہ آنے پائے۔

۱۔ مسلمانوں کو کفار قریش اور یہودیوں کے خلاف کئی جنگیں لڑنی پڑیں جن میں سے زیادہ تر جنگوں میں مسلمان فتحیاب ہوئے۔ ہجرت مدینہ کے بعد دس سال تک کے طویل عرصے میں تقریباً اسی غزوات اور سرایا ہوئے جن میں دو سو سے کم مسلمان اور ایک ہزار سے کم کفار قتل ہوئے۔ (دیکھئے: علامہ سید محمد حسین طباطبائی کی شیعہ در اسلام اردو ترجمہ پاسداران اسلام صفحہ ۲۱۳ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی۔ مکتب رسولؐ، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی کے صفحہ ۲۹۹ پر استاد محسن قرائتی نے یہ تعداد ۱۰۰۷ بتائی ہے)۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق

اسلام کے مستحکم ترین قوانین میں سے ایک عائلی قانون ہے جس کی انسان کو ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔ اسلام کا یہ قانون عورتوں سے متعلق مسائل کا عمدہ حل پیش کرتا ہے یعنی ان مسائل کا جن کا تعلق معاشرے کی نصف تعداد سے ہے۔ آج کے لڑکے لڑکیاں یا کل کے ماں باپ عورتوں ہی کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ خاندان اور معاشرے کی تشکیل میں عورت ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اسلام نے اس کی طرف خاص توجہ دی ہے اور بہت سے معاملات میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات اور برابری قائم کی ہے۔

سیکڑوں ہزاروں برس تک مختلف قوموں نے عورتوں کے حقوق کی طرف سے آنکھیں بند رکھیں یہاں تک کہ ان کو بھی عام سامان کی طرح لوگ خریدتے اور بیچتے رہے اور ان کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور اس طرح یہ لوگ فطری طریقے سے بہت دور جا پڑے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اسلام سے قبل اور اس کے بعد عورت پر بہت مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ اس دور میں شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ عورت بھی دوسرے مال و منال کی طرح وارثوں کی ملکیت قرار پا جاتی تھی۔ ایک زمانے میں متعدد مرد ایک عورت کے مالک بن جاتے تھے۔ کچھ عرب اور چیزوں کے علاوہ بیوی میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ عام طور پر طریقہ یہ تھا کہ کئی بھائی مل کر ایک مشترک بیوی کر لیتے تھے جس کا سربراہ بڑا بھائی ہوتا تھا۔ ان میں سے کوئی جب اس نے

ہمبستری کرنا چاہتا تھا تو اپنا عصا بطور نشانی خیمے کے دروازے پر چھوڑ دیتا تھا تاکہ دوسرے بھائی مخل نہ ہوں۔ (تاریخ العرب قبل الاسلام)

عربوں میں نکاح کے بھی کئی طریقے تھے۔ مثال کے طور پر دس آدمی بھی ایک بیوی میں شریک ہوجاتے تھے اور یہ سب اس کے ساتھ ہمبستری کرتے تھے۔ جب عورت کو حمل ٹھہر جاتا تھا تو اگر لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بچہ جننے کے چند دن کے بعد اپنے سب شوہروں کو اکٹھا کرتی اور اپنی خواہش اور میلان کے مطابق بچے کو ان میں سے کسی ایک کا بتا دیتی تھی۔ اس کا پورا اختیار عورت کو تھا۔ مردوں میں سے کوئی اس معاملے میں دخل نہیں دے سکتا تھا لیکن اگر لڑکی پیدا ہوتی تھی تو وہ اسے اپنے شوہروں سے پوشیدہ رکھتی تھی۔

نکاح کی ایک اور قسم "استبضاع" تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خود شوہر اپنی بیوی کو کسی ایسے مرد کے سپرد کردیتا تھا جو بہادر، تندرست، فیاض اور طاقتور ہو اور خود کنارہ کشی کرلیتا تھا تاکہ عورت اس مرد سے حاملہ ہوجائے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ عورت اپنے شوہر سے کہتی تھی کہ وہ کوئی بہادر اور فیاض مرد تلاش کرے تاکہ وہ اس کے لئے ان ہی اوصاف کا حامل بچہ پیدا کرسکے۔ جاہل عربوں کی تاریخ میں اس طرح کے اور نمونے بھی ملتے ہیں۔ (بلوغ الارب فی احوال العرب)

عورت اور خصوصاً بیٹی جننے والی عورت کو ایام جاہلیت میں کس قدر حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اس کا اندازہ قرآن مجید کی مختلف آیات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ "اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم میں قتل کیا گیا تھا؟"
(سورۂ تکویر: آیت ۸و۹)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَإِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ

اَمْ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ دل میں گھٹنے لگتا ہے۔بیٹی کی شرم کے مارے چھپا چھپا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا ذلت برداشت کر کے اس کو رکھ لے یا اس کو مٹی میں گاڑ دے۔ دیکھو کتنا غلط ہے ان کا خیال۔'' (سورۂ نحل: آیت ۵۸و ۵۹)

اس آیت کی تائید ان بہت سے قصوں سے ہوتی ہے جو عربوں کی سنگدلی اور ان میں عورتوں کی تحقیر کے متعلق بیان کئے جاتے ہیں۔ جب عربوں نے دیکھا کہ اسلام عورت کی شخصیت کا اعتراف کرتا ہے اور اس کو بھی دوسرے وارثوں کی طرح میراث میں حصہ دیتا ہے تو وہ بہت گھبرائے۔ ان میں سے کچھ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اعتراض کیا اور بحث کرنے لگے کہ عورت نہ گھوڑے پر سوار ہوسکتی ہے نہ جنگ میں حصہ لے سکتی ہے۔

عرب اس کو جائز سمجھتے تھے کہ کوئی لڑکا اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کرلے۔ اسلام نے ایسے نکاح کو حرام قرار دیا: وَلَا تَنْکِحُوْا مَانَکَحَ آبَاؤُکُمْ مِنَ النِّسَآءِ ''جو عورتیں تمہارے باپوں کے نکاح میں رہی ہیں ان سے نکاح مت کرو۔'' (سورۂ نساء: آیت ۲۲)

عورت پر اسلام کی مہربانی

یہاں اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کی عورتوں کی تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں ہے۔ ہمارا مقصد یہاں یہ بتلانا ہے کہ اسلام نے اپنی دعوت کے آغاز ہی سے بہت سے معاملات میں عورتوں اور مردوں کے درمیان حقوق و فرائض میں مساوات قائم کردی تھی۔ اسلام نے نہ صرف عورتوں کے حقوق کا دفاع کیا بلکہ ان کی پاکی اور

شرافت پر بھی زور دیا تاکہ کوئی شخص عورتوں کو محض مردوں کی جنسی ضرورت پوری کرنے اور ان کی بھڑکی ہوئی شہوت کو تسکین دینے کا ذریعہ نہ قرار دے سکے۔

ہم یہاں چند ایسی قرآنی آیات پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عائلی نظام اسلام نے مقرر کیا ہے وہ کیا ہے۔

اس سے پہلے ہم نے اپنی کتاب حقوق المراۃ فی الاسلام (اسلام میں حقوق نسواں) کے مختلف حصوں میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور عورت کے بارے میں اسلامی نظریے اور مغربی معاشروں کے رویے میں مقابلہ کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ صرف اسلام ہے جو عورت کو مرد کے برابر اور بعض صورتوں میں مرد سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ گو اہل مغرب اور مغرب زدہ لوگ جو اسلام سے کوسوں دور ہیں اب بھی یہ الزام لگاتے ہیں کہ اسلام میں عورت کی حالت زمانۂ جاہلیت سے بھی بدتر ہے۔

گزشتہ زمانے میں مرد عورت کے ساتھ مطلق العنانی سے پیش آتا تھا۔ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا اور اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرتا جو اپنے دوسرے مال و اسباب کے ساتھ کرتا تھا۔ فرانس کا ایک بڑا دانشور بیان کرتا ہے کہ ایک بار فرانس کی ایک علمی اکیڈمی میں اس بات پر گرما گرم بحث ہوئی کہ کیا مرد کی طرح عورت کے بھی روح ہے۔ بحث میں اور تو کچھ طے نہ ہوسکا البتہ اس بات پر اتفاق رائے ہوگیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام ضرور ذی روح تھیں۔ (نقل از المراۃ فی الاسلام، مؤلفہ استاذ احمد کمال عون) مشہور مصری مصنف قاسم امین نے اپنی کتاب المراۃ الجدیدۃ (دور جدید کی عورت) میں لکھا ہے:

"شوہر کے گھر پہنچتے ہی عورت کی آزادی ختم ہوجاتی تھی۔ یونانیوں، رومیوں، جرمنوں، ہندوؤں اور عربوں میں شوہر خاندان کا سرپرست ہونے کے ساتھ ساتھ بیوی کا بھی مالک ہوتا تھا۔ جس طرح کوئی غلام کو خرید کر اس کا مالک بن جاتا ہے

اسی طرح بیوی سے عقد نکاح کے معنی یہ تھے کہ شوہر نے اس کو خرید لیا۔ مرد گویا کہ اپنی بیوی کو اس کے باپ سے خریدتا تھا لہٰذا باپ کے تمام حقوق بھی اسے منتقل ہوجاتے تھے۔ شوہر کو اجازت تھی کہ دوسرے سامان کی طرح بیوی کا بھی جو دل چاہے کرے۔ جی چاہے تو اسے کسی دوسرے مرد کے ہاتھ فروخت کردے۔"

جن لوگوں نے اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد عورت کی حالت کا مطالعہ کیا ہے ان میں سے اکثر نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانے میں یورپ تک میں عورتوں کے ساتھ بے رحمی اور حقارت کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ آج وہی اہل یورپ عورت مرد کی برابری کا غل مچائے ہوئے ہیں اور اپنی مادر پدر آزادی پر فخر کرتے ہیں۔

عورتوں سے بے رحمی کے برتاؤ کی جو داستان لکھنے والوں نے لکھی ہے وہ سچ ہو یا جھوٹ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے نہ صرف عورت کو ایک جداگانہ شخصیت عطا کی بلکہ اسے عزت و وقار کا مستحق ٹھہرایا۔ اس طرح اسلام کے بعد سے مسلمان عورت نے ایک ایسی نئی زندگی کا آغاز کیا جس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اسلام نے عورت کو اس کا فطری مقام دیا، اس کے حقوق بحال کئے اور اس کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔

اکیلا مرد یا اکیلی عورت زندگی کی گاڑی نہیں چلا سکتے۔ وہ دونوں مل کر زندگی کو باقاعدہ بنانے کے ذمہ دار ہیں کیونکہ وہ دو نہیں گویا ایک ہی ہیں: خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً "اللہ نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔"

(سورۂ نساء: آیت ۱)

ان ہی ایک میاں بیوی سے اتنے بہت سے مرد اور عورتیں بن گئے اور ان ہی دو کی بدولت یہ بھری پُری دنیا آباد ہوگئی اور زندگی نے رونق پائی۔ مرد عورت نے مل کر اس مقصد کے لئے کام کیا جو قدرت نے ان کے لئے مقرر کردیا تھا۔ ان کے

باہمی تعاون ہی کی وجہ سے انسانی آبادی بڑھتی اور پھیلتی رہی۔ یہ سنت الٰہی نہ صرف تمام جانداروں میں بلکہ تمام موجودات میں یکساں طور پر جاری وساری ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ "ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔" (سورۂ ذاریات: آیت ۴۹)

عورت مرد کی مشترک زندگی میں عورت کا کردار مرد سے کم نہیں ہے۔ عورت کی نیچر مرد سے مختلف نہیں۔ وہ محض شہوت رانی اور جنسی تمتع کے لئے پیدا نہیں کی گئی۔ اس کی بھی اپنی ایسی ہی شخصیت ہے جیسی مرد کی۔ اگر یہ دونوں اپنی اپنی حیثیت کو صحیح طور پر پہچانیں اور اس کے مطابق اپنے فرائض پر عمل کریں تو خاندانی نظام کو استحکام ملے اور اس کے نتیجے میں خود معاشرے کو استحکام حاصل ہو۔

اسلامی تعلیمات اور سنت نبوی کا جو بھی مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اسلام نے عورت اور اس کے حقوق کی حفاظت اور مرد کے ساتھ اس کی مساوات کے پہلو پر خاص توجہ دی ہے۔ عورت مرد کی اس برابری کا دائرہ نماز جمعہ، مسجد، جماعت، وعظ و ارشاد کی مجالس اور خطبات و تقاریر تک وسیع ہے۔ جناب رسول خداؐ عورتوں کی رہنمائی میں ذرا بھی کوتاہی نہیں فرماتے تھے۔ عورتیں جب کبھی آپ سے رہنمائی کی درخواست کرتی تھیں تو آپ کا ردعمل ہمیشہ مثبت ہوتا تھا۔ اسلام نے عورتوں کی قدر و منزلت اس سے بھی زیادہ تسلیم کی ہے۔ چنانچہ انہیں اجازت دی ہے کہ وہ بھی مردوں کے دوش بدوش گواہی دیں۔ رسول خداؐ نے اپنے صحابہ کو بار بار ایسی نصیحتیں کیں اور ایسے احکام دیئے جن کے گھریلو زندگی کی کامیابی اور شادمانی پر مفید اثرات مرتب ہوتے تھے۔

سیاسی اور اجتماعی میدان میں بھی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان خواتین نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا کر کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ اسلامی تاریخ کے صفحات ان کی دلیری اور شجاعت کی درخشاں داستانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

اسلام کی ابتدا ہی سے عورت نے مثبت کردار ادا کیا ہے اور اسلام کی تاریخ پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ام المومنین حضرت خدیجہؑ وہ پہلی خاتون تھیں جن کا دل اسلام نے جیت لیا۔ اسلام کے داعی اعظم کی تائید و نصرت میں اس عظیم خاتون نے جو روش اختیار کی وہ کسی دوسرے مسلمان اور آنحضرتؐ کے اقرباء میں سے بجز امام علی علیہ السلام کے کسی نے اختیار نہیں کی۔ اور وہ بھی اس وقت کہ اسلام کی روشنی ابھی کچھ زیادہ نہیں پھیلی تھی۔ جب آنحضرتؐ پہلی وحی کے نزول کے بعد گھر تشریف لائے تو آپ پر لرزہ طاری تھا۔ آپ نے پورا قصہ حضرت خدیجہؑ سے بیان کر کے اپنے اضطراب اور تشویش کا اظہار کیا۔[1] حضرت خدیجہؑ نے اسی خندہ روئی سے جو ہمیشہ سے آپ کی عادت تھی آنحضرتؐ کو تسلی دی اور کہا:

خدا کی قسم! آپ متردد نہ ہوں حق تعالیٰ آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔ آپ تو اپنے اعزاء و اقرباء کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے ہیں، ان کی خاطر تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں، مشکل میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں اے میرے ابن عم آپ بالکل خاطر جمع رکھیے۔

چونکہ حضرت خدیجہؑ کو اندیشہ تھا کہ شاید ان کی باتوں سے آنحضرتؐ کو وہ دلی اطمینان نہ حاصل ہوا ہو جو وہ چاہتی تھیں اس لئے وہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ ایک شریف اور جہاں دیدہ آدمی تھے۔ حضرت خدیجہؑ نے ان کو وہ سارا قصہ سنایا جو اُن کے شوہر کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ورقہ نے حضرت خدیجہؑ کو بشارت دی کہ آپ کے شوہر اللہ کے نبی ہیں اور کتب آسمانی کے

۱۔ علامہ سید ہاشم معروف نے یہ روایت معتبر ترین سنی مصادر پر اعتماد کرتے ہوئے نقل کی ہے۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کی طرف کا پیغمبر خود اپنی حقیقت سے واقف نہ ہو یا وہ اللہ کے پیغام سے دہشت محسوس کرے یا اُسے وحی الٰہی کی شناخت میں دوسرے آدمیوں سے پوچھنے اور اُن سے اطمینان حاصل کرنے کی ضرورت ہو۔ اس قسم کی باتیں عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار جیسے نومسلم یہودی نے وضع کیں اور ملوکیت کے وظیفہ خوار مورخین نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور اُن سے اپنی تاریخوں کے صفحات سیاہ کر دیئے۔

جاننے والے ان کا انتظار کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اے کاش ! میں اس وقت تک زندہ رہوں جب اسلام سے مشرف ہوکر رسولؐ برحق کی مدد کیلئے اٹھ سکوں۔

امام علیؑ کے بعد حضرت خدیجہؑ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر سب سے پہلے ایمان لائی تھیں۔ حضرت خدیجہؑ نے اپنا مال دین کے راستے میں خرچ کیا اور اپنے اثر و رسوخ سے دین کی خدمت کی۔ اپنے شوہر کے گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی پرورش کی یہاں تک کہ دین اسلام کے طاقت حاصل کر لینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا:

''اسلام کو علیؑ کی تلوار اور خدیجہؑ کے مال سے استحکام حاصل ہوا۔''

حضرت خدیجہؑ ان مسلمان عورتوں کے لئے ایک نمونہ تھیں جنھوں نے دین کا دفاع کیا اور دین کی خاطر جہاد میں حصہ لیا۔ ان خواتین نے دین کی راہ میں بڑی ثابت قدمی سے تکالیف برداشت کیں یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے ۱۷ عورتوں کو حبشہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔ جب خدا نے کفار و منافقین کے خلاف جہاد واجب قرار دیا تو مسلمان خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ اسلام کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان میں وہ خواتین بھی تھیں جو اپنے شوہروں اور بچوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہوئیں۔ مسلمان عورت نے کسی حال میں بھی دشمنان دین کے مقابلے میں رسول اکرمؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ شیر دل مسلمان خواتین نے دین متین کی بڑی خدمات انجام دیں۔ جنگوں میں زخمیوں کا علاج کیا، لشکریوں کے لئے کھانا تیار کیا، تلوار اور نیزے بھی اٹھائے اور بڑے بڑے بہادر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ خوں آشام دشمنوں کے مقابلے میں ام عمارہؓ کی قابل تعریف ثابت قدمی کا ذکر تاریخ میں محفوظ ہے۔ خود رسول اکرمؐ نے ام عمارہؓ کے بارے میں فرمایا تھا:

''میں دائیں بائیں جدھر بھی دیکھتا تھا ام عمارہ نظر آتی تھیں۔''

آپ نے ام عمارہؓ کے بیٹے سے فرمایا:

''تمہاری ماں کی ثابت قدمی فلاں فلاں سے بہتر تھی۔''

یہ باعزم و ہمت خاتون ام عمارہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مرتدین سے جنگ کے لئے گئیں۔ یہ وہی تھیں جنہوں نے مرتدین کے سردار مسیلمہ کا کام تمام کیا۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ اس وقت تک میدان کارزار کو نہیں چھوڑوں گی جب تک مسیلمہ اپنے کیفر کردار کو نہیں پہنچ جاتا۔

اس طرح مسلمان عورت نے معاشرے میں اپنا کردار پوری طرح ادا کیا۔ ظالموں کے مقابلے میں دین اسلام کا ساتھ دیا اور اس مقصد کیلئے جہاد میں شرکت کی۔ یہاں تک کہ اسلام اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگیا اور ساری سرزمین عرب اس کے جھنڈے تلے آگئی۔ اسلام کی روشنی تیزی سے انسانی معاشروں میں پھیلنے لگی اور اپنی تابانی سے ہر طرف اجالا کردیا۔ اللہ تعالیٰ نے نور حق کو غلبہ عطا کیا، اللہ کی مدد آئی، فتح اسلام کی ہوئی، لوگ جوق درجوق دین حق میں داخل ہونے لگے۔

کیا اس سب کے باوجود بھی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے عورت کے حقوق کی طرف توجہ نہیں کی۔ یا اسلام نے مردوں کی صنف کو برتر قرار دیا اور اسی لحاظ سے ان کی حمایت کی۔ معترضین اور وہ لوگ جن کے دل میں اسلام بلکہ سب آسمانی مذاہب سے نفرت ہے اسلام کے بعض متفرق احکام کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ:

''اسلام نے مرد کا عورت پر تسلط جمایا اور مرد کو چار بیویاں کرنے کی اجازت دی۔ دوسرے یہ کہ اسلام نے میراث میں مرد کا حصہ عورت کے حصے سے دگنا رکھا۔ بعض صورتوں میں اسلام عورت کی شہادت قبول ہی نہیں کرتا اور جہاں قبول کرتا بھی ہے وہاں بھی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیتا ہے۔''

عیب جوئی اور اسلام کو نیچا دکھانے کے لئے اس طرح کے بعض فرق ہیں جن کا سہارا وہ دشمنان دین لیتے ہیں جن کے نزدیک مغرب میں جو کچھ ہوتا ہے وہی

مستند اور معیاری ہے۔

ہمارا منشا یہ نہیں کہ ہم اسلامی قانون میں ان احکام کے وجود سے انکار کردیں بلکہ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں یہ قانون اس لئے ہرگز نہیں کہ اسلام عورت کو حقیر سمجھتا ہے یا مرد کو عورت پر فوقیت دیتا ہے۔ اسلام تو وہ مذہب ہے جو فرد اور معاشرے کے تمام حقوق کا احترام کرتا ہے۔ اسلام کسی طرح کے طبقاتی امتیاز کا قائل نہیں اور کسی فرد کو دوسرے پر فوقیت نہیں دیتا۔ ہاں جس کے اعمال اچھے ہوں اس کو ضرور بہتر سمجھتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو بکثرت آیات سے عیاں ہوتی ہے:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ "جو کچھ کسی نے کمایا وہ اسی کے لئے ہے اور جو کچھ کسی نے گنوایا اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا۔" (سورۂ بقرہ: آیت۲۸۶)

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" (سورۂ انعام: آیت۱۶۴) وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ "ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔" (سورۂ نحل: آیت۱۱۱)

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا "جو کوئی نیکی کرے گا مرد ہو یا عورت اگر وہ صاحب ایمان ہوں گے ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔" (سورۂ نساء: آیت۱۲۴)

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى "ان کے رب نے ان کی دعا قبول کرلی (اور کہا) کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں ہونے دیتا۔" (سورۂ آل عمران: آیت۱۹۵)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ

وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرَاتِ اَعَدَّ اللهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، خشوع والے مرد اور خشوع والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔'' (سورۂ احزاب: آیت ۳۵)

اس آیت کریمہ میں عمل اور اس کی جزا کے بارے میں عورتوں اور مردوں کو مساوی قرار دیا گیا ہے۔ نجات، اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے معاملے میں دونوں برابر ہیں۔ اس لئے چند احکام کے بارے میں دونوں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ لامحالہ بعض مشکلات کی وجہ سے ہے۔ بعض موقعوں پر یہ فرق ان مصلحتوں کی بنا پر ہے جن پر شارع کی نظر ہے اور جو عورتوں اور مردوں میں باہمی تعاون کی اساس ہیں۔

یہاں چونکہ ہم نے احکام سے متعلق قرآنی آیات کا محض اجمالی طور پر ذکر کیا ہے جس سے ہمارا مقصد کتاب کے اصل موضوع کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ان احکام کی تمام ممکنہ مصلحتوں کو بیان کریں کیونکہ اس طرح ہم اصل موضوع سے بہت دور ہٹ جائیں گے۔ اصولی بات یہ ہے کہ اس طرح کی بحث کا ان لوگوں پر کوئی اثر ہونے کی بھی توقع نہیں جن کا مقصد ہی تفرقہ اندازی ہے اور جو اس قسم کے احکام کو محض اسلام پر حملہ کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ہاں یہ البتہ ممکن ہے کہ ہم عورتوں کی میراث، ان کی گواہی اور

تعدد ازواج (Polygamy) سے متعلق آیات پر بحث کرتے ہوئے عورت اور مرد میں فرق کی بعض وجوہ پر روشنی ڈالیں۔

اسلام میں ازدواج

منجملہ ان قوانین کے جن کا بیان قرآن میں ہے اور جن پر عمل کو اس نے بہت اہمیت دی ہے ایک نکاح ہے۔ اسلام مرد کو ترغیب دیتا ہے کہ ایسی بیوی کا انتخاب کرے جو راحت و آرام اور مسرت وسکون کا باعث ہو تاکہ بیوی کی محبت اس کے دل میں رچ بس جائے۔ میاں بیوی ہی وہ دو فرد ہیں جو زندگی میں ایک دوسرے سے بہت نزدیک ہوتے ہیں۔ ان کے باہمی تعلق کو خدا نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۷)

عورت، مرد کی شریک زندگی، گھر میں اس کی ہمدم اور اس کے بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ وہی گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی تربیت کرتی ہے تاکہ مرد بے فکری سے اپنا کام کاج کر سکے اور محنت کر کے اور تکلیف اٹھا کر بیوی بچوں کے لئے روزی کما سکے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب وہ دن بھر کا تھکا ہارا گھر واپس آئے تو کسی محبت بھرے دل کو اپنا منتظر پائے۔ گھر میں آ کر وہ ایسا سکون اور سلیقہ دیکھے کہ زندگی کی سب تکلیفیں بھول جائے۔

اسلام نے عورت کے حقوق کو بہت اہمیت دی ہے اور مرد کو عورت کے ساتھ مہربانی کرنے، اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے اور اس کے حقوق کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

خَيْرُ الرِّجَالِ خَيْرُهُمْ لِنِسَائِهِمْ "بہترین مرد وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہترین سلوک کرتے ہیں۔"

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک معروف (اچھا دستور) کا اعلیٰ ترین مصداق بیوی بچوں کا خرچ دینا ہے کیونکہ اس کی بڑی اہمیت ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ مَا اَکْرَمَ النِّسَاءَ اِلَّا کَرِیْمٌ وَلَا اَھَانَھُنَّ اِلَّا لَئِیْمٌ "صرف بڑے آدمی ہی عورتوں کا احترام کرتے ہیں اور صرف گھٹیا لوگ ہی انہیں حقیر سمجھتے ہیں۔"

دوسری طرف اسلام نے جس طرح مرد پر عورت کے حق کو اہمیت دی ہے اور مرد کو تاکید کی ہے کہ اس حق کا احترام کرے اسی طرح عورت پر شوہر کی اطاعت واجب قرار دی ہے اور اس پر لازم کیا ہے کہ اس کو اپنے نزدیک ترین رشتہ داروں سے بھی مقدم سمجھے۔

حدیث میں ہے کہ لَوْ اَمَرْتُ اَحَدًا اَنْ یَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَۃَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِھَا "اگر میں کسی کو کسی دوسرے کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ اِنَّ رِضَا الزَّوْجِ مِنْ رِضَا اللّٰہِ "شوہر کی خوشنودی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔"

اس طرح زوجین میں سے ہر ایک کی اس قیمتی رشتہ کی وجہ سے دوسرے کے ساتھ وابستگی کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور ایک کے دوسرے پر حقوق متعین کر دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں صاف صاف ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ "عورتوں کے اپنے ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر حقوق ہیں مناسب قاعدے کے مطابق۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۲۸)

اس آیت میں لفظ معروف سے یہ نکتہ نکلتا ہے کہ میاں بیوی کا ایک دوسرے پر حق کوئی خشک تجارتی ضابطہ نہیں جس کی جزئیات ٹھیک کاروباری حساب پر مبنی ہوں کہ اگر طرفین میں سے کوئی ذرا بھی کوتاہی کرے تو دوسرے کو بدلہ لینے کا حق ہو

بلکہ اس تعلق کی بنیاد ایک دوسرے کے ساتھ رعایت اور ایک دوسرے کی کوتاہیوں کو نظرانداز کرنے پر ہے۔

قرآن مجید نے نکاح کو میثاق محکم یعنی پختہ اقرار کہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ''اور تم اس (مہر) کو کیسے واپس لیتے ہو حالانکہ تم ایک دوسرے سے مقاربت کر چکے ہو اور یہ عورتیں تم سے پختہ اقرار۔ لے چکی ہیں۔'' (سورۂ نساء: آیت ۲۱)

یہ آیت عقد نکاح کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے۔ بعض دوسری آیات میں طرفین کے تعلق کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے: وَمِنْ آيَاتِهٖ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ''اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے ساتھ آرام پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی۔'' (سورۂ روم: آیت ۲۱)

گزشتہ ایک آیت میں ہم نے دیکھا تھا کہ قرآن مجید نے عورت کو لباس یا پوشاک کہا ہے۔ یہاں لباس سے مراد سامان راحت ہے یا وہ جگہ جہاں آرام و سکون ملے۔ اس معنی کی دوسری آیت سے تائید ہوتی ہے: وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ''ہم نے رات کو لباس اور دن کو روزی کمانے کا (وقت) قرار دیا۔'' (سورۂ نباء: آیت ۱۰۔۱۱)

مطلب یہ ہے کہ ہم نے رات کو آرام کا وقت قرار دیا جس طرح دن کو روزی کمانے اور کاروبار میں مشغول ہونے کے لئے رکھا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے میاں بیوی کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی اور انہیں ایک ہی بدن کے دو حصے شمار کیا۔ ایسے حصے کہ ان دونوں کی موجودگی کے بغیر معاشرہ تشکیل نہیں پاسکتا۔ معاشرے کی درستی ان دونوں کی درستی پر موقوف ہے اور ان کے بگاڑ سے پورا معاشرہ بگڑ

جاتا ہے۔ ایک دل ہے جو تڑپتا ہے اور دوسرا عقل ہے جو بہتری اور بھلائی کی طرف لے جاتا ہے۔ کوئی شخص نہ دھڑکتے ہوئے دل کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی عقل کے بغیر زندگی کی راہ طے ہوسکتی ہے۔

قرآن مجید اس مسئلے کو بڑی اہمیت دیتے ہوئے کہتا ہے:

''اس نے تم ہی میں سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے ساتھ آرام پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی۔''

''وہ تمہارے لئے پوشاک ہیں اور تم ان کے لئے پوشاک ہو۔''

چونکہ دونوں کی ذمہ داریاں یکساں ہیں اس لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''مناسب طریقے کے مطابق عورتوں کے بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے حقوق ہیں۔''

ایک اور سوال جس پر قرآن مجید نے زور دیا ہے اور سنت نبوی نے بھی تاکید کی ہے نکاح کا سوال ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ''تم اپنے بے نکاحوں کا نکاح کرو اور تمہارے غلام باندیوں میں سے جو اس لائق ہوں ان کا بھی۔ اگر یہ لوگ مفلس ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کردے گا۔ اللہ بڑا جاننے والا ہے۔ اس کی رحمت وسیع ہے۔'' (سورۂ نور: آیت ۳۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنْ تَزَوَّجَ فَقَدْ اَحْرَزَ نِصْفَ دِيْنِهٖ فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ فِي النِّصْفِ الْبَاقِيْ ''جس نے نکاح کیا اس نے اپنے آدھے دین کو محفوظ کرلیا۔ باقی آدھے کے لئے تقویٰ اختیار کرو۔'' نیز آپ نے فرمایا: ''اَلنِّكَاحُ سُنَّتِيْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ. نکاح میری سنت ہے جس نے اس سے روگردانی کی، اس سے میرا تعلق نہیں۔'' (بحار الانوار ج ۱۰۰، ۲۱۹۔۲۲۰)

تعدد ازواج

عربوں میں بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک مرد دس سے بھی زیادہ عورتوں سے نکاح کر لیتا تھا۔ اور یہ ان کے یہاں کوئی برائی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ تین آدمی جن کے نام نوفل بن معاویہ، عمرۃ الاسدی اور غیلان ثقفی تھے جب اسلام لائے تو ان میں سے ہر ایک کے چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ رسول اکرمؐ نے انہیں حکم دیا کہ چار چار بیویاں رکھ لو باقی کو چھوڑ دو۔ اسلام نے اپنے قوانین میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔ ایک خاص حد کے اندر تعدد ازواج کی اجازت دی ہے اور ساتھ ہی ایسی شرائط بھی لگادی ہیں جن کا پورا کرنا بسا اوقات دشوار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی وجہ سے اپنے فرائض و واجبات ادا نہ کرسکتا ہو تو ایسے شخص کے لئے اسلام کی رو سے ایک سے زیادہ نکاح کرنا حرام ہوگا۔ تعدد ازواج صرف اس صورت میں جائز ہے جب اس کے نتیجے میں کسی بیوی پر ظلم نہ ہوتا ہو اور نہ کسی کی حق تلفی ہوتی ہو۔ پھر بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنا محض مباح اور جائز ہے۔

ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کا حکم قرآن مجید میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے مال کی حفاظت کے ضمن میں آیا ہے:

وَاٰتُوا الْيَتَامٰى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتَامٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ''اور یتیموں کو ان کا مال دیدو اور مت بدلو پاکیزہ چیز کو گندی چیز سے اور ان کا مال مت کھاؤ اپنے مال کے ساتھ ملا کر۔ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف نہیں کرسکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرلو خواہ دو دو، تین

تین، چار چار سے۔ لیکن اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو، یا جو کنیز تمہاری ملک میں ہو اس پر۔ اس طرح اس کی زیادہ توقع ہے کہ زیادتی نہیں کرو گے۔" (سورۂ نساء: آیت ۲و۳)

جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ اسلام بعض ایسی شرائط کے ساتھ جو عورت کے حقوق اور اس کی عزت کی حفاظت کرتی ہیں ایک سے لے کر چار بیویوں تک کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام سے قبل جو چار سے زیادہ بیویوں کا رواج تھا وہ اسلام نے ختم کردیا۔

کچھ مصنفین نے اسلام پر اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات سے بچنے کے لئے یہ کوشش کی ہے کہ اس آیت کی اس طرح تفسیر اور تشریح کی جائے جو معترضین کی خواہش اور ان کے مزاج کے مطابق ہو۔ چنانچہ ان کا استدلال یہ ہے کہ قرآن مجید نے صاف صاف تعدد ازواج کو حرام قرار دیا ہے کیونکہ اس آیت میں تعدد ازواج کی عام اجازت ہرگز نہیں دی گئی ہے۔ یہ اجازت صرف اس شخص کیلئے ہے جو بیویوں میں عدل قائم رکھ سکے۔ اور عدل کے متعلق ایک دوسری آیت میں ہے کہ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ "تم عورتوں کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکتے گو تمہیں اس کی کیسی ہی خواہش ہو۔" (سورۂ نساء: آیت ۱۲۹)

چونکہ عدل کا قائم رکھنا کسی انسان کے لئے ممکن نہیں اس لئے ان دونوں آیتوں کو ملانے سے خودبخود یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ تعدد ازواج جائز نہیں کیونکہ اس کے لئے جو شرط رکھی گئی ہے وہ پوری نہیں کی جاسکتی۔

بدقسمتی سے یا تو یہ لوگ مخالفین کے شور و غوغا سے غلطی میں پڑ گئے ہیں یا پھر اس عدل کے معنی سے بے خبر ہیں جس کے ممکن نہ ہونے کی قرآن مجید میں تصریح ہے۔ انہوں نے خود اپنے استدلال سے اسلام کے دشمنوں کو حقوق و آزادئ نسواں کے بارے میں اسلام پر حملہ کرنے کا موقع فراہم کردیا ہے۔ یہ مصنفین یہ بھول گئے

کہ جس عدل کو قرآن مجید نے تعدد ازواج کی شرط قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر لحاظ سے مساوات ہو حتیٰ کہ اندرونی محبت اور قلبی رجحان میں بھی برابر ہو بلکہ صرف نان نفقہ، عورتوں کے حقوق اور اسی طرح کے کچھ مسائل میں برابری مراد ہے۔ دلی تعلق اور محبت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر انسان کا اپنا بس ہو اور اسی وجہ سے آدمی اس کا مکلف بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ اصولی بات ہے کہ آدمی اسی چیز کا مکلف ہوتا ہے جو اس کے اپنے بس میں ہو۔ رہا وہ عدل جس کی دوسری آیت میں نفی کی گئی ہے اس سے مراد تمام معاملات میں کلیۃً برابری ہے جس میں محبت اور تعلق خاطر بھی آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس معنی میں عدل تعدد ازواج کی شرط نہیں ہے بلکہ صرف نان ونفقہ، بیوی کی دیکھ بھال اور اس کی ضروریات پوری کرنے میں برابری کی شرط ہے۔ اس طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ سب معاملات میں مساوات ممکن نہ ہونے اور بعض معاملات میں مساوات ممکن ہونے کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس بات کی تائید کہ یہاں صرف بعض معاملات میں عدل مراد ہے اس آیت کے آخری حصے سے ہوتی ہے: فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ''تم بالکل ایک ہی (بیوی کی) طرف نہ جھک جاؤ اور (دوسری بیوی کو) اس طرح نہ چھوڑدو کہ گویا وہ درمیان میں لٹکی ہوئی ہے۔'' (سورۂ نساء: آیت ۱۲۹)

اللہ کے کامل واکمل نبیؐ جن کا اسوۂ حسنہ ہم مسلمانوں کے لئے قابل اتباع ہے اپنی بیویوں کے درمیان رَتنا شوئی، نان نفقہ اور ان کے حقوق کے معاملے میں مساوات کا پورا خیال رکھتے تھے اور فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ هٰذَا قِسْمِيْ فِيْمَا اَمْلِكُ فَلَا تُوَاخِذْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ ''اے اللہ! یہ تو وہ تھا جو میرے بس میں تھا۔ اب جو تیرے بس میں ہے اور جس پر مجھے اختیار نہیں اس کے بارے میں مجھ سے بازپرس نہ فرمانا۔'' (عوالی اللآلی ج ۲، ص۱۳۴)

جو چیز آپ کے بس میں نہیں تھی اس سے آپ کی مراد ''دل کی محبت'' تھی۔

اگرچہ مذکورہ بالا آیت یتیموں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق کی حفاظت کے بارے میں ہے لیکن اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس میں ضمناً ایک دائمی قانون بھی جو معاشرے کے لئے ضروری تھا بیان کردیا گیا۔

اس آیت کی شان نزول کے بارے میں ایک روایت ہے کہ ایک مسلمان کے گھر میں ایک یتیم لڑکی تھی۔ جب وہ بلوغ کی عمر کو پہنچی تو اس شخص کو لڑکی کے حسن اور اس کی دولت کی کشش پیدا ہوئی اور اس نے چاہا کہ اس لڑکی سے شادی کرلے مگر دوسری بیویوں کی طرح اسے کوئی مہر ادا نہ کرے۔ اس آیت میں تصریح ہے کہ یتیموں کے سرپرستوں کو چاہئے کہ جب یتیم سن ازدواج کو پہنچ جائیں تو ان کا مال ان کے حوالے کردیں اور بغیر مہر ادا کئے ان سے نکاح نہ کریں۔ اسی ضمن میں اس اجازت کا بھی ذکر ہے کہ ایک مرد دو، تین یا چار بیویاں کرسکتا ہے۔ آیت کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ تم اگر یتیم لڑکیوں کو مہر دینا نہیں چاہتے تو انہیں چھوڑدو اور دوسری عورتوں سے نکاح کرلو، چاہے تم یتیم لڑکیوں کے حسن یا ان کی دولت پر کتنے ہی فریفتہ کیوں نہ ہو۔

اس قانون کے وضع کرنے سے جس کی اصل قرآن مجید میں موجود ہے اسلام کا ہرگز یہ منشا نہیں جیسا کہ اہل مغرب اور دوسرے مغرب زدہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عورت کے لئے کوئی مشکل پیدا کرے یا اس کے اوپر کوئی ظلم روا رکھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام ایسے تعلقات کے متعلق سوچ بھی سکے جن میں عورت پر ظلم ہوتا ہو جبکہ یہ اسلام ہی ہے جس نے عورت اور مرد کے تعلقات کو پختگی بخشی، ان کو باہمی محبت و رواداری سے کام لے کر ایک دوسرے کے لئے آرام و راحت کا ذریعہ بننے کی تلقین کی۔ مرد اور عورت دونوں کو پاکی، پاک دامنی اور چشم و دامن کی حفاظت کا درس دیا۔ ہر مسلمان کو یہ حکم دیا کہ وہ نہ زنا کرے نہ کسی سے پوشیدہ تعلقات قائم کرے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو یہ حکم دیتا ہے کہ ہر میدان میں ان تمام امور کا خیال رکھا جائے

جن سے افراد کی عزت و آبرو اور انسانی اخلاق کی حفاظت ہوسکے۔ جب اسلام تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے تو یہ شرط بھی عائد کر دیتا ہے کہ مرد کوئی ظلم روا نہ رکھے اور اپنی سب بیویوں سے انصاف کا برتاؤ کرے۔ اگر اس کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ عدل قائم نہیں رکھ سکے گا تو پھر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ "اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو یا جو کنیز تمہاری ملک میں ہو۔"

(سورۂ نساء: آیت ۳)

وہ قانون جو ہر وقت برائی کو ختم کرنے پر زور دیتا ہو اس سے یہ بعید نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مرد کو ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دیدے کیونکہ بسا اوقات مرد کو یا تو اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے یا ایک سماجی مسئلے کے حل کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ سماجی مسئلہ یہ ہے کہ اکثر ملکوں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ یہ فرق خاص طور پر بڑی بڑی جنگوں کے زمانے میں زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔

اعداد و شمار کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ملکوں میں نہ صرف عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے بلکہ یہ تعداد مجموعی آبادی کی دو تہائی سے کم نہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ جنسی لحاظ سے عورت کو مرد کی ضرورت اگر زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی ضرور ہے کہ جتنی مرد کو عورت کی۔ ایسی صورت میں اگر تعدد ازواج کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو مجبوراً ان دو میں سے ایک طریقے کا انتخاب کرنا ہوگا:

یا تو عورت دنیا ترک کر کے گوشہ نشینی اور رہبانیت کی زندگی اختیار کرے یا پھر تسکین نہ پائے ہوئے جذبات سے بھرے ہوئے آزاد ماحول میں گھومتی پھرے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں صورتیں عورت کے مسئلے کو اور بھی پیچیدہ بنانے والی ہیں۔ لہٰذا ایک راستہ یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ہم اسلام کا قانون قبول کرلیں اور اس پر عمل

کریں تاکہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی تربیت اسلامی اخلاق کے سائے میں ہو اور وہ برائی اور بگاڑ سے محفوظ رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قانون کے نفاذ کے معنی ہیں معاشرے کی اخلاقی انحطاط سے حفاظت۔ عورت کی شخصیت کو پامالی سے بچانا اور اس کو شہوت پرستوں کے جال میں نہ پھنسنے دینا۔ دوسری طرف یہ قانون اس مرد کی مشکل کو بھی حل کر دیتا ہے جس کی ضرورت ایک بیوی سے پوری نہیں ہوسکتی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بسا اوقات عورت کو ایسی مجبوریاں پیش آتی ہیں کہ عورت اس قابل نہیں رہتی کہ وہ اپنے شوہر کی ضرورت پوری کر سکے۔ ساتھ ہی یہ قانون ان کروڑوں عورتوں کی عزت و ناموس کی بھی حفاظت کرتا ہے جن کی تعداد اکثر ملکوں میں مردوں سے زیادہ ہے۔

وہ عورتیں جن کے ساتھ نکاح جائز ہے

قرآن مجید نے ان عورتوں کا تعین کیا ہے جن کے ساتھ نکاح حرام یا حلال ہے: وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا ''ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں مگر ہاں جو کچھ ہو چکا (وہ ہو چکا) بے شک یہ بے حیائی اور قابل نفرت بات تھی اور برا طریقہ تھا۔'' (سورۂ نساء: آیت ۲۲)

اس آیت میں اس طرح کے نکاح پر اس لئے خاص طور پر زور دیا گیا ہے کیونکہ اسلام سے پہلے رواج تھا کہ باپ کی بیوہ بھی دوسرے مال و اسباب کی طرح بیٹوں کو میراث میں مل جاتی تھی۔ اس کے بعد قرآن مجید نے کچھ اور عورتوں کی اقسام کا ذکر کیا ہے جن کے ساتھ میاں بیوی کے تعلقات قائم نہیں کئے جاسکتے:
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم مِّنَ الرَّضَاعَةِ

وَاُمَّهَاتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ''تمہارے اوپر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں رہی ہیں بشرطیکہ وہ تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے لیکن اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو کوئی گناہ نہیں اور جو بیٹے تمہاری نسل سے ہوں ان کی بیویاں اور یہ بھی (حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو یکجا کرو مگر ہاں جو ہو چکا (وہ ہو چکا)۔'' (سورۂ نساء: آیت ۲۳)

ان عورتوں کے علاوہ جن کا ذکر اس آیت میں ہے باقی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ اگر طرفین میں نکاح اس طریقہ سے ہو جو اسلام نے تجویز کیا ہے تو ان میں میاں بیوی کا تعلق قائم ہو جائے گا۔

یہ آیت کہتی ہے کہ بہو اپنے سسر پر اس وقت حرام ہے جبکہ اس کا سابق شوہر اس سسر کا صلبی فرزند ہو۔ لیکن اگر صلبی بیٹا نہ ہو بلکہ متبنّٰی ہو تو اس کے طلاق دینے کے بعد اس کی بیوی منہ بولے باپ پر حرام نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں یہ مشہور تھا کہ اصلی بیٹے کی بیوی اور منہ بولے بیٹے کی بیوی دونوں حرام ہیں۔ اس آیت نے اس کی تصریح کر دی کہ فقط صلبی بیٹے کی بیوی باپ پر حرام ہے۔ اس طرح اسلام سے پہلے جو دستور عربوں میں رائج تھا وہ خود بخود منسوخ ہو گیا۔

قرآن میں ارشاد ہے: وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَآئَكُمْ اَبْنَآئَكُمْ ''اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے (حقیقی) بیٹے قرار نہیں دیا ہے۔'' (سورۂ احزاب: آیت ۴)

عطاء سے روایت ہے کہ یہ آیت اس کے بعد نازل ہوئی جب رسول اکرمؐ

نے زید بن حارثہؓ کی زوجہ سے نکاح کیا۔آپ زید بن حارثہؓ سے محبت کرتے تھے اور ان کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ مشرکین کہنے لگے کہ آپ نے اپنی بہو سے نکاح کرلیا۔ اس آیت نے ان کے بے بنیاد اتہام و افترا کے بطلان پر مہر ثبت کردی۔

دوسری طرف اسلام مسلمان مرد کے مشرک عورت اور مشرک عورت کے مسلمان مرد سے نکاح کو حرام قرار دیتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیت میں اس کی تصریح ہے: وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ''مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں کیونکہ مومن باندی بھی بہتر ہے مشرک عورت سے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو اور اپنی عورتوں کو بھی مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں کیونکہ مومن غلام بہتر ہے مشرک سے خواہ وہ تمہیں پسند ہو۔ وہ جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف بلا رہا ہے اپنے حکم سے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۲۱)

ان دونوں احکام کے بارے میں تو مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اکثر شیعہ علماء کی یہ رائے ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے بھی نکاح جائز نہیں۔ وہ دو آیتوں سے استدلال کرتے ہیں۔ اول تو یہی اوپر کی آیت ہے۔ یہ علماء کہتے ہیں کہ خدا و رسولؐ کا انکار شرک سے بھی بڑھ کر ہے۔ دوسری یہ آیت: وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ''کافر عورتوں سے تعلق نہ رکھو۔'' (سورۂ ممتحنہ: آیت ۱۰)

یہ رائے اس مفہوم کے منافی نہیں جو مندرجہ ذیل آیت سے مبادر ہوتا ہے:
اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ ''آج جائز کردی گئیں تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں۔ اور جن کو کتاب دی گئی ان کا کھانا

تمہارے لئے جائز ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے جائز ہے اور پاکدامن مومن عورتیں اور جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ان کی پاکدامن عورتیں (بھی تمہارے لئے جائز ہیں)۔" (سورۂ مائدہ: آیت ۵)

چونکہ شیعہ علماء کی اکثریت اہل کتاب سے نکاح کو جائز نہیں سمجھتی اس لئے یہ علماء کہتے ہیں کہ اس آیت میں اہل کتاب میں کی پاکدامن عورتوں سے مراد وہ عورتیں ہیں جو اہل کتاب میں سے ایمان لے آئی ہوں اور اس سے پہلی آیت میں جو مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کی ممانعت ہے وہ حکم اہل کتاب اور کفار کے دوسرے گروہوں سب کو عام ہے۔

جو لوگ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان نکاح کے تعلق کو جائز کہتے ہیں انہیں مجبوراً ان دو میں سے کوئی ایک بات ماننی پڑے گی:

یا تو پہلی آیت کے منسوخ ہونے یا اس کی تخصیص کا قائل ہونا پڑے گا کیونکہ مشرکین میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں رکھتے۔ یا یہ کہنا ہوگا کہ کفار میں سے مشرکین غیر اہل کتاب ہیں۔ کیونکہ بعض دوسری آیات میں مشرکین اور اہل کتاب کے درمیان "واوِ عطف" ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں معطوف اور معطوف علیہ ہونے کی بنا پر دو مختلف گروہ ہیں۔ جیسا کہ ان آیات میں ہے: لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ "جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر تھے وہ اپنے کفر سے ہرگز باز آنے والے نہ تھے۔" (سورۂ بینہ: آیت ۱)

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ "کافر لوگ خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین ذرا بھی پسند نہیں کرتے..." (سورۂ بقرہ: آیت ۱۰۵)

اس لحاظ سے اس حکم میں کہ مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو، اہل کتاب عورتیں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہوگا کیونکہ جس معاملے

میں کوئی حکم موجود نہ ہو وہاں اباحت اور جواز کا حکم ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سورۂ مائدہ میں پاکدامن اہل کتاب عورتوں کے حلال ہونے کا حکم موجود ہے لیکن جو لوگ اہل کتاب عورتوں سے نکاح کے جواز کے قائل ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ ''کافر عورتوں سے تعلق نہ رکھو'' والے حکم کو یا تو منسوخ قرار دیدیں یا یہ کہیں کہ اہل کتاب کی پاکدامن عورتوں والی آیت سے اس کی تخصیص ہوگئی۔ یعنی یہ حکم صرف مشرکہ عورتوں کے ساتھ خاص ہوگیا، ورنہ لفظ کافر اس آیت میں کہ ''کافر عورتوں سے تعلق نہ رکھو'' اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں کو شامل ہے۔

بعض بڑے اور مرجع تقلید شیعہ مجتہدین کے نزدیک اہل کتاب عورت سے نکاح دائمی تو نہیں ہوسکتا لیکن عقد موقت جائز ہے۔

جو شخص آزاد عورتوں سے نکاح نہ کرسکے اس کو قرآن مجید نے اجازت دی ہے کہ کسی کنیز سے نکاح کرے:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَّلَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ ''جس میں اس کی استطاعت نہ ہو کہ وہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرسکے تو وہ ان مسلمان کنیزوں میں سے کسی سے جو تمہارے مِلک میں ہیں نکاح کرلے۔ تمہارے ایمان کی پوری حالت اللہ ہی کو معلوم ہے۔ تم سب آپس میں برابر ہو۔ لہٰذا ان کنیزوں کے ساتھ ان کے مالکوں سے اجازت حاصل کرکے نکاح کرو اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کرو بشرطیکہ عفیفہ ہوں۔ علانیہ بدکاری یا در پردہ دوستی کرنے والی نہ ہوں۔'' (سورہ نساء: آیت ۲۵)

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کے لئے کنیز سے نکاح جائز نہیں، سوائے اس شخص کے جو مہر ادا کرنے اور بیوی کا خرچ اٹھانے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔

کنیز کے ساتھ ایمان کی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مومنہ کنیز سے مخصوص ہے۔ اگر یہ دونوں شرطیں پوری ہوجائیں تو کنیز کے ولی کی اجازت سے نکاح درست ہے۔ اس آیت کی جو عبارت اس کے بعد ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زنا کی صورت میں کنیز کو آزاد عورت سے نصف سزا دی جائے گی:

فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ''پھر اگر وہ بے حیائی کا کام (زنا) کریں تو ان پر اس سزا سے نصف سزا ہوگی جو آزاد عورتوں پر ہوتی ہے۔'' (سورۂ نساء: آیت ۲۵)

اسلام یہ نہیں چاہتا کہ مہر اتنا زیادہ ہو کہ نکاح تجارت کی صورت اختیار کرے۔ ہاں مرد پر واجب ہے کہ نکاح کے وقت عورت کا جتنا مہر طے پائے وہ اس کو لازماً ادا کرے: **وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذَالِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ** ''ان عورتوں کے سوا دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں کہ تم اپنا مال خرچ کر کے ان سے نکاح کرلو بشرطیکہ (نکاح سے) مقصود عفت قائم رکھنا ہو نہ کہ شہوت رانی۔'' (سورۂ نساء: آیت ۲۴)

اس سے اوپر کی آیت میں ان عورتوں کا بیان ہے جن کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کے علاوہ جن کا اس آیت میں ذکر ہے باقی عورتوں کو مہر دے کر ان سے نکاح جائز ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مقررہ مہر ادا نہ کیا جائے تو نکاح صحیح نہیں ہوگا جیسا کہ آیت کے آخر میں ہے:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِہٖ مِنْھُنَّ فَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ فَرِیْضَۃً...اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا

''پس جب تم ان عورتوں سے متمتع ہوتے رہے ہو تو ان کا وہ مہر ادا کرو جو تم نے باہمی رضامندی سے طے کیا ہے۔ یہ واجب ہے... بلاشبہ اللہ بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔'' (سورۂ نساء: آیت ۲۴)

شیعہ اس آیت کو متعہ کے جواز کی ایک دلیل شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

عقد موقت کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے البتہ اس کی ممانعت کردی تھی۔ اس آیت کی ابن عباس، سدی، ابن سعید اور تابعین کے ایک گروہ نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تمتع اور استمتاع کے معنی ہر چند فائدہ اٹھانے اور لطف اندوز ہونے کے آتے ہیں لیکن شریعت میں یہ الفاظ عقد معین کیلئے مخصوص ہیں۔ اس لئے اب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جب تم نے ان عورتوں سے ایک خاص مدت کیلئے عقد کرلیا ہے تو ان کی اجرت ان کو ادا کردو۔ اس معنی کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اجرت کی ادائیگی کا وجوب تمتع کے بعد قرار دیا گیا ہے حالانکہ عقد دائمی میں مہر عقد کے ساتھ واجب ہوجاتا ہے تمتع کی کوئی شرط نہیں۔ اُبی بن کعبؓ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ جیسے صحابہ سے مندرجہ ذیل آیت اس طرح مروی ہے:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ اِلٰى اَجَلٍ مُسَمًّى فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ اس روایت میں اِلٰى اَجَلٍ مُسَمًّى (معینہ مدت تک) کے الفاظ زائد ہیں جو ازدواج موقت ہی کی صورت میں درست ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ زائد الفاظ آیت کا مقصود بیان کرنے کے لئے ہوں گے، آیت کا جزو نہیں ہوسکتے۔ آیت بغیر کسی کمی بیشی کے اسی طرح ہے جس طرح قرآن مجید کے تمام نسخوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ زائد الفاظ یا تو ان صحابہ کے اپنے ہیں جو انہوں نے اس آیت کی تفسیر کے طور پر شامل کردیئے اور یا ممکن ہے کہ رسول اکرمؐ کو وحی ہوئے ہوں اور ان صحابہ نے براہ راست آپ کی زبان مبارک سے سنے ہوں۔ اس طرح یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام علیؑ نے جو قرآن جمع کیا تھا اس میں دوسرے قرآنوں کی نسبت زیادہ مضامین تھے، اگر یہ روایات صحیح ہیں تو ان کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کچھ آیات کی تفسیر بھی تھی۔ خود آیات میں زیادتی مراد نہیں ہوسکتی۔[1]

۱۔ اس موضوع پر مزید تفصیلات کے لئے سید محمد علی ایازی کی کتاب "مصحف امام علیؑ" مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان ملاحظہ کیجئے۔

اسلام میں طلاق کا نظام

جن آیات میں نکاح کے احکام بیان کئے گئے ہیں، مرد و عورت کے باہمی تعلق کو باقاعدہ بنایا گیا ہے اور معاشرے کی تعمیر اور انسانی فلاح و بہبود میں نکاح کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، ان آیات سے واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام میاں بیوی ہی کے تعلق کو زندگی کی بنیاد اور دنیا کی آبادکاری کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ نر و مادہ کا نظام کچھ انسان ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ یہ عالم حیوانات اور عالم نباتات کو بھی محیط ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے: وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ
''ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے تاکہ تم سمجھو۔'' (سورۂ ذاریات: آیت ۴۹)

اسلام نے تاکید کی ہے کہ خاندان کی تشکیل طرفین کی اپنی رضامندی اور اختیار سے ہو۔ طرفین میں سے ہر ایک کو حق ہے کہ وہ اپنے شریک زندگی کے بارے میں پوری تحقیق کرے اور پھر اگر اسے دیندار اور خوش اخلاق پائے تو اپنے لئے خوش قسمتی کا ذریعہ سمجھے۔ طرفین کے اس تعلق کی بنیاد ایک دوسرے کے بارے میں مکمل واقفیت اور آئندہ کے متعلق پورے اطمینان پر ہونی ضروری ہے۔ اس طرح سے جب ایک دفعہ شادی ہوجائے تو اس وقت اسلام میاں بیوی دونوں کو اس نئے رشتے کی حفاظت کی تلقین کرتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ وہ دونوں اسے دائمی بنانے اور مستقل طور پر قائم رکھنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ اسلام نے میاں بیوی دونوں کے حقوق اور فرائض اس طرح متعین کئے ہیں کہ ان کا رشتہ ناقابل شکست بن جائے۔ حدیث شریف میں مردوں سے کہا گیا ہے کہ: ''خَيْرُكُمْ عِنْدَ اللهِ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهِ''۔ اللہ کے نزدیک تم میں بہترین وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں کے لئے اچھا ہے۔

اسی طرح حدیث میں عورتوں کو بھی یاد دلایا گیا ہے کہ:
''اِنَّ رِضَا الزَّوْجَ مِنْ رِضَا اللّٰہِ'' شوہر کی خوشنودی اللہ کی خوشنودی ہے۔
اسلام دونوں کو مہربانی، حسن سلوک، ہمدردی اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے اور ایسی باتوں کا حکم دیتا ہے جس سے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت جاگزیں ہوجائے۔ یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے کہ:
اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا وَضَعَ اللُّقْمَۃَ فِیْ فَمِ زَوْجَتِہٖ کَانَ لَہٗ اَجْرُ ذٰلِکَ عِنْدَ اللّٰہِ
مرد اپنی بیوی کے منہ میں اگر لقمہ دیتا ہے تو اس کا بھی اللہ سے اجر پائے گا۔
میاں بیوی کے تعلقات کو مستحکم بنانے اور ان کی خوشگوار زندگی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود مشترک زندگی میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ بھی اسلام کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ عورت مرد دونوں کو اپنی اور خاندان کی حفاظت کے خیال سے ان دشواریوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہئے۔ رسول اکرمؐ نے مرد کو اس کی ترغیب دیتے ہوئے کہ بیوی کو عزیز رکھے اور اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کرے فرمایا ہے:
اَلْمَرْاَۃُ خُلِقَتْ مِنْ ضِلْعٍ اَعْوَجَ فَاِنْ ذَھَبْتَ تُقِیْمُہٗ کَسَرْتَہٗ عورت ٹیڑھی پسلی سے بنائی گئی ہے اگر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو تم اسے توڑ دوگے۔
قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَعَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ کَرِھْتُمُوْھُنَّ فَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا '' اپنی بیویوں کے ساتھ طریقے کا برتاؤ کرو خواہ وہ تمہیں ناپسند ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت بھلائی رکھ دی ہو۔'' (سورۂ نساء: آیت۱۹)
چونکہ اسلام عائلی زندگی کی پائیداری کی اہمیت کا قائل ہے اس لئے اس نے بطور علاج تادیب کا بھی طریقہ وضع کیا ہے کہ اگر عورت کھلم کھلا سرکشی اور نافرمانی پر اتر آئے تو مرد کو اجازت ہے کہ عورت کے تمام حقوق کا لحاظ رکھنے کے باوجود اس کے ساتھ سمجھ دار مربی کا سا برتاؤ کرے تاکہ اسے راہ راست پر واپس لا سکے۔

پند و نصیحت سے اگر کام نہ چلے تو شوہر کو یہ بھی اجازت ہے کہ بقدر ضرورت تنبیہ سے کام لے۔ اس کے بعد اگر عورت راہ راست پر آ جائے اور شوہر کی مطیع ہو جائے تو شوہر کو بھی اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہئے۔

قرآن مجید میں ہے: وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا "جنہیں جن عورتوں کی نافرمانی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ۔ ان کے بستر الگ کر دو اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر زیادتی نہ کرو۔" (سورۂ نساء: آیت ۳۴)

اس آیت میں اس عورت کا علاج تجویز کیا گیا ہے جو اپنے شوہر کی نافرمان ہو۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب مرد اپنی ذمہ داریاں نبھاتا ہو۔ تنبیہ کی جو تین صورتیں اس آیت میں تجویز کی گئی ہیں ان کا مقصد عورت کی اصلاح کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے اگر زبانی نصیحت سے کام چل جائے تو مرد کو بستر جدا کرنے کی اجازت نہیں۔ لیکن اگر سمجھانے بجھانے کا اس پر اثر نہ ہو تو مجبوراً دوسری صورت اختیار کرے۔ پھر بھی کام نہ چلے تو تیسری صورت پر عمل درآمد کرے یہاں تک کہ میاں بیوی کی زندگی مثل سابق آرام و سکون سے گزرنے لگے۔

قرآن مجید نے جس طرح عورت کے لئے مناسب تنبیہ تجویز کی ہے وہاں وہ راستہ بھی بتلا دیا ہے جو عورت کو اس صورت میں اختیار کرنا چاہئے جب مرد ضدی اور تند مزاج ہو یا بیوی سے محبت کا برتاؤ نہ کرتا ہو۔ ایسی حالت میں عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے کچھ حقوق کو نظر انداز کر کے مرد کی دلجوئی کرے اور محبت و مہربانی سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اس ضمن میں قرآن کی ہدایت یہ ہے:

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا "اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے زیادتی یا بے التفاتی کا اندیشہ ہو تو اس میں ان کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ دونوں آپس

میں کسی طرح صلح کرلیں۔ صلح (بہر حال) بہتر ہے۔ لالچ اور خود غرضی تو سب ہی کی فطرت میں ہے۔ اگر تم حسن سلوک اور تقویٰ اختیار کیے رہو تو بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔" (سورۂ نساء: آیت ۱۲۸)

اس آیت کی یہی تفسیر صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے منقول ہے لیکن اگر طرفین کی کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو اور ان کا باہمی اختلاف باقی رہے تو دونوں میں سے کسی کو اجازت نہیں کہ قرآن مجید کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے اور کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے جس سے سابقہ خوشگوار زندگی کی طرف لوٹنا ناممکن ہوجائے۔ بلکہ ایسی حالت میں یہ طرفین کے عزیز رشتے داروں کا فرض ہے کہ ان دونوں میں اختلافات دور کرنے کی کوشش کریں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا "اگر تمہیں میاں بیوی میں جدائی کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے بھیج دو۔ اگر میاں بیوی کو صلح صفائی منظور ہوگی تو اللہ ان میں موافقت پیدا کردے گا۔ اللہ بڑا جاننے والا اور باخبر ہے۔" (سورۂ نساء: آیت ۳۵)

یہ ضروری ہے کہ دونوں ثالث ایسے ہوں جن کی کوئی ذاتی غرض نہ ہو تاکہ وہ خلوص اور دیانتداری سے اپنا کام انجام دے سکیں اور میاں بیوی کو مل جل کر اتفاق سے رہنے پر آمادہ کرسکیں۔ اس آیت کی تفسیر میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ مرد کے خاندان سے کوئی موزوں شخص اور اسی طرح عورت کے خاندان سے بھی کوئی مناسب شخص منتخب کیا جائے تاکہ وہ یہ دیکھیں کہ غلطی کس کی ہے۔ اگر مرد کی غلطی ہو تو عورت کو اس سے جدا کردیں اور مرد کو اس کا نان نفقہ ادا کرنے پر مجبور کریں اور اگر غلطی عورت کی ہو تو اسے شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کریں اور اس کا نان نفقہ بند کردیں۔ ان دو ثالثوں کو طلاق نافذ کرنے کا اختیار نہیں

ہے سوائے اس صورت کے کہ مرد اور عورت نے ان کو اپنا وکیل بنادیا ہو اور انہیں یہ اختیار دیا ہو کہ مصالحت کی کوشش میں ناکامی پر وہ طلاق نافذ کر دیں۔

اس طرح قرآنی آیات نے زن و شوہر کی مشکلات کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کی زندگی اجیرن نہ بننے پائے۔ اگر اصلاح کی سب کوششیں ناکام ہوجائیں اور ان کا مل جل کر رہنا سوائے مستقل عذاب کے اور کچھ نہ رہ جائے تو اسلام نے آخری حل طلاق تجویز کیا ہے کیونکہ اس مرحلے پر اور کسی بات کا کوئی فائدہ نہیں۔ چونکہ طلاق ابغض المباحات یعنی جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ ہے اس لئے صرف آخری چارۂ کار کے طور پر ہی اس کی اجازت ہے۔

قرآن کہتا ہے: فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ "یا تو رکھنا ہے صحیح قاعدے کے مطابق یا پھر چھوڑ دینا ہے خوش اسلوبی سے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۲۹)

وَاِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا "اگر دونوں جدا ہی ہوجائیں تو اللہ اپنی بے پایاں رحمت سے ان میں سے ہر ایک کو بے نیاز کردے گا۔ اللہ بڑا وسعت والا، حکمت والا ہے۔" (سورۂ نساء: آیت ۱۳۰)

اسلام نے اس منحوس وقت میں جب جدائی کے سوا کوئی اور راستہ باقی نہ رہے طلاق کی تجویز پیش کی ہے تاکہ اس طریقے سے ان تمام خطرات سے نجات مل سکے جو خاندان کی زندگی کو ایسی حالت میں درپیش ہوتے ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی میاں بیوی اکٹھے رہیں تو وہ انسانیت کے اس اعلیٰ معیار سے گرجائیں گے جس کی نشان دہی اس آیت کریمہ میں کی گئی ہے: وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّرَحۡمَۃً "اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت و الفت پیدا کردی۔" (سورۂ روم: آیت ۲۱)

اگرچہ طلاق کا قانون انسانی معاشرے کی ضروریات میں سے ہے لیکن نوبت یہاں تک آجانے کے بعد بھی اسلام نے دونوں طرف واپسی کا راستہ کھلا رکھا ہے۔

اسی لئے طلاق ہر حالت میں جائز نہیں ہے۔ طلاق کی کچھ ایسی شرائط مقرر کی گئی ہیں کہ بسااوقات ان کا پورا ہونا دشوار ہوتا ہے۔ جب عورت ایام سے ہو اس وقت طلاق درست نہیں۔ پاک ہونے کے بعد بھی یہ شرط ہے کہ مرد نے اس سے صحبت نہ کی ہو۔ اس کے علاوہ دو عادل مسلمان مردوں کی موجودگی کے بغیر طلاق نہیں دی جاسکتی۔ اکثر موقعوں پر مرد کے لئے ان تینوں شرطوں کا آسانی سے پورا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے مجبوراً طلاق کو ملتوی کرنا پڑتا ہے اور اکثر اسی تاخیر کی وجہ سے مرد اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے اور میاں بیوی میں پھر خلوص بحال ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر طلاق ہو ہی جائے اور دو عادل مسلمانوں کی اس پر گواہی بھی ہوجائے جب بھی عورت تین مہینے گزرنے سے پہلے اپنے اسی شوہر کے سوا کسی اور مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔ اس مدت کے دوران میں یہ ضروری ہے کہ عورت سابقہ مکان ہی میں رہے اور مرد اس کی تمام ضروریات کا کفیل ہو۔ ان تین مہینوں میں مرد اپنی بیوی سے رجوع کرسکتا ہے لیکن تین مہینے پورے ہوجانے کے بعد صرف دوبارہ نکاح ہی ہوسکتا ہے۔

سورۂ طلاق میں اس بارے میں بعض احکام کا تذکرہ ہے: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَالِكَ أَمْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ ''اے نبیؐ! (کہہ دیجئے کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے وقت (یعنی پاک ہونے پر اور صحبت کئے بغیر) طلاق دو اور عدت کی مدت کا شمار کرو۔ اور خدا سے جو تمہارا رب ہے ڈرتے رہو۔ ان عورتوں کو (عدت کے دوران میں) ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، سوائے اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو کوئی حدود الٰہی سے تجاوز کرے گا اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ تمہیں معلوم نہیں

شاید اس کے بعد اللہ کوئی نئی بات پیدا کردے۔ پھر جب وہ عدت پوری کرلیں تو یا تو قاعدے کے مطابق انہیں نکاح میں رہنے دو یا انہیں قاعدے کے مطابق جدا کردو اور اپنے میں سے دو عادل مسلمان مردوں کو (طلاق پر) گواہ بنالو۔" (آیت ۱و۲)

قرآن مجید نے مطلقہ عورت کے احکام مختلف آیات میں بیان کئے ہیں:
وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِيٓ أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ "طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں اور اگر وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لئے جائز نہیں کہ خدا نے جو کچھ ان کے شکم میں پیدا کیا اس کو چھپائیں۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۲۸)

اس آیت میں اس مدت کا بیان ہے جس کے دوران عورت کو عدت گزارنی ہے۔ مطلقہ عورت کے لئے سابقہ شوہر کے سوا کسی اور سے اس وقت تک نکاح جائز نہیں جب تک تین قروء نہ گزر جائیں۔ یہ لفظ حیض اور پاکی دونوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم اس کے جو معنی بھی لیں اس مدت کے دوران میں عورت عدت میں رہتی ہے اور سابقہ شوہر کی گویا بیوی ہی رہتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسی مکان میں رہے جس میں طلاق سے پہلے رہتی تھی۔ اگر اس مدت کے دوران میں مرد رجوع کرنا چاہے تو عورت انکار نہیں کرسکتی۔ اس مدت میں مرد کو بیوی کا نفقہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ آیت یہ بھی کہتی ہے کہ عورتیں اپنے رحم کے اندر جو کچھ رکھتی ہیں (یعنی حمل) اس کو نہ چھپائیں۔ مگر اس کے یہ بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ مرد کو رجوع سے روکنے کے لئے اپنی ناپاکی کی حالت کو نہ چھپائیں۔ بہرحال جب تک عورت حاملہ ہے وہ عدت میں رہتی ہے۔ اور طلاق کے بعد تیسرا حیض آنے تک مرد کو رجوع کا اختیار ہے۔ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل تک ہے۔ اس کی تصریح مندرجہ ذیل آیت میں ہے: وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ "اور حمل والیوں کی عدت ان کے وضع حمل تک ہے۔" (سورۂ طلاق: آیت ۴)

جب تک وضع حمل نہ ہو مرد پر عورت کا نفقہ واجب ہے۔ اگر عورت کے دودھ ہو تو وہ بچے کو دودھ پلانے کا شوہر سے معاوضہ طلب کرسکتی ہے۔ کیونکہ باپ کی موجودگی میں بچے کا خرچہ عورت پر نہیں ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى "اگر وہ حمل والیاں ہوں تو ان کو خرچ دیتے رہو بچہ جننے تک۔ پھر اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو۔ اور باہم مناسب طور پر معاملہ طے کرلو۔ اگر تمہارے لئے ایسا کرنا دشوار ہو تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے۔"

(سورۂ طلاق: آیت ۶)

اسلام نے مرد کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ مطلقہ عورت کے ساتھ نیکی اور احسان کا برتاؤ کرے اور حسن سلوک سے پیش آئے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ "ان عورتوں کو وہیں رہنے کی جگہ دو جہاں اپنی حیثیت کے مطابق تم خود رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لئے تکلیف مت پہنچاؤ۔" (سورۂ طلاق: آیت ۶)

اگر زوجین میں مقاربت سے پہلے ہی جدائی ہوجائے تو عورت طلاق کے فوراً بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہے۔ یہ نکتہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا "جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو ہاتھ لگانے سے قبل ہی طلاق دیدو تو تمہاری ان پر کوئی عدت واجب نہیں جس کو شمار کرو۔" (سورۂ احزاب: آیت ۴۹)

جب کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق دے تو ضروری ہے کہ جتنا بھی مہر ہو ادا کردے۔ مرد کو اس میں کمی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اگر مرد طلاق دینے کیلئے تیار نہ ہو تو عورت کو چاہئے کہ مہر لئے بغیر اس سے الگ ہوجائے تا کہ یہ صورت نہ ہو کہ

کوئی عورت صرف مرد کا مال لینے اور اس کی دولت سے فائدہ اٹھانے کیلئے ہی نکاح کو ذریعہ بنالے۔ لیکن اگر مرد عورت پر ظلم کرے اور عورت کو مشترک زندگی گزارنے کی پوری کوشش کے باوجود کامیابی نہ ہو اور اسے مجبوراً ظلم سے نجات پانے کیلئے طلاق مانگنی پڑے تو اس صورت میں مرد کو حق نہیں کہ مہر میں سے کچھ بھی واپس لے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّآتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ”اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم اس بیوی کو مال کا انبار دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی واپس مت لو۔ کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کر کے اسے واپس لو گے؟ اور تم کیسے اسے واپس لے سکتے ہو جب تم ایک دوسرے سے خلوت کر چکے ہو اور وہ عورتیں تم سے ایک مضبوط اقرار لے چکی ہیں۔“ (سورۂ نساء: آیت ۲۰ و ۲۱)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا آتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ”تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ تم ان عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو۔ ہاں اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ حدود الٰہی کی رعایت نہ کرسکو گے تو دونوں پر اس کے بارے میں کوئی گناہ نہ ہوگا جو عورت معاوضہ میں دیدے۔“ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۲۹)

اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے کہ جب کوئی عورت مرد سے ناراض ہو کر سرکشی اختیار کرلے اور مرد کو اندیشہ ہو کہ اگر اس نے عورت کی طلاق کے بارے میں مانگ پوری نہ کی تو وہ غلط رویہ اختیار کرلے گی۔ اس حالت میں جائز ہے کہ مرد عورت کو چھوڑ دے اور عورت جو کچھ دے لے لے۔ یہ شرط البتہ ہے کہ مرد اپنی بدسلوکی سے عورت کو طلاق مانگنے پر مجبور نہ کرے۔

طلاق رجعی

طلاق کی نوبت چاہے کسی وجہ سے بھی آئی ہو، فریقین کو کچھ مہلت دی گئی ہے کہ اگر چاہیں تو دوبارہ تعلقات بحال کرلیں۔ یہ مہلت دو طلاقوں کی حد تک ہے۔ اگر تیسری بار بھی طلاق ہوگئی تو عورت اپنے سابق شوہر پر اس وقت تک حلال نہیں ہوسکتی جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرچکی ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ ''طلاق دو بار ہے۔ اس کے بعد یا تو قاعدے کے مطابق رکھ لینا ہے یا پھر خوش اسلوبی سے چھوڑ دینا ہے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت۲۲۹) فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ''پھر اگر شوہر عورت کو (دو طلاق) دیدے تو اس کے بعد عورت جب تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے اس (پہلے شوہر) پر حلال نہ ہوگی۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۰)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ طلاق جس میں مرد کو رجوع کا حق ہے صرف دو مرتبہ ہے۔ اگر دوسری طلاق کے بعد رجوع کرلیا اور تیسری مرتبہ پھر طلاق دیدی تو اب عدت کے دوران میں رجوع جائز نہیں۔ ہاں البتہ اگر عورت عدت پوری کرنے کے بعد کسی اور شخص سے نکاح کرلے اور یہ دوسرا شخص مقاربت کے بعد اسے طلاق دیدے تو پھر عورت عدت ختم ہونے کے بعد پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَآ اَنْ یَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ''اس کے بعد اگر وہ عورت کو طلاق دیدے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں، اگر وہ پھر مل جائیں بشرطیکہ دونوں کو گمان غالب ہو کہ وہ حدود الٰہی کا پاس کریں گے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت۲۳۰)

یعنی اگر انہیں یہ امید ہو کہ ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے ہیں تو پھر میل کرلیں ممکن ہے کہ یہ تلخ تجربہ انہیں آئندہ کے لئے راہ راست پر لے آئے۔ اور انہیں اپنے

فرائض پورے کرنے اور ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنے پر آمادہ کردے۔ اور شاید اپنی بیوی کو دوسرے کے پہلو میں دیکھ کر مرد کی اکڑفوں ختم ہوجائے، وہ آئندہ بیوی کے حقوق کا خیال رکھے اور اس پر سختی سے باز آجائے۔

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طلاق جس کے بعد رجوع ممکن نہیں تیسری طلاق ہے۔ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کرنے کی اجازت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دو طلاقیں اسی وقت شمار ہوں گی جب الگ الگ دی جائیں۔ اگر کوئی شخص ایک ہی دفعہ میں تین طلاقیں دیدے مثلاً یہ کہ مرد اپنی بیوی سے کہے کہ میں نے تجھے تین طلاقیں دیں تو یہ ایک سے زیادہ طلاق نہیں ہوئی کیونکہ طلاق تو بیوی کو دی جاتی ہے اور دوسری اور تیسری طلاق کے وقت وہ بیوی اسی وقت ہوسکتی ہے جب پہلے رجوع کرلیا جائے۔

تین طلاقیں

اکٹھی تین طلاقیں دینے کے مسئلے میں مسلمان علماء میں اختلاف ہے۔

شیعہ فقہاء کا ایک گروہ تو ایسی طلاق کو بالکل باطل اور بے معنی سمجھتا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ یہ قرآنی نص کے خلاف ہے۔

علماء کی ایک اور جماعت ایسی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرتی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق طلاق کا صیغہ جاری کرنے کے بعد اگر کوئی اضافی بات کہہ دی جائے تو طلاق کا اثر باطل نہیں ہوسکتا بلکہ اضافی بات کو یا تو پہلی بات کی تاکید سمجھا جائے گا یا لغو بات قرار دیا جائے گا۔

شیعہ علماء کی اکثریت اور بعض سنی علماء اسی رائے کے قائل ہیں۔

اس مضمون کی تائید میں ائمۂ اہلبیت علیہم السلام سے روایات بھی آئی ہیں۔ چنانچہ امام معصومؑ سے پوچھا گیا: اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طہر کی حالت میں ایک

ہی مجلس میں تین طلاقیں دیدیں تو آپ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ ایک طلاق شمار ہوگی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اس بارے میں فرمایا ہے کہ جب تک عورت عدت پوری نہ کرلے تین طلاقوں کا اعتبار نہیں اور وہ درست نہیں ہوں گی۔

البتہ علمائے اہل سنت سوائے متاخرین کے ایک گروہ کے اس کے قائل ہیں کہ اگر ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دی جائیں تو تین ہی طلاقیں ہوجائیں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ جب خود مرد نے اپنے اوپر تین طلاقیں لازم کرلیں تو عملاً بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگیا۔ مگر صورت یہ ہے کہ یہ بات قرآن مجید کی صریح نص کے خلاف ہے۔ کتاب اللہ میں تصریح ہے کہ وہ طلاق جس کے بعد مرد رجوع کرسکتا ہے دو بار ہے۔ اب یہ کہنا کہ "مرد نے جب ایک چیز اپنے اوپر لازم ٹھہرالی تو وہ مجبور ہے کہ اس کو عملاً بھی نافذ کرے" نص کے مقابلے میں اجتہاد ہے جو قطعاً باطل ہے۔

قسم کی وجہ سے جدائی

قرآن مجید نے اسلام سے پہلے کے بعض ایسے طریقوں کا ذکر کیا ہے جن سے میاں بیوی کے درمیان جدائی ہوجاتی تھی۔ ان میں سے بعض طریقوں کی اسلام نے بھی اپنے قانون میں توثیق کی ہے جس طرح جاہل عربوں کے بعض معاملات اور معاہدوں کو اسلام نے برقرار رکھا ہے اور ان کی تصدیق کی ہے۔

منجملہ اور صورتوں کے جن سے ایام جاہلیت میں میاں بیوی میں جدائی ہوجاتی تھی، ایک صورت یہ تھی کہ مرد قسم کھا لیتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔ اسلام نے بھی یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ اگر مرد خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھالے کہ وہ ہمیشہ کے لئے یا چار ماہ سے زائد مدت تک زناشوئی کا تعلق نہیں رکھے گا تو یہ قسم نافذ العمل ہوجائے گی۔ اب اس صورت میں اگر عورت نے صبر سے کام لیا تو خیر، ورنہ

اگر وہ حاکم شرع سے رجوع کرے تو حاکم قسم کی تاریخ سے چار ماہ کی مدت گزرنے پر طلاق کا حکم صادر کردے گا۔

اب اگر مرد طلاق کے بعد عورت سے دوبارہ نکاح کرلے تو قسم باطل ہوجائے گی اور اس پر عمل نہیں ہوگا۔ لیکن اگر طلاق رجعی ہو (جس میں مرد صیغہ نکاح پڑھے بغیر عدت کے دوران میں رجوع کرسکتا ہے) تو قسم کا حکم باقی رہے گا۔ اور قسم کی تاریخ سے چار مہینے گزرنے کے بعد عورت شوہر سے ہمبستری کا مطالبہ کرسکتی ہے اور اگر مرد اس کے مطالبے پر کان نہ دھرے تو وہ حاکم شرع سے رجوع کرسکتی ہے۔ طلاق سے پہلے وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ مرد البتہ چار مہینے کی مدت گزرنے سے پہلے یا اس کے بعد بیوی سے رجوع کرسکتا ہے لیکن قسم توڑنے کا اسے کفارہ دینا ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی سزا نہیں۔ برخلاف دوسری قسموں کے کہ اگر ان کی پابندی نہ کی جائے تو کفارے کے علاوہ گناہ بھی ہوتا ہے۔

اس بارے میں قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ''جو لوگ اپنی بیویوں سے ہمبستری نہ کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ پھر اگر یہ لوگ رجوع کرلیں تو اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ لیکن اگر طلاق ہی کا پختہ ارادہ کرلیں تو بے شک اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۲۶ و ۲۲۷)

اسلام سے پہلے ایک اور صورت جس میں میاں بیوی ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے پر حرام ہو جاتے تھے یہ تھی کہ مرد بیوی سے اس قسم کے الفاظ کہتا تھا کہ ''تو میرے لئے ایسی ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ۔''

اسلام نے بھی بیوی کو اس طرح حرام قرار دینے کا طریقہ برقرار رکھا ہے۔ طلاق کی صحت کے لئے جو شرائط ہیں یہاں بھی ان کا خیال رکھا گیا ہے۔ رجوع کرنے کے لئے ان میں سے کوئی ایک کام کرنا پڑتا ہے:

(۱) غلام آزاد کرنا (۲) روزے رکھنا (۳) مساکین کو کھانا کھلانا

مطلب یہ ہے کہ جب مرد یہ چاہے کہ وہ بیوی سے جنسی تعلق دوبارہ قائم کرلے تو وہ مندرجہ بالا طریقوں میں سے ایک طریقے سے کفارہ ادا کرے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے اور بیوی کو یوں ہی لٹکتا ہوا چھوڑ دے تو عورت کو اجازت ہے کہ یا تو صبر سے کام لے یا پھر حاکم شرع سے رجوع کرے۔

حاکم شرع مرد کو اختیار دے گا یا تو کفارہ ادا کر کے رجوع کرلے یا پھر طلاق دیدے۔ اگر وہ ان میں سے کسی بات پر آمادہ نہ ہو تو قاضی اسے تین مہینے کی مہلت دے گا کہ وہ اس عرصے میں یا تو طلاق دیدے یا رجوع کرلے۔ لیکن اگر یہ مدت ختم ہوجائے اور مرد پھر بھی اپنی ضد سے باز نہ آئے تو اسے قید کردیا جائے گا۔ اس دوران میں اگر مرد نے طلاق بائن دیدی یعنی وہ طلاق جس کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا تو عورت عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح کرسکتی ہے اور ظہار کا قصہ ختم ہوجاتا ہے۔ (اس معاملے کو جس کی صورت اوپر بیان کی گئی ہے اصطلاحاً ظہار کہتے ہیں)۔

لیکن اگر مرد نے رجعی طلاق دینے کا فیصلہ کیا اور بیوی سے رجوع کرلیا تو وہ عدت کے دوران میں کفارہ ادا کئے بغیر اس سے مقاربت نہیں کرسکتا۔

مندرجہ ذیل آیات میں اس مسئلے سے متعلق بعض احکام کا بیان ہے:

"جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں (یعنی یہ کہتے ہیں کہ تو میرے لئے میری ماں کی پیٹھ ہے) تو وہ بیویاں کچھ ان کی مائیں نہیں ہوجاتیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ یقیناً ایک لغو بات اور جھوٹ کہتے ہیں۔ بے شک اللہ بڑا معاف کردینے والا اور بڑا بخشنے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر اپنی کہی ہوئی بات کی تلافی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ذمے اس سے قبل کہ باہم اختلاط کریں ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ یہ تمہیں نصیحت کی جاتی ہے

اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ پھر جس کو یہ میسر نہ ہو تو اس کے ذمے دو مہینے کے لگاتار روزے ہیں اس سے قبل کہ میاں بیوی باہم اختلاط کریں جس سے یہ بھی نہ ہو سکے اس کے ذمے کھانا کھلانا ہے ساٹھ مسکینوں کو۔ یہ احکام اس لئے ہیں کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔ اور یہ حدود الٰہی ہیں اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔" (سورۂ مجادلہ: آیت۲ تا۴)

عورتوں کی عدت

جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے اس کے لئے اسلام نے چار مہینے اور دس دن کی عدت مقرر کی ہے۔ اس مدت کے دوران میں وہ کسی اور مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا "تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو یہ بیویاں چار مہینے اور دس دن تک اپنے آپ کو انتظار میں روکے رکھیں۔" (سورۂ بقرہ: آیت۲۳۴)

اس آیت کے نزول سے قبل عورت کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک سال تک گھر میں رہے۔ یہ اس پر شوہر کا حق سمجھا جاتا تھا۔ مرد کے لئے بھی ضروری تھا کہ اس مدت میں بیوی کے اخراجات کے لئے اپنی دولت کے کچھ حصے کی وصیت کر جائے۔ اس بارے میں کتاب الٰہی کا حکم یہ ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ "تم میں سے جو لوگ فوت ہوں اور بیویاں چھوڑ جائیں ان پر وصیت ہے بیویوں کے حق میں اتنے مال کی کہ کافی ہو سال بھر کی ضرورت کو اور یہ کہ وہ (گھر سے) نکالی نہ جائیں۔ لیکن اگر وہ خود نکل جائیں تو کوئی

گناہ تم پر نہیں ان کاموں کے بارے میں جو وہ خود اپنے متعلق کریں شرافت کے ساتھ اور قاعدے کے مطابق (جیسے نکاح وغیرہ)۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۴۰)

ظاہر آیت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ عورت کو شوہر کے مال میں سے صرف اتنا حصہ دیا جائے گا جو اس کے ایک سال کے خرچ کے لئے کافی ہو۔ لیکن یہ حکم اس میراث کی آیت سے منسوخ ہوگیا جس کے مطابق بیوی کا حصہ شوہر کے مال میں سے اولاد ہونے کی صورت میں ۱/۸ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ۱/۴ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان دو آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ پہلی آیت عدت کی مدت کے بارے میں ہے اور دوسری آیت میراث میں بیوی کے حصے سے متعلق۔

فقہ جعفری کی رو سے بیوہ کی عدت میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عورت حاملہ ہے یا آزاد ہے یا کنیز ہے۔ سب کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ لیکن اہل سنت کے نزدیک کنیز کی عدت دو مہینے پانچ دن اور حاملہ عورت کی عدت اس وقت تک ہے جب تک وضع حمل ہو۔

ظاہر آیت سے فقہائے شیعہ کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔

بچے کو دودھ پلانا

قرآن مجید نے بچوں کی پرورش اور شیرخوار بچوں کو دودھ پلانے سے متعلق مسائل کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ شیرخوار بچے کا خرچ باپ کے ذمے ہے:

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَالِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا

اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ" مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں پورے دو سال۔ یہ مدت اس کے لئے ہے جو پوری مدت دودھ پلانا چاہے۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا ہے دستور کے مطابق۔ کسی شخص پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ نہ کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی جائے گی، نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی جائے گی۔ اور (باپ کی عدم موجودگی میں) وارث پر بھی اسی طرح کی ذمہ داری ہے۔ اگر میاں بیوی باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑا دینا چاہیں تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو دودھ پلوانا چاہو جب بھی کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ (دودھ پلانے والیوں کو) دو جو دینا ہے دستور کے مطابق۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۳)

اس آیت میں شیرخوارگی کے دوران بچے کے حقوق کا بیان ہے اور اس کی تصریح ہے کہ دودھ پلانے والی کی اجرت باپ کے ذمے ہے۔

اسی طرح اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پورے دو سال تک دودھ پلانا واجب نہیں ہے۔ یہ تو رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت ہے۔ ماں کو بچے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے، اگر ماں بچے کو دودھ پلانے پر آمادہ ہے تو باپ بچے کو ماں سے الگ نہیں کرسکتا البتہ ماں کی اجازت اور خوشی سے باپ کوئی اور دودھ پلانے والی مقرر کرسکتا ہے بشرطیکہ بچے کو دوسری عورت کے سپرد کرنے میں ماں کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اسلام میں حجاب کا حکم

اسلام کے پاکیزہ قانون کے مطابق عورت پر پردہ واجب ہے۔ قرآن مجید میں یہ حکم واضح طور پر اور قطعیت کے ساتھ موجود ہے۔ اس ضمن میں جو آیات ہیں ان میں کہیں تو مسلمان خواتین کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہیں رسول اکرمؐ کی ازواج کو۔ اسلام کے اس حکم کا منشا یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ عورت عفت و شرافت کی زندگی بسر کرے اور ہوس رانوں کی ناپاک نگاہوں سے محفوظ رہے۔ اس حکم کی وجہ سے عورت غیر مردوں کو دعوت نظارہ دے کر اور نامحرموں میں شمع محفل بن کر اپنے اعلیٰ مقام کو ٹھیس پہنچانے نہیں پاتی۔ نہ وہ ہوا پرستوں کے جال میں پھنس پاتی ہے، نہ اس پر زبان طعن دراز کرنے والوں اور تہمت لگانے والوں کی انگلیاں اٹھنے پاتی ہیں۔ وہ باآسانی عزت و شرافت کی زندگی گزار سکتی ہے۔

اسلام عورت کی عفت و شرافت کی قدر و قیمت کا اس حد تک قائل ہے کہ اگر کوئی ایسی بات بھی کہے جس سے عورت کے ناموس پر حرف آتا ہو تو وہ الزام لگانے والے کو بخشتا نہیں بلکہ اسے مجرم قرار دے کر قرار واقعی سزا دیتا ہے۔

جو بدفطرت اور کمینہ شخص پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے میں باک محسوس نہ کرے اس کو قرآن مجید کی زبان میں دنیا و آخرت میں لعنتی کہا گیا ہے۔ ایسے شخص کی گواہی معتبر نہیں ہوگی اور حاکم شرع اس کو اسی کوڑوں کی سزا دے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

ثَمَانِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَھُمْ شَھَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذَالِکَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ''جو لوگ تہمت لگائیں پاکدامن عورتوں پر اور پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو انہیں اسّی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ یہی فاسق ہیں۔ البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کر کے اپنی اصلاح کرلیں تو اللہ بڑا مغفرت کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔'' (سورۂ نور: آیت ۴و۵)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ''بے شک جو لوگ تہمت دھرتے ہیں ایسی خواتین پر جو پاک دامن ہیں جن کو اس کی کچھ خبر نہیں، اور جو ایمان والیاں ہیں ان پر لعنت ہے دنیا و آخرت میں اور ان کے لئے بڑا سخت عذاب ہے۔'' (سورۂ نور: آیت ۲۳)

کچھ آیات جن میں ازواج رسولؐ کو مخاطب کر کے پردے کا حکم دیا گیا ہے۔ حسب ذیل ہیں: یَا نِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّةِ الْاُوْلٰی ''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کئے رہو۔ لہٰذا تم بات چیت میں ہرگز نزاکت اختیار نہ کرو کیونکہ اس سے ایسے شخص کو برا خیال آنے لگتا ہے جس کے دل میں خرابی ہے۔ اور قاعدے کے مطابق بات کیا کرو۔ اور اپنے گھروں میں سکون سے رہو اور قدیم جاہلیت کے طریقے پر اپنی نمائش نہ کرتی پھرو۔'' (سورۂ احزاب: آیت ۳۲و۳۳)

مومنین کا ان خواتین سے کیسا برتاؤ ہونا چاہئے اس کے متعلق ارشاد باری ہے: وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذَالِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ ''جب تم رسولؐ کی ازواج سے کوئی چیز مانگو تو ان سے پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ طریقہ تمہارے اور ان کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے۔'' (سورۂ احزاب: آیت ۵۳)

جس طرح اسلام عورت کو پاکدامنی کا حکم دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ اپنے

آپ کو ڈھکا چھپا رکھے اس طرح مرد کو بھی پارسائی کا حکم دیتا ہے اور غیر عورتوں کی طرف دیکھنے سے منع کرتا ہے: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذَالِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ آبَائِهِنَّ اَوْ آبَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَائِهِنَّ اَوْ اَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ "(اے رسولؐ) آپ مومنین سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ بے شک اللہ کو معلوم ہے کہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ اور آپ مومنات سے بھی کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ ہونے دیں، سوائے اس کے جو کھلا رہتا ہے، اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں، اور اپنا بناؤ سنگھار کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اپنے شوہر کے، اپنے باپ کے، اپنے سسر کے،..." (سورۂ نور: آیت ۳۰۔۳۱)

کوئی بھی اسلامی فرقہ غیر عورت کے بدن، اس کے بالوں اور اس کی زیب و زینت کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آج کل مغرب زدہ سوسائٹی میں جو کچھ ہوتا ہے یہ دین حنیف کی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔ اسلام ہرگز ان طور طریقوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ طے ہے کہ ایسی باتوں کی وجہ سوائے انسانی اقدار سے ناواقفیت اور اعلیٰ اسلامی تعلیمات سے دوری کے کچھ نہیں۔ اور اس طرح کی باتوں کا نتیجہ سوائے اخلاقی انحطاط اور تمدنی گراوٹ کے کچھ نہیں نکلتا۔

استعمار پسندوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر مسلمان خواتین کو اسلامی تعلیمات کی طرف رغبت پیدا ہوجائے تو ان کی طاقت اور اثر و رسوخ کو سخت خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق و مغرب کے لٹیرے اور ان کے ملکی ڈھنڈورچی جو روشن خیال کہلاتے ہیں اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہیں اور ان کی یہی کوشش ہے کہ مسلمانوں کی تربیت اس طور پر ہو کہ وہ اپنے قانون اور دین مبین سے دور ہوتے

چلے جائیں تا کہ ان استعمار پسندوں کو لوٹ کھسوٹ کا خوب موقع فراہم ہو سکے۔

یہ لوگ عورت کی آزادی کے لئے تو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں مگر یہ ذرا خیال نہیں کرتے کہ اسلام نے تو عورت کو پہلے ہی آزادی عطا کر رکھی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہے کہ اسلام نے اس آزادی کی کچھ ایسی حدود متعین کر دی ہیں جو عورت کی شرافت اور اس کی قدر و منزلت کی ضامن ہیں اور اسے اپنی بھاری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اہل بناتی ہیں۔ اور اسلام میں آزادی کا مفہوم بھی یہی ہے۔ البتہ اہل مغرب کی لغت میں جنہیں اسلام سے صاف پرخاش ہے، عورت کی آزادی کے معنی ہیں خود آرائی، فیشن پرستی، عیاش طبع مردوں کی ہوس کا شکار بننا وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال قرآن مجید نے عورت پر یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ اپنی عزت و ناموس کی پاسداری کرے اور کسی کو اس کی اجازت نہ دے کہ وہ اسے اپنی ناجائز حیوانی خواہشات پورا کرنے کا ذریعہ بنائے۔ عورت کو وہ روش اختیار کرنی چاہئے کہ نہ کوئی اس پر دست درازی کر سکے اور نہ حقیر و ذلیل سمجھ سکے۔ اسی مقصد کے پیش نظر عورت کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنا بدن اور اپنی آرائش و زیبائش نامحرموں کی نظر سے پوشیدہ رکھے اور انہیں اپنی طرف متوجہ ہونے نہ دے۔ مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں "کھلی زینت" یا ہمارے ترجمے کے مطابق "سنگھار جو کھلا رہتا ہے" اس سے شیعہ علماء کے نزدیک چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں مراد ہیں۔ بعض صحیح روایات سے بھی اس تشریح کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ امام باقر علیہ السلام سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "چہرہ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں مراد ہیں۔"

اس کی تائید قرآن مجید کے اس حکم سے بھی ہوتی ہے کہ "اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رکھا کریں۔" قرآن مجید میں خمار کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں وہ کپڑا جو سر پر اوڑھ کر اس کا ایک سرا پشت پر ڈال لیا جائے۔ اردو میں اوڑھنی اور دوپٹے کا بھی یہی مفہوم ہے۔

کچھ شیعہ فقہاء کے خیال میں آیت کے الفاظ کے عموم کی وجہ سے چہرے اور ہاتھوں کا بھی چھپانا واجب ہے۔ اور ''کھلی زینت'' سے مراد اوپر کا لباس ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے بدن کا وہ حصہ مراد لیا ہے جو تیز ہوا میں اکثر کھل جاتا ہے۔

بہرحال خلاصہ مطلب یہ ہے کہ پردہ اسلام میں واجب ہے۔ قرآن و سنت میں اس کی تصریح ہے اور سوائے چہرے اور ہاتھ کی ہتھیلیوں کے باقی تمام بدن کا ڈھکنا ضروری ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

اس موضوع پر تفصیلات کے لئے حضرت آیت اللہ مرتضیٰ مطہری کی کتاب ''فلسفہ حجاب'' مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان ملاحظہ کیجئے

اسلام میں وصیت کی تاکید

قرآن مجید میں اسلام کے تمام ارکان اور بنیادی مسائل کا تذکرہ ہے۔ اسلام کا کم ہی کوئی مسئلہ ایسا ہوگا جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو۔

جن امور کے بارے میں قرآن مجید میں حکم ہے اور سنت نبوی میں بھی ان کے بارے میں تاکید ہے، ان میں سے ایک وصیت ہے۔ اس مسئلے کی بڑی اہمیت ہے یہاں تک کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

''مَنْ مَّاتَ بِغَيْرِ وَصِيَّةٍ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً'' جو شخص بغیر وصیت کئے مرگیا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی۔

اس سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ''تمہارے اوپر واجب ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آپہنچے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑے تو والدین اور اقرباء کے حق میں وصیّت کردے۔ اہل تقویٰ پر یہ حق (اللہ کی طرف سے) مقرر کیا گیا ہے۔'' (سورۂ بقرہ آیت ۱۸۰)

اس آیت میں ان ترک خیراً (اگر کچھ مال چھوڑے) کے الفاظ ہیں۔ لیکن آیت میں اس کی تصریح نہیں کہ کتنا مال چھوڑنے پر وصیت واجب ہوتی ہے۔ اس لئے اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ لفظ خیر کم اور زیادہ سب مال کو شامل ہے اور بعض کا عقیدہ ہے کہ مال کی کم از کم مقدار جس پر وصیت ضروری ہے پانچ سو درہم ہے۔ اس ضمن میں امام علی علیہ السلام سے ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ اپنے غلام کے مرض الموت میں اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ اس کی کل ملکیت اتنی تھی جس کی مالیت چھ سو یا نو سو درہم بنتی تھی۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں وصیت کروں؟

آپ نے فرمایا: نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان ترک خیرًا. اور تمہارے پاس اتنا مال نہیں ہے جس پر خیر کا اطلاق ہوسکے۔

قرآن مجید کی آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وصیت والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے کرنے کا حکم ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا کوئی محل نہیں کہ لا وصیة لوارث. وارث کے لئے وصیت درست نہیں۔

اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید کی آیت کو اس حدیث سے منسوخ ماننا پڑے گا حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ ایک ایسی حدیث سے جس کا درجہ ظنی سے زیادہ نہیں ہوسکتا کتاب اللہ کا حکم جو نص قطعی ہے منسوخ نہیں ہوسکتا۔ اس سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہوسکتی ان کا استدلال بہت کمزور ہے اور اس سے وصیت کے حکم کے بارے میں کوئی خدشہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ بہرحال وصیت کی بنیاد قرآن مجید نے قائم کی ہے اور اس کی اہمیت پر سنت نبوی نے زور دیا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ وصیت کسی خاص گروہ سے مخصوص ہے۔

اسلام میں میراث کا بیان

میراث کے معاملے میں اسلام نے ایسا طریقہ اور نظام قائم کیا ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو مرنے والے کے کسی رشتہ دار کے ساتھ زیادتی نہیں ہوسکتی۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ "بعض رشتہ داروں کو دوسرے رشتہ داروں پر فوقیت ہے۔" (سورۂ احزاب: آیت۶)

خَیْرَا اِۨلْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ "اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لئے وصیت کرجاؤ معقول طریقے سے۔" (سورۂ بقرہ: آیت۱۸۰)

اسلام سے پہلے عربوں میں صرف بیٹے اور مرد ہی میراث کے مستحق سمجھے جاتے تھے اور اس خصوصیت کی وجہ یہ بیان کی جاتی تھی کہ مرد ہی جنگوں میں حصہ لیتے اور مہمان داری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میراث کے اصول کا تعلق ہے خدا کا آخری پیغام اس بارے میں بیٹوں اور بیٹیوں میں کسی فرق اور امتیاز کا قائل نہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْہُ اَوْ کَثُرَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا "مردوں کے لئے بھی اس چیز میں حصہ ہے جو والدین اور نزدیکی رشتہ دار چھوڑ جائیں اور عورتوں

کے لئے بھی اس چیز میں حصہ ہے جو والدین اور نزدیکی رشتہ دار چھوڑ جائیں یہ ترکہ کم ہو یا زیادہ، ایک مقررہ حصہ (ضرور) ہے۔" (سورۂ نساء: آیت ۷)

اسلام عورت اور مرد کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتا ہے اور ان کی فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے حقوق کا یکساں خیال رکھتا ہے۔ ماں باپ کے ترکے سے عورت کو محروم نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ اس کا حصہ مرد کے مقابلے میں نصف مقرر کیا گیا ہے لیکن یہ فرق عورت پر کچھ ظلم نہیں ہے کیونکہ جتنا حصہ بھی اسے ملے گا وہ اس کے پاس جمع ہی رہے گا جس طرح نکاح سے پہلے لڑکی کا خرچ باپ کے ذمے ہے۔ اسی طرح نکاح کے بعد بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ عورت کا اپنا کوئی خاص خرچ نہیں اور اس کی دولت اس کے پاس جمع ہی رہتی ہے۔

لیکن مرد کا معاملہ مختلف ہے۔ شادی کے بعد تو اسے روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہی ہے، اکثر اوقات شادی سے پہلے بھی اسے ماں باپ کی کفالت کرنی پڑتی ہے یا اپنا گھر آباد کرنے کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف عورت کو میراث یا مہر سے جو کچھ ملتا ہے وہ اس کے پاس باقی رہتا ہے کیونکہ اس پر گھر چلانے کی ذمے داری نہیں ہے۔ جب تک شوہر زندہ ہے گھر کا اور خاندان کا خرچ اس کے ذمے ہے۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ اسلام نے عورت کو درحقیقت مرد سے زیادہ مالی حقوق دیئے ہیں اور اس کیلئے آرام و آسائش کا زیادہ موقع فراہم کیا ہے۔ ارشاد باری ہے: يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (سورۂ نساء آیت ۱۱) " خدا تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو ارشاد فرماتا ایک لڑکا کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے اور اگر اولاد میت صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ تو کل ترکے میں ان کا دو تہائی ہے اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف ہے۔"

میراث کی تقسیم کی صورت یہ ہے کہ اگر صرف ایک بیٹی وارث ہو تو شیعہ فقہ کی رو سے ماں باپ کے پورے ترکے کی وہی وارث ہوگی۔ اہل سنت کے نزدیک ایسی صورت میں نصف بھائیوں یا چچاؤں کو ملے گا۔ اگر بیٹیوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے تو ترکہ ان کے درمیان برابر تقسیم ہوجائے گا۔ دوسرے اسلامی مذاہب کی رو سے ۱/۳ حصہ بھائیوں یا چچاؤں کا حق ہوگا۔

اولاد کے بعد قرآن مجید نے ماں باپ کا میراث میں حق مقرر کیا ہے:
وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ متوفی کے والدین میں سے ہر ایک کے لئے اس کے ترکے کا چھٹا حصہ ہے اگر اس کے کوئی اولاد ہو۔ اگر اس کے اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے لیکن اگر متوفی کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے۔
(سورۂ نساء: آیت ۱۱)

اسی طرح قرآن مجید نے میاں بیوی کا حصہ بھی ایک دوسرے کے ترکے میں مقرر کیا ہے: وَلَكُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَكَ اَزۡوَاجُكُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنۡ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّكُمۡ وَلَدٌ فَاِنۡ كَانَ لَكُمۡ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ "تمہارے لئے اس مال کا آدھا حصہ ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو۔ لیکن اگر ان کے اولاد ہو تو تمہارے لئے ان کے ترکے کا ایک چوتھائی ہے، وصیت نکالنے کے بعد جو انہوں نے کی ہو یا قرض ادا کرنے کے بعد۔ اور بیویوں کے لئے تمہارے ترکے کا ایک چوتھائی ہے اگر تمہارے کوئی اولاد نہ ہو، اگر اولاد ہو تو پھر ان کے لئے تمہارے ترکے کا آٹھواں حصہ ہے۔ وصیت نکالنے کے بعد جو

وصیت تم کر جاؤ یا قرض ادا کرنے کے بعد۔" (سورۂ نساء: آیت۱۲)

واضح رہے کہ ان صورتوں میں باقی مال کے وارث متوفی کے دوسرے رشتہ دار ہوں گے جیسے ماں، باپ، بھائی اور بہن وغیرہ۔

کلالہ مرنے والے کے وہ رشتہ دار ہیں جن سے اس کا رشتہ ماں کی طرف سے ہو جیسے ماں شریک بھائی بہن۔ اگر ایک ہی بھائی یا بہن ہو تو اس کا چھٹا حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ اگر ان کی تعداد ایک سے زیادہ ہو تو ترکے کا ایک تہائی ان میں برابر برابر تقسیم کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ "اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے وارث اس کے کلالہ ہوں یا کوئی عورت مرجائے اور اس کا وارث اس کا ایک بھائی یا اس کی ایک بہن ہو تو ایک کا حصہ ۱/۶ ہوگا اور اگر وہ زیادہ ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔" (سورۂ نساء: آیت۱۲)

بھائی کی میراث کے متعلق یہ ہے کہ اگر وارث صرف ایک بہن ہو تو اس کا حصہ ترکے کا نصف ہوگا اور اگر بہنوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہو تو ہر ایک کو ایک تہائی ملے گا۔ اگر پسماندگان میں مرد اور عورت دونوں ہوں تو مرد کا حصہ عورت کے حصے سے دُگنا ہوگا۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ "لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے ایک بہن ہو تو اسے ترکے کا نصف ملے گا۔ اور بھائی بھی بہن کا

وارث ہوگا اگر اس کے والاد نہ ہو۔ اگر میت کے دو بہنیں ہوں تو ان دونوں کو ترکے کا دو تہائی ملے گا۔ اگر وارث کئی بھائی بہن ہوں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔" (سورۂ نساء: آیت ۱۷۶)

ان آیات میں اور اس موضوع سے متعلق دوسری آیات میں میراث کے موٹے موٹے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ جزئیات کی تفصیل اور وارثوں کے تمام مدارج کا بیان نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ یہ اصولی حکم البتہ ان آیات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ میراث کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ وارث کا متوفی سے کس قدر قریبی رشتہ ہے۔ قرآن مجید نے چونکہ اولاد اور بھائیوں وغیرہ کا حصہ مقرر کر دیا ہے، ہم اس اصول سے متعدد فروع کا استخراج کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سنت یعنی احادیث نبوی اور اقوال ائمہ معصومین علیہم السلام میں میراث سے متعلق دوسرے بہت سے احکام اور وارثوں کے حصوں کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

امام زہری کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے، نہ مسلمان کافر کا۔ حضرت معاویہ نے اپنے زمانہ حکومت میں مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اس بدعت کو موقوف کیا مگر ہشام بن عبدالملک نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر بحال کر دیا۔ (دیکھیے: خلافت وملوکیت مولفہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ص ۱۷۲-۱۷۳)۔

حضرت عمر بن خطابؓ کے عہد خلافت میں اگر کوئی بچہ مولدہ یعنی غیر عرب عورت سے سرزمین عرب کے علاوہ کہیں اور پیدا ہوتا تو وہ میراث سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ (دیکھیے: شواہد تحریف مطبوعہ مجمع علمی اسلامی مولفہ علامہ مرتضیٰ عسکری نقل از موطا امام مالکؒ)۔

اسلام میں لین دین کے احکام

کچھ قرآنی آیات میں ان معاہدوں اور باہمی فیصلوں کا ذکر ہے جو انسانی معاملات کے ضمن میں طے پاتے ہیں۔ خواہ یہ معاملہ خرید وفروخت کا ہو یا کچھ اور۔ چونکہ نقد وجنس کے لین دین سے اکثر لوگوں کو واسطہ پڑتا رہتا ہے اس لئے اس کے احکام اور حلال مال جو بصورت بیع وشرا یا اور ہبہ وغیرہ کے ذریعے سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جائے اس سے متعلق احکام ان مباحث میں سے ہیں جن کے اصول کلام اللہ میں بیان کئے گئے ہیں: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ''اے ایمان والو! (خدا اور بندوں سے کئے ہوئے) عہدوں کو پورا کرو۔'' (سورۂ مائدہ: آیت۱)

تجارت کے جائز اور قانونی ہونے سے متعلق قرآن نے ایک عام قاعدہ بیان کیا ہے جو یہ ہے کہ جائز تجارت وہ ہے جو فریقین معاملہ کی باہمی رضامندی سے ہو: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ''اے ایمان والو! ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ۔ ہاں! اگر کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔''

(سورۂ نساء: آیت۲۹)

ساتھ ہی اسلام نے لین دین کے ان تمام طریقوں کو جو عام طور پر رائج ہیں جائز اور مباح قرار دیا ہے سوائے ان معاملات کے جن میں سود شامل ہو۔ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کا خیال تھا کہ سود بھی خرید و فروخت کی طرح ایک کاروبار ہے۔ قرآنی آیات میں سود کا حکم بار بار بیان کیا گیا ہے۔ سود خوری کی مذمت کی گئی ہے۔ سود خوروں کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے اور ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اس ناجائز کاروبار سے دور رہیں اور غلط طریقے سے روپیہ کمانے کی کوشش نہ کریں۔

سود سے متعلق متعدد آیات میں سے ایک یہ ہے: اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰانُ مِنَ الْمَسِّ ذَالِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا "جو سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوسکتے بجز اس کے کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ خرید و فروخت بھی سود ہی جیسا کاروبار ہے۔ حالانکہ اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔"

(سورۂ بقرہ: آیت ۲۷۵)

قرآن مجید نے سود خوری کے بجائے بلاسودی قرضے کا طریقہ جسے قرض حسنہ کہا جاتا ہے مسلمانوں میں رائج کیا ہے۔ اور اس لئے کہ قرض خواہ اور قرض دار دونوں میں سے کسی کو نقصان نہ پہنچے اور ان میں اختلاف نہ پیدا ہو۔ اس کے کچھ ضابطے مقرر کردیے ہیں۔ اس بارے میں کتاب اللہ کا حکم یہ ہے:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْهُ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَکْتُبْ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْئًا فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْلَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِکُمْ فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ ''جب ادھار کا معاملہ کسی خاص مدت کے لئے کرنے لگو تو اس کو لکھ لو۔ اور یہ ضروری ہے کہ تمہارا لکھنے والا بالکل ٹھیک لکھے۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے کیونکہ لکھنا تو اسے اللہ ہی نے سکھایا ہے لہٰذا ضرور لکھے۔ اور لکھوائے وہ شخص جس پر حق واجب ہو۔ اور اسے چاہئے کہ اللہ سے ڈرتا رہے اور اس (قرض) میں سے کچھ کم نہ کرے۔ اگر مقروض کم عقل یا کمزور ہو یا اس قابل نہ ہو کہ خود لکھوا سکے تو اس کا سرپرست ٹھیک ٹھیک لکھوادے۔ اور اپنے میں سے دو مردوں کی گواہی ڈلوائے۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، جو بھی گواہ تمہیں پسند ہوں۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۸۲)

اسلام میں حدود اور سزائیں

قرآن مجید نے ان سزاؤں کی خبر دی ہے جو آخرت کی زندگی میں مجرموں کو بھگتنی ہوں گی۔ گناہگاروں کو طرح طرح کے سخت عذاب سے ڈرایا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے کو انتشار اور بگاڑ سے محفوظ رکھنے کے لئے بعض جرائم کی ضروری سزائیں اس دنیا کے لئے بھی مقرر کی ہیں۔

جن جرائم کی سزائیں خاص طور پر کتاب اللہ میں مقرر کی گئی ہیں ان میں قتل، پاکدامن عورتوں پر تہمت، چوری اور زمین میں فساد پھیلانا جیسے جرائم شامل ہیں۔ بعض دوسرے جرائم جن کی سزا کا قرآن مجید میں تعین نہیں کیا گیا ہے ان کے متعلق سزا کا فیصلہ حاکم شرع کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اسے اجازت دی گئی ہے کہ لوگوں کی اصلاح احوال کے لئے جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔

قصاص کے بارے میں اسلام سے پہلے عربوں میں ایک خاص طریقہ رائج تھا۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ مقتول کا قبیلہ مجرم کے خلاف کارروائی کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر ایک قبیلے کا آدمی کسی دوسرے قبیلے کے آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو خصوصاً اگر مقتول اشراف میں سے ہوتا تھا تو اس کے بدلے میں دسیوں اور بعض اوقات تو سیکڑوں آدمی تہ تیغ کر دیئے جاتے تھے اور مال و جان اور عزت و آبرو کا بے تحاشا نقصان ہوتا تھا۔

لیکن اسلام نے آ کر یہ حکم دیا کہ قصاص صرف مجرم سے لیا جائے گا کیونکہ اسلام کبھی کسی کے جرم کے بدلے میں بے گناہ کو سزا نہیں دیتا اور نہ گھوڑے گدھے سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتا ہے۔

اسلام کی مقرر کردہ فوجداری سزاؤں میں سے ایک قتل کی صورت میں قصاص ہے۔ مقتول کے وارثوں کو حق ہے کہ وہ قصاص کا مطالبہ کریں: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى

''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص واجب کردیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے میں آزاد، غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت...'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۷۸)

اہل نظر نے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ عرب میں دو قبیلوں کے درمیان کشت و خون ہوا۔ ان میں سے ایک قبیلہ طاقتور تھا اور دوسرا کمزور۔ طاقتور قبیلے نے قسم کھائی کہ وہ غلام کے بدلے میں آزاد کو، عورت کے بدلے میں مرد کو اور ایک مرد کے بدلے میں دو مردوں کو قتل کرکے رہے گا۔ اسی واقعے کے بعد اس قبیلے کے غرور اور انانیت کو لگام دینے کے لئے مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ ساتھ ہی اس آیت نے اس کی بھی توثیق کردی کہ مقتول کے ولی کو قصاص کے مطالبے کا حق ہے۔ لیکن قصاص کی حد بیان کردی گئی ہے۔ اس حد سے تجاوز ظلم ہے جس کو اسلام ہرگز روا نہیں رکھتا۔

اگر قتل عمداً نہ ہو غلطی سے ہوجائے جس کو ''قتل خطا'' کہا جاتا ہے، اس صورت میں قصاص نہیں بلکہ دیت واجب ہے۔ قتل عمد کی صورت میں بھی اگر مقتول کا ولی قصاص طلب نہ کرے بلکہ دیت قبول کرلے تو جائز ہے۔

دیت کا قانون عرب میں پہلے سے چلا آرہا تھا۔ اسلام نے اسی کو باقی رکھا ہے: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ

''اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کردے تو اس پر ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا واجب ہے۔ ساتھ ہی دیت بھی جو مقتول کے عزیزوں کے حوالے کی جائے گی۔ سوائے اس کے کہ وہ معاف کردیں۔ لیکن اگر مقتول ایسی قوم میں سے ہے جو تمہاری دشمن ہے اور وہ خود مومن ہے تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا واجب ہے...'' (سورۂ نساء: آیت ۹۲)

اس آیت کے آخری فقرے سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ اگر کوئی ایسا مسلمان غلطی سے قتل ہوجائے جس کا تعلق کسی کافر قبیلے سے ہو تو اس کی دیت اس کے کافر رشتہ داروں کو ادا نہیں کی جائے گی اور صرف ایک مسلمان غلام آزاد کیا جائے گا۔

اس آیت میں غلطی سے قتل کرنے سے مراد یہ ہے کہ قاتل کو یہ معلوم نہ ہو کہ مقتول مومن ہے اور وہ اسے ایسا مشرک سمجھ کر قتل کردے جس کا خون معاف ہے یا کسی اور غلطی کے سبب کوئی شخص کسی ایک یا چند آدمیوں کے ہاتھوں مارا جائے۔

بگاڑ پھیلانے والوں کی سزا سے متعلق اسلام میں جو احکام آئے ہیں ان میں ایک حکم زانی کی سزا ہے: اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ ''زناکار مرد اور زناکار عورت ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ کا حکم جاری کرنے کے معاملے میں رحم نہ آنے پائے۔'' (سورۂ نور: آیت ۲)

اسلام میں پردے کا بیان کرتے ہوئے ہم پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے والے کی سزا کا ذکر کرچکے ہیں۔ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ اسلام نے مجرموں کی صرف چند سزاؤں کا ذکر کیا ہے اور باقی کو سنت نبوی پر چھوڑ دیا ہے۔ (سنت نبوی میں بھی اگر کچھ رہ جائے تو اس کی تکمیل سنت ائمہ اطہار سے ہوتی ہے)۔ چنانچہ قرآن مجید نے خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرنے اور ان سے مذہبی احکام سیکھنے کی تاکید کی ہے: وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ''جو کچھ رسولؐ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس بات سے منع

کریں اس کو چھوڑ دو۔" (سورۂ حشر: آیت ۷)

ایک اور جگہ ارشاد باری ہے: وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى "وہ (ہمارے رسولؐ) کبھی اپنی خواہش نفسانی سے باتیں نہیں بناتے۔ ان کا کلام تمام تر وحی ہی ہے۔" (سورۂ نجم: آیت ۳و۴)

پس قرآن مجید کی آیت اور رسول اکرمؐ کی حدیث میں کوئی فرق نہیں دونوں ہی اللہ کی طرف سے ہیں اور وحی ربانی ہی کے دو پہلو (متلو اور غیر متلو) ہیں۔[1]

۱۔ رسول اکرمؐ فرماتے ہیں: اَلَا اِنِّیۡ اُوۡتِيۡتُ الۡكِتَابَ وَمِثۡلَهٗ مَعَهٗ "آگاہ رہو کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے اپنی کتاب اتاری اور اس کے ساتھ اس سے ملتے جلتے اور بہت سے حقائق بھی" آنحضرتؐ کے اس ارشادگرامی کی توضیح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ پر دو قسم کی وحی آتی تھی۔ ایک وہ جس میں الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے اور وہ قرآن مجید ہے۔ اس لحاظ سے تمام آسمانی کتابیں قرآن کے ساتھ شریک ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ فصاحت و بلاغت کی رو سے قرآن مجید معجزہ ہے لیکن سابق آسمانی کتابیں اعجاز کی اس کیفیت کی حامل نہیں۔ وحی کی دوسری قسم میں فقط معانی خداوند لم یزل و لا یزال کی طرف سے ہوتے تھے اور الفاظ سرکار رسالتمآبؐ کے ہوتے تھے۔ وحی کی اس قسم میں مفہوم اور معانی مرموز طریقے سے آنحضرتؐ پر نازل ہوتے تھے اور پھر آپ کے الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے تھے جنہیں حدیث یا روایت کہا جاتا ہے۔ (دیکھئے: احیائے دین میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار جلد اول صفحہ ۹۱)۔

پس حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيَامَةِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيَامَةِ کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا بتایا ہوا (نہ کہ بنایا ہوا) حلال قیامت تک حلال اور ان کا بتایا ہوا حرام قیامت تک حرام ہے۔ منصب ابلاغ پر فائز اور وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى کے سند یافتہ رسولؐ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ ارشاد باری ہے وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِيۡنَ اگر یہ پیغمبرؐ ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنا لاتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے (الحاقہ: ۴۴۔۴۶) آیۂ بَلِّغۡ (مائدہ: ۶۷) نازل ہونے سے پہلے حضرت علیؑ کو مولا بنانے کا حکم وحی غیر متلو کے ذریعے نازل ہو چکا تھا چنانچہ اللہ کے آخری رسولؐ نے غدیر خم میں ولایت علیؑ کا اعلان فرمایا۔

باب دوم

وفات رسولؐ کے بعد سیاسی حالات

یہاں تک ہم نے اسلامی احکام سے متعلق قرآنی آیات پر ایک نظر ڈالی ہے۔ اس موضوع کی تمام آیات کا استقصاء تو ہمارے بس کی بات نہیں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ بطور نمونہ مشتے از خروارے کچھ آیات پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ ہمارا جو اصل موضوع ہے کہ اسلامی احکام کی تاریخ بیان کی جائے اس کے لئے زمین ہموار ہو جائے اور ہم یہ معلوم کر سکیں کہ اس تاریخ میں شیعوں کا کتنا حصہ ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے کہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی احکام کی تشریع کا کام اپنے اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد مسلمان خود سے نئے احکام وضع نہیں کر سکتے تھے۔ خود رسول اکرمؐ کے زمانے میں انفرادی اجتہاد کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسلام کے دارالحکومت میں تو مسلمان براہ راست رسول اکرمؐ سے احکام سیکھتے تھے اور دوسرے علاقوں میں آنحضرتؐ احکام کی تعلیم کے لئے اپنے ممتاز صحابہ کرام کو بھیجتے رہتے تھے۔ لوگوں کے معاملات کا تصفیہ اور ان کے باہمی اختلافات کا حل ان ہی صحابہ کرام کے سپرد ہوتا تھا۔

اس دوران میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری توجہ اس پر مرکوز تھی کہ اپنی دعوت کی بنیاد کو مستحکم کریں اور وعظ و نصیحت کے ذریعے سے اسلامی قانون

لوگوں کے دلوں میں اُتار دیں۔ اپنے پیغام کی حقانیت پر پختہ یقین اور ایمان نے اس راستے کی سب مصیبتوں اور پریشانیوں کو آپ کے لئے آسان بنا دیا تھا۔ گو کہ آپ کی قوم نے آپ کو طرح طرح کے دکھ دیئے اور ایسے ایسے آزار پہنچائے کہ کسی پیغمبر کو ایسی ایذاؤں کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن نبی کریمؐ نے سب تکالیف خندہ پیشانی اور صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیں اور آپ کے پائے استقلال میں ذرا بھی تزلزل نہیں آیا۔ جب آہستہ آہستہ اعوان و انصار کی ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی اور آپ کے پاس اتنی طاقت فراہم ہوگئی کہ آپ اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکیں تو اس وقت بھی آپ ہرگز انتقام کی نہ سوچتے اگر اللہ تعالیٰ نے خود آپ کو جنگ اور مقابلے کا حکم نہ دیا ہوتا۔

ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد کے تمام عرصے میں حتیٰ کہ اس زمانے میں بھی جب آپ مشرکین اور منافقین کے ساتھ جہاد میں مشغول تھے وحی کے نزول کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کا دین مکمل طور پر سب کو پہنچا دیا۔ یہ دین خود اللہ کی طرف سے خلقت کے لئے ایک دلیل بن گیا تا کہ حسب فرمان خداوندی:

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ "جو ہلاک ہو وہ بھی دلیل سے ہلاک ہو اور جو جئے وہ بھی دلیل سے جئے۔" (سورۂ انفال: آیت ۴۲)

رسول اکرمؐ نے جب اس دنیا سے رحلت فرمائی تو اس وقت تک لوگوں کے لئے آپ نہ صرف دین کی راہ ہموار کر چکے تھے بلکہ اس راہ پر چلنا بھی آسان بنا چکے تھے۔ پروردگار عالم کے حکم سے آپ نے اپنے بعد حضرت علی علیہ السلام کو امت کا امام اور پیشوا قرار دیا تھا تا کہ امت کے کام میں خلل نہ پڑنے پائے۔ افراتفری برپا نہ ہو اور لوگوں کی ذاتی اغراض لڑائی جھگڑے کا سبب نہ بن جائیں۔ قرآن مجید نے خود اس سلسلے میں ضروری رہنمائی مہیا کی تھی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ " تمہارے ولی تو بس اللہ، اس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ ادا کرتے ہیں۔"
(سورۂ مائدہ: آیت ۵۵)

یہ خصوصیات سوائے امام علی علیہ السلام کے کسی اور میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ وہی فرد یگانہ تھے جنہوں نے نماز کی حالت میں صدقہ دیا تھا۔

ابتدائے بعثت سے حجۃ الوداع تک موقع بموقع آنحضرتؐ اس طرف اشارہ فرماتے رہتے تھے کہ آپ کے جانشین علی ابن ابی طالبؑ ہی ہیں۔ حجۃ الوداع کے بعد اس سلسلے میں جو واقعہ پیش آیا اس بارے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ اس حج کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا اور ایسے واشگاف الفاظ میں ولایت و خلافت علیؑ کا اعلان کیا کہ مسلمان آپ کا مطلب پا گئے اور کسی کو اس بارے میں کوئی شک شبہ باقی نہ رہا۔

اس موقع پر اور اس سے پیشتر زندگی بھر اللہ کے رسولؐ نے اس سلسلے میں جو واضح اشارے فرمائے تھے ان کی روشنی میں بہت لوگوں نے امام علیؑ کی خلافت تسلیم کرلی تھی۔ اگر ہم اس بات کے ساتھ ساتھ ان کلمات کو بھی پیش نظر رکھیں جو رسول اکرمؐ نے پیروان و شیعیان علیؑ کی تعریف میں ارشاد فرمائے اور امام علیؑ کی ذاتی صلاحیت اور ان کی اعلیٰ خدمات کا خیال کریں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تشیع کی نقشہ کشی دست پیمبرؐ سے ہوئی تھی۔ آنحضرتؐ کی حیات طیبہ میں ہی تشیع کا بیج بویا جاچکا تھا اور آنحضرتؐ نے اپنے اقوال و افعال سے اس کی آبیاری کی تھی حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کی نظروں میں اسے ایک بلند مرتبہ حاصل ہوگیا تھا اور لوگ امام علیؑ اور ان کے فرزندان پاک کو دین حق کی بنیاد، کتاب الٰہی کے ترجمان اور دین و دنیا میں اپنی پناہ گاہ تصور کرنے لگے تھے یہاں تک کہ بہت سے لوگ علی علیہ السلام کا خلافت پر

خدائی حق بھی تسلیم کرتے تھے۔ خود امام علیؑ کو بھی اپنے حق پر پورا اطمینان تھا۔

جب امام علیؑ کو سقیفہ بنی ساعدہ میں اجلاس کی خبر ملی تو آپ کو کمال تعجب ہوا کہ کیسے کچھ لوگوں نے ان کی رسول اکرمؐ کے غسل و کفن کی مصروفیات سے فائدہ اٹھا کر رسول اکرمؐ کی ہدایات کو نظرانداز کردیا اور ان کی جانشینی سے متعلق رسول اکرمؐ نے جو تاکید فرمائی تھی اسے یکسر فراموش کردیا۔

اہلبیت رسولؐ سے محبت اور ان کی پیروی کا آغاز اسلام کے وجود میں آنے کے کچھ ہی مدت بعد ہوگیا تھا۔ اسلام کے ساتھ ساتھ یہ پودا بھی پروان چڑھتا گیا اور اہلبیت رسولؐ کی محبت لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی چلی گئی۔ جب ''غدیر خم'' میں رسول اکرمؐ نے حکم پروردگار پر لبیک کہا تو ''ولایت اہلبیتؑ'' کا عقیدہ حتمی اور ضروری ہوگیا۔

يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اے پیغمبرؐ! جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے وہ آپ لوگوں تک پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں۔ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔'' (سورۂ مائدہ: آیت ۶۷) اس آیت میں ایک ایسے حریص گروہ کی طرف اشارہ ہے جس کی ساری کوشش یہ تھی کہ علی علیہ السلام کو ان کے حق سے محروم رکھا جائے اور خلافت کے معاملے میں ان کا مقابلہ کیا جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان لوگوں کے نام معلوم تھے اور وہ علی علیہ السلام سے ان کی مخالفت اور ان کی چالاکی سے خوب واقف تھے۔ اسی خوف کی وجہ سے آپ نے یہ مناسب نہیں سمجھا تھا کہ حج کے موقع پر علی علیہ السلام کے لئے بیعت لی جائے اور اس کی خبر جزیرہ نمائے عرب کے گوشے گوشے میں لاکھوں مسلمانوں تک پہنچے لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ آسمانی

پیغام ان لوگوں تک پہنچادیں جو آپ کے گرد جمع تھے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ کچھ لالچی لوگوں نے آپس میں یہ طے کرلیا تھا کہ امام علیؑ کو ان کا حق نہیں دیں گے۔ آخر سقیفہ کا موقع آ گیا۔ انصار میں سے ایک جماعت نے اپنے سردار سعد بن عبادہ انصاریؓ کا نام خلافت کے لئے پیش کیا۔ یہ بھی مستبعد نہیں کہ انصار نے جب یہ دیکھا ہو کہ مہاجرین امام علیؑ کو محروم رکھنے کے لئے کوشاں ہیں تو انہوں نے اس محاذ کو کمزور کرنے کے لئے یہ اقدام کیا ہو۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انصار کی شکل میں ایک تیسری جماعت وجود میں آ گئی۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے انصار کو یہ کہہ کر خاموش کردیا: "خلافت کے معاملے میں کوئی ہمارے مقابلے میں نہیں آ سکتا۔ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقرباء و اعزاء میں سے ہیں۔ ہماری مخالفت کوئی غلط رُو ہی کرسکتا ہے۔"

اس بات سے کچھ مسلمان کافی متاثر ہوئے۔ انصار کے مقابلے میں مہاجرین کو شہہ مل گئی۔ انصار کے نامزد کردہ امیدوار سعد بن عبادہ انصاریؓ سے ان کے چچازاد بھائی بشیر بن سعدؓ کی ان بن تھی اس لئے بشیرؓ نے کہا:

"اے لوگو! یہ سمجھ لو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قریش میں سے تھے۔ ان کی قوم کا ہی ان سے زیادہ قریبی تعلق تھا اور وہی ان کی جانشینی کے زیادہ مستحق ہیں۔ اللہ کی قسم! ہرگز اللہ مجھے خلافت کے معاملے میں ان کی مخالفت کرتے ہوئے نہیں دیکھے گا۔"

حبابؓ نے بشیرؓ کی تردید کرتے ہوئے ان پر الزام لگایا کہ دراصل انہیں سعد بن عبادہؓ سے حسد ہے۔ بشیرؓ نے جواب دیتے ہوئے کہا:

"نہیں! یہ بات نہیں۔ اللہ کی قسم! مجھے یہ قطعی پسند نہیں کہ اللہ نے کسی قوم کا جو حق قرار دیا ہو میں اس کے بارے میں اس سے لڑنے لگوں۔"

بزرگان انصار میں اس اختلاف رائے کی وجہ سے انصار کی پوزیشن کمزور ہوگئی

اور دوسرے محاذ کو تقویت پہنچی۔ انصار نے چونکہ یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اہلبیت رسولؐ کا حق فائق ہے اس لئے مہاجرین خلافت کے مستحق قرار پا گئے مگر ساتھ ہی مہاجرین کی اس مخالف جماعت کو بھی ایک قوی دلیل ہاتھ آ گئی جو خلافت پر علی علیہ السلام کا استحقاق ثابت کرنا چاہتی تھی۔ انہوں نے کہا:

''اگر قرابت ہی دلیل ہے تو ان لوگوں کا خلافت پر کوئی حق نہیں رہا کیونکہ بنی ہاشم اور ان میں بھی سب سے بڑھ کر علی ابن ابی طالبؑ رسول اکرمؐ کے زیادہ نزدیکی قرابتدار اور میراث رسولؐ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔''

مہاجرین کے پاس انصار کے مقابلے میں کوئی تسلی بخش دلیل نہیں تھی۔ مہاجرین و انصار میں سے اہل نظر خوب جانتے تھے کہ قرابت کے معاملے کا خلافت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسلام نے اس طرح کے امتیازات کو ختم کر دیا ہے اور نیک اعمال اور اسلام کی خدمت کو معیار قرار دیا ہے۔

اس دوران میں شیعیان علیؑ رسول اکرمؐ کے حکم کے مطابق صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے اس رہنما کا دامن تھامے رہے جس کی ابھی کل ہی انہوں نے بیعت کی تھی اور جو آج رسول اکرمؐ کے بچھڑنے پر حزن و ملال کی تصویر تھا۔

آخرکار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سپرد خاک کرنے کے بعد امام علیؑ سابقین اولین کی ایک جماعت کے ساتھ جس کی تعداد کچھ کم نہیں تھی اپنا حق لینے کے لئے اٹھے۔ مہاجرین کے ساتھ گفتگو میں آپ نے بھی وہی دلائل پیش کئے جو مہاجرین نے انصار کے مقابلے میں پیش کئے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''تم نے درخت کو تو پکڑ لیا اور اس کا پھل چھوڑ دیا۔''

بحث کے دوران میں جب ان لوگوں نے اتفاق رائے اور اجماع کا تذکرہ کیا تو امام علیؑ نے اس دلیل کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ایک فریق سقیفہ کے اجتماع میں شریک ہی نہیں تھا۔ اس فریق کی شرکت کے بغیر فیصلہ درست نہیں ہے۔

رسول اکرمؐ سے قرابت کی دلیل تو خود امام علیؑ کے حق میں جاتی ہی تھی، اجماع امت بھی مکمل نہیں تھا کہ اس کو حجت قرار دیا جاسکے۔ احادیث رسولؐ کی گونج بھی قلوب میں باقی تھی۔ قریش کو ہمیشہ سے رسول اکرمؐ کے جد امجد حضرت ہاشم اور دادا حضرت عبدالمطلب سے حسد رہا تھا۔ یہی صورت امام علیؑ کے ساتھ تھی جو علم و دانش، شجاعت اور اسلامی خدمات میں بڑھے ہوئے تھے اور ان کے خلاف محاذ آرائی کا بڑا سبب یہی تھا۔

صحابہ کرام کی جو جماعت امام علیؑ کا ساتھ دے رہی تھی اس میں بہترین اصحاب شامل تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو رسول اکرمؐ سے بڑی محبت رکھتے تھے اور سابقین اولین میں سے تھے۔ ان میں حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت براء بن عازبؓ، حضرت حذیفہ یمانیؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ اور حضرت ابوہیثمؓ جیسے لوگ شامل تھے۔ انہوں نے سقیفہ کے اجلاس میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ خلافت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے، کس کے ہاتھ میں معاملات کی باگ ڈور دینی چاہئے اور کس کا حکم ماننا چاہئے۔[1]

اس کے بعد اس گروہ نے — جس میں کئی انصار و مہاجرین شامل تھے — نصف شب کو اپنا اجلاس منعقد کیا تاکہ باہمی صلاح مشورے سے کوئی راہ عمل طے کی جائے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ معاملہ مہاجرین و انصار پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس کو

۱۔ احتجاج طبرسی میں اور آیت اللہ خوئی کی معجم رجال حدیث جلد اول میں ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ ان بارہ اصحاب میں سے تھے جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی۔

یہ حضرت ابیؓ ہی تھے جنھوں نے کہا تھا:

اے ابا بکر! جو حق خدا نے تیرے غیر کے لئے قرار دیا ہے اس سے انکار نہ کر۔ حق، حقدار کو واپس دیدے اور اپنے کئے پر توبہ کر تاکہ تیرا گناہ ہلکا ہو جائے۔ انکار بیعت کرنے والوں میں مقداد، زبیر بن عوام، سعد بن عبادہ، خزیمہ بن ثابت، خالد بن سعید، عباس بن عبدالمطلب، فضل بن عباس، عتبہ بن ابی لہب، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبید اللہ کے نام بھی کتابوں میں ملتے ہیں۔

رہنمائی کے لئے موزوں تر خیال کریں، منتخب کرلیں۔

جب اس گروہ کی مخالفت کی خبر پھیلی تو ان لوگوں میں سے کچھ جو حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے تھے اس گروہ کے لوگوں سے آکر ملے۔ اس وقت ان کی سمجھ میں آیا کہ خلافت کا معاملہ رسول اکرمؐ کے کفن دفن تک ملتوی رہنا چاہئے تھا اور اس کام کو سرانجام دینے سے پہلے معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کرنا اور تدبر سے کام لینا ضروری تھا۔ مرتدین اور جھوٹے مدعیان نبوت کی طرف سے اسلامی معاشرے کو جو خطرہ لاحق تھا اس کی طرف بھی توجہ لازم تھی مگر ان باتوں میں سے کسی بات پر پہلے سے غور و خوض نہیں کیا گیا تھا۔

حضرت عمرؓ خود فراموشی کے عالم میں تھے۔ جب انہوں نے حضرت رسول اکرمؐ کی وفات کی خبر سنی تو عالم مدہوشی میں کہا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہرگز نہیں مرے۔ جو کوئی ایسا کہے گا میں اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں گا۔"

وہ کچھ دیر تک اسی طرح کی باتیں کرتے اور لوگوں کو دھمکاتے رہے یہاں تک کہ بعض مسلمانوں نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی: اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ "بے شک آپؐ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی۔" (سورۂ زمر: آیت ۳۰)

ان مسائل میں سے کسی کے بارے میں ان لوگوں نے سوچا ہی نہیں تھا اور نہ ان حوادث کی طرف توجہ کی تھی جو تازہ تازہ مسلمان ہونے والوں کی جانب سے پیش آسکتے تھے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ صحابہ کرام کے درمیان خلافت کے مسئلے پر اختلاف رونما ہو جائے۔

لیکن امام علی علیہ السلام کو اسلام کا پیغام اور اسلام کے شعار بیحد عزیز تھے۔ وہ ہر چیز پر اسلام کے مفاد کو مقدم رکھتے تھے۔ اگر وہ جانشینی پیغمبرؐ کے بارے میں اپنا خداداد حق مانگتے تھے تو اس لئے کہ اسلام کو پھیلا سکیں، اس کی تعلیمات کی اشاعت کر سکیں، اس کے بنیادی احکام افراد کی زندگی میں نافذ کر سکیں اور

اسلام کو دلوں میں راسخ کرسکیں لیکن اگر یہ مقصد حاصل نہ ہوسکے تو خلافت کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی۔

ایک بار آپ اپنے جوتے مرمت کررہے تھے۔ اس وقت آپ نے اپنے چچازاد بھائی اور حبر الامہ حضرت ابن عباسؓ سے کہا: ''تم لوگوں پر حکومت کرنے کی اتنی بھی وقعت نہیں جتنی اس جوتے کی ہے۔ ہاں! اگر میں کوئی حق قائم کرسکوں اور کسی باطل کو مٹاسکوں تو پھر دوسری بات ہے۔''

اسی دوران میں ایک نیا حادثہ پیش آیا۔ مرتدین اور جھوٹے پیغمبروں کا پروپیگنڈہ زور پکڑ گیا۔ اسلام کی جڑیں ابھی مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ بہت سے صحرائی بدوؤں کے نزدیک اسلام کی چنداں اہمیت نہیں تھی۔ خصوصاً جب مہاجرین، انصار اور بنی ہاشم کے درمیان خلافت کے مسئلے پر اختلاف کی خبر ان لوگوں تک پہنچی تو متعدد قبائل اسلام سے پھر گئے۔

اسلام نے ابھی تازہ تازہ ترقی شروع کی تھی۔ اتنے میں ان خطرات نے اسے چاروں طرف سے گھیرلیا۔ ایسے میں امام علی علیہ السلام نے یہی بہتر سمجھا کہ خلافت پر اپنے حق سے چشم پوشی کریں اور دوسرے فریق کے ساتھ متحدہ محاذ بناکر ان زبردست خطرات کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

امام علی علیہ السلام نے اس بارے میں حضرت ابوبکرؓ سے کھل کر گفتگو کی اور واضح کردیا کہ اگر میں اپنا حق مانگتا ہوں تو اسلام کی خاطر اور اگر اس سے چشم پوشی کرتا ہوں تو وہ بھی اسلام ہی کی خاطر۔

بہرحال امام علی علیہ السلام نے اسلام کی حفاظت کے خیال سے تعاون کی راہ اختیار کی اور خلافت (حکومت) کا خیال چھوڑ دیا، مشکلات کو دور کیا اور اسلام کے پیچیدہ مسائل کو حل کیا۔ اس طرح آپ نے اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کردیا۔

بانی اسلامؐ دنیا سے رحلت کرگئے تھے مگر ابھی لوگ اسلام کے بنیادی احکام

بھولے نہیں تھے۔ جب انہوں نے فرزند بنی ہاشم اور پیغمبر اعظمؐ کے شاگرد رشید امام علی علیہ السلام کے وجود مبارک میں اسلام کی روشنی دیکھی تو وہ ان کے گرد جمع ہوگئے تاکہ وہ ان کی مادّی اور روحانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو منور کرسکیں اور ان کی ان مشکلات کو حل کریں جو افتراق اور پریشانیوں کا سبب تھیں۔ امام علی علیہ السلام نے انہیں اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا، ان کے مسائل کو حل کیا اور معاملات کے حیران کن فیصلے کرکے ان کی رہنمائی کی۔

شیعیت کی ابتداء کیسے ہوئی اور لفظ شیعہ پیروان علیؑ سے کیونکر مخصوص ہوگیا اس بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ تشیع کا بیج خود رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے بویا تھا اور آپ کو اس بیج کے پھلنے پھولنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ آپ اکثر موقعوں پر اشارتاً یا صراحتاً امام علی علیہ السلام کی شان اور ان کے مرتبے کا بیان کرتے رہتے اور دین کی بنیادوں کو مضبوط بنانے میں ان کے کردار کا تذکرہ کرتے رہتے تھے حتیٰ کہ زندگی کے آخری لمحات میں بھی آپ کی زبان مبارک پر امام علی علیہ السلام ہی کا تذکرہ تھا۔ آپ محبان علیؑ کو شیعہ کہتے تھے جیسا کہ بکثرت احادیث میں آیا ہے۔ آپ نے ان کے نیک انجام کی خبر دی تھی۔ چنانچہ زمخشری نے ربیع الابرار میں یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: یَا عَلِیُّ! اِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیَامَةِ اَخَذْتُ بِحُجْزَةِ اللّٰهِ وَاَخَذْتَ اَنْتَ بِحُجْزَتِیْ وَاَخَذَ وُلْدُکَ بِحُجْزَتِکَ وَاَخَذَ شِیْعَةُ وُلْدِکَ بِحُجْزَتِهِمْ ''اے علیؑ! جب قیامت برپا ہوگی تو میں اللہ کا دامن پکڑوں گا، تم میرا دامن پکڑو گے، تمہارے فرزند تمہارا دامن پکڑیں گے اور تمہارے فرزندوں کے شیعہ ان کا دامن پکڑیں گے۔'' (بحار الانوار ج ۶۵، ص ۱۰۴)

ابن حجر نے صواعق محرقہ میں لکھا ہے: اَخْرَجَ الطَّبْرَانِیُّ عَنْ عَلِیٍّ عَلَیْهِ السَّلَامُ اِنَّ خَلِیْلِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ: یَا عَلِیُّ اِنَّکَ سَتَقْدِمُ عَلَی اللّٰهِ وَشِیْعَتُکَ رَاضِیْنَ مَرْضِیِّیْنَ وَیَقْدِمُ عَلَیْهِ اَعْدَاؤُکَ غضابی مُقْمَحِیْنَ '' طبرانی نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ میرے دوست رسول اللہؐ نے فرمایا: اے علیؑ! تم اور تمہارے پیروکار

اس حالت میں اللہ کے سامنے جائیں گے کہ تم اللہ سے خوش ہوگے اور اللہ تم سے اور تمہارے دشمن اس حالت میں جائیں گے کہ وہ افسردہ و غمگین ہوں گے۔"

سورۂ بینہ کی آیت ۷ "واقعی بہترین لوگ وہ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے" کی تفسیر میں ابن حجر کہتے ہیں کہ حافظ جمال الدین راوندی کی روایت میں ابن عباسؓ سے آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے امام علیؑ سے فرمایا: یَا عَلِیُّ! اَنْتَ وَشِیْعَتُکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ "اے علیؑ! تم اور تمہارے شیعہ خیر البریہ ہیں۔"

شیعوں کی مدح میں اس طرح کی روایات بکثرت آئی ہیں۔ راویان حدیث نے اسلام کی دعوت کے آغاز ہی سے رسول اکرمؐ سے ان روایات کو بیان کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ امام علیؑ اور ان کے فرزندوں کے دوستوں اور پیروکاروں کا نام خود رسول اکرمؐ ہی کے زمانے میں شیعہ ہوگیا تھا اور یہ نام خود آپ ہی نے اپنی زبان مبارک سے رکھا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام علیؑ اور ان کے شیعوں کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں ان کا مسلمانوں پر بہت گہرا اثر پڑا اور ان کے نتیجے میں کثیر تعداد میں مسلمان امام علیؑ کو ماننے اور ان کا خلافت پر حق تسلیم کرنے لگے۔ محمد کرد علی نے خطط الشام میں لکھا ہے کہ:

"صحابہ کرام کی ایک تعداد رسول اکرمؐ کے زمانے ہی میں حضرت علیؓ کی ولایت کی قائل تھی جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کہا کرتے تھے کہ ہم نے رسول اللہؐ سے بیعت اس بات پر کی کہ ہم مسلمانوں کے خیر خواہ رہیں گے اور علی بن ابیطالبؓ کی پیروی اور ان سے محبت کریں گے۔ اسی طرح سے حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے تھے کہ لوگوں کو پانچ[1] کاموں کا حکم دیا گیا تھا۔ ایک کو تو انہوں نے چھوڑ دیا اور چار پر عمل کرتے رہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ چار چیزیں کون سی ہیں تو انہوں

۱۔ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ عَلَی الصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَالصَّوْمِ وَالْحَجِّ وَالْوِلَايَةِ وَلَمْ يُنَادِ بِشَیْءٍ كَمَا نُودِیَ بِالْوِلَايَةِ وسائل الشیعہ ج ۱ باب ۱ وجود العبادات الخمس حدیث نمبر ۱ مطبوعہ دار احیاء تراث العربی، بیروت

نے کہا کہ نماز، زکوۃ، روزہ اور حج۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ وہ ایک اور چیز کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ ولایت علی بن ابی طالبؑ۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا یہ بھی نماز اور روزے کی طرح فرض ہے تو حضرت ابوسعید خدریؓ نے کہا کہ یقیناً یہ بھی دوسرے واجبات کی طرح ہے۔ حضرت ابوذرؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت حذیفہ یمانیؓ، ذوشہادتین حضرت خزیمہ بن ثابتؓ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی حضرت علیؑ کے عقیدت مندوں میں تھے۔"

بعض عرب مصنفین اور کچھ مستشرقین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نئے ممالک کی فتح سے پہلے تشیع کا وجود نہیں تھا اور تشیع کا سرچشمہ قدیم ایرانی مذاہب ہیں اور یہ کہ تشیع اسلام کے بعد کی پیداوار ہے ان کی مندرجہ بالا حقائق سے تردید ہو جاتی ہے۔ مشہور جرمن اسکالر اور مستشرق ول ہوزن (Julius Wellhaussen 1844-1918) تشیع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"تشیع کی تحریک خالصتاً سرزمین عرب میں پیدا ہوئی اور (حضرت) امیر مختار کے ظاہر ہونے کے بعد اس تحریک نے غیر سامی گروہوں میں نفوذ کیا۔"

ایک اور جرمن مستشرق گولڈ زیہر شیعہ مذہب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

خلافت کا مسئلہ جس نے مسلمانوں کو شیعہ اور سنی دو فرقوں میں تقسیم کر دیا اسلام کی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پہلے تین خلفاء کے زمانے میں بھی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو اہلبیتؑ سے اپنی محبت کو دل کے نہاں خانہ میں چھپائے ہوئے تھی اور خلافت کو اہلبیتؑ کا حق سمجھتی تھی مگر اس جماعت نے کھلم کھلا جدوجہد ان خلفاء کے بعد شروع کی۔ یہ لوگ آل علیؑ کے علاوہ ہر حکمران کا مقابلہ اور اس کی مخالفت کرتے تھے۔

گولڈ زیہر نے تشیع کی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے ایک ایسی حقیقت کا ذکر کیا ہے کہ کسی بھی غیر متعصب محقق کیلئے اس کا اعتراف ناگزیر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اگر خلافت کا مسئلہ اسلامی نہ ہوتا تو وفات رسولؐ کے فوراً بعد سے آج تک قائم مسلمانوں میں یہ کشمکش وجود میں نہ آتی۔" لیکن جب گولڈ زیہر یہ کہتا ہے کہ

"جو لوگ حضرت علیؑ کے طرف دار تھے وہ علانیہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے"
تو اُس کی اِس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جو لوگ امام علیؑ کے طرفدار تھے ان میں سے کسی نے بھی خلفاء کی اس وقت تک بیعت نہیں کی جب تک خود حضرت علیؑ نے بیعت نہیں کرلی۔ یہ صورت اس وجہ سے تھی کہ انہیں اسلام کے تحفظ کا بڑا خیال تھا۔ یہ لوگ ہر موقع پر اپنے عقیدے کو علانیہ بیان کرتے تھے۔ جب بھی خلفاء دوسروں کے حقوق کے معاملے میں کوتاہی کرتے یا مطلق العنانیت سے کام لیتے تو یہ اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ جب حضرت عثمانؓ نے ایسی روش اختیار کی جو سنت رسولؐ کے مطابق نہیں تھی تو حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور دوسرے شیعہ بزرگوں نے ان پر اعتراض کیا۔ کچھ اور صحابہ کرام بھی ان کے ہم آواز ہوگئے۔ یہاں تک کہ عالم اسلام کے سب بڑے شہروں سے احتجاج کی آواز بلند ہونے لگی۔ آخر عثمانی حکومت کے کار پردازوں نے جو طریقہ اختیار کیا تھا مختلف شہروں کے انقلابیوں نے اس کی بساط الٹ دی۔

اپنی پوری تاریخ کے دوران میں شیعوں کا یہی طرز عمل رہا اور وہ اس اسلامی تحریک سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔ اس سلسلے میں جو بات بالکل واضح ہے وہ اموی اور عباسی حکومتوں پر شیعوں کی تنقید اور ان کی مخالفت ہے۔ اسلام نے حکومت کا جو طریقہ مقرر کیا ہے یہ دونوں خاندان اس سے بہت دور جا پڑے تھے اور پوری مطلق العنانی سے امت پر حکومت چلاتے تھے۔ وہ لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ ان کے سامنے کورنش بجالائیں۔ انہوں نے رعایا پر استبدادی حکومت مسلط کررکھی تھی گویا خلافت کو ملوکیت سے بدل دیا گیا تھا۔

اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی امویوں اور عباسیوں وغیرہ کا سا طریقہ اختیار کرتے تو شیعہ یقیناً ان سے بھی اسی طرح ٹکر لیتے جس طرح انہوں نے امویوں سے لی۔ پھر نتیجہ چاہے کچھ بھی نکلتا۔ شیعوں کی نظر میں حکومت حق و انصاف اور سب افراد کے درمیان برابری اور مساوات قائم کرنے کا ذریعہ ہے چاہے ان

افراد کا رنگ اور ان کی نسل کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ تشیع جس معنی میں اب مشہور ہے اور اس کا جو مطلب فقہاء و متکلمین، مذہبی اور دوسرے لوگ اب سمجھتے ہیں ــــ یعنی ایک ایسی جماعت جو اپنے مخصوص عقائد اور مراسم کی بناء پر دوسروں سے ممتاز ہے ــــ اس معنی میں امام علیؑ کے زمانے میں اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس زمانے میں ان کے حامی اور دوست ضرور تھے اور بہت سے صحابہ ان کے پیروکار بھی سمجھے جاتے تھے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس رائے کے رکھنے والوں میں سے ایک طٰہٰ حسین ہیں جو اپنی کتاب علیؑ وبنوہ اور الفتنۃ الکبریٰ میں تشیع کی تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے جب امام علیؑ کے بعد کے دور پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں:

''امام حسنؑ اور امیر معاویہ میں صلح کے بعد جس کی شرائط کی معاویہ نے ذرا پروا نہیں کی تشیع علیؑ اور آل علیؑ کی حامی ایک سیاسی جماعت کی شکل میں نمودار ہوا۔''

لیکن جو محقق واقعات کی رفتار، خلافت سے متعلق نزاع اور سقیفہ کے واقعات پر شیعہ بزرگوں کی تنقید کا مطالعہ کرے گا وہ ضرور اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اپنی ابتدائی تاریخ اور بعد میں تشیع میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اور ہر دور میں اس کے ایک ہی معنی رہے۔

معاویہ نے جب سابق خلفاء کے راستے کے برخلاف راستہ اختیار کیا [۱] تو شیعوں نے اپنی صفوں کو منظم کرنا شروع کردیا۔ جب اسلام کے نام پر ظلم وستم حد سے بڑھ گیا تو شیعہ ائمہ اور ان کے ماننے والوں نے اموی حکمرانوں کے مقابلے میں اپنی پوزیشن واضح کردی اور اسلام اور قرآن کے حکم کے مطابق اس راہ پر قدم رکھا۔ یہ وہی راہ تھی جس کا طے کرنا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو امت کی رہنمائی کی ذمہ داری لے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ عہد نبوی اور دور معاویہ کے شیعہ مختلف تھے۔

۱۔ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ''اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا کسی دوسرے راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اُسے اُدھر ہی چلنے دیں گے اور جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔ (سورۂ نساء: آیت ۱۱۵)

یہ بات البتہ ضرور ہے کہ خلافت علیؑ کے دوران میں اور اس کے بعد کے زمانے میں تشیع کو بے نظیر فروغ حاصل ہوا۔ اس کی بڑی وجہ اموی حکمرانوں کا ظلم و ستم تھا۔ خاص طور پر یہ بات تھی کہ خلافت علیؑ کے دوران میں صحابہ کرام میں سے جو باقی رہ گئے تھے وہ علی علیہ السلام کے طرفدار تھے اور خلافت پر ان کے حق سے آگاہ تھے۔ یہ صحابہ اس عقیدے کو پھیلانے میں کوشاں رہتے تھے۔ خود امام علیؑ وفات رسولؐ کے بعد خلافت پر اپنے حق کے بارے میں احادیث نبوی اہتمام سے بیان کرتے رہتے تھے۔ مسجد کوفہ اور دوسرے مقامات پر آپ جو خطبے دیتے تھے ان میں صراحت سے خلافت پر اپنے حق کا تذکرہ کرتے تھے۔ شرح نہج البلاغہ میں ہے کہ کئی موقعوں پر امام علیؑ نے بعض صحابہ کرام سے جو بیعت غدیر کے موقع پر موجود تھے درخواست کی کہ انہوں نے خلافت کے بارے میں اللہ کے نبیؐ سے جو سنا ہو بیان کریں۔ چنانچہ بعض اہل بدر اور کچھ دوسرے اصحاب نے کھڑے ہو کر تقریریں کیں اور غدیر خم اور دوسرے موقعوں پر انہوں نے اللہ کے نبیؐ سے جو کچھ سنا تھا، بیان کیا۔

ایک طرف ان کوششوں کے نتیجے میں اور دوسری طرف بنی امیہ کے مظالم کی وجہ سے بنی امیہ کے مخالف محاذ کو تقویت ملی۔ اس محاذ کے بیشتر خیالات میں تشیع کا رنگ نمایاں تھا۔ چونکہ بنی امیہ کے زمانے میں حکومت کے مخالف رہنما اہلبیتؑ کے حق خلافت کے قائل تھے اس لئے اس حکومت کے سب مخالفین اور اس حکومت کے ستائے ہوئے لوگ ان ہی کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ جب مسلمان بنی امیہ کا ظلم و استبداد دیکھتے تھے تو وہ اہلبیتؑ کی ولایت کو امام علیؑ کی ولایت اور حکومت کی توسیع خیال کرتے تھے۔

اگر امام حسنؑ دانشمندی سے کام لے کر جو میراث انہیں ملی تھی اس کی حفاظت کا بندوبست نہ فرماتے اور جو شیعہ انہیں امیر شام کے خلاف کارروائی کرنے اور انقلاب لانے کا مشورہ دے رہے تھے ان کو صاف انکار نہ کرتے تو ایک طرف شیعوں سمیت بنی امیہ کے سیاسی مخالفین اور ان کے مظالم کے شکار لوگوں اور دوسری طرف معاویہ کے حامیوں کے درمیان تمام اسلامی شہروں میں زبردست خونریزی شروع ہو جاتی۔

شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے کہ کوفہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں برابر جلسے ہوتے رہتے تھے جن میں لوگوں کو دعوت دی جاتی تھی کہ وہ اہلبیتؑ کا ساتھ دیں۔ وقتاً فوقتاً لوگ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے پاس آتے رہتے تھے تاکہ ان کے حامیوں کے متعلق انہیں اطلاع دیں اور انہیں اس شدید مخالفت سے آگاہ کریں جو لوگوں میں معاویہ اور اُس کے حکام کے خلاف پائی جاتی تھی۔ ان سب اجتماعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوفیوں نے دو بڑے شیعہ رہنماؤں قیس بن سعد انصاری اور سلیمان بن صرد خزاعی سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح امام حسنؑ کو قائل کریں کہ وہ اس صلح کے معاہدے کو منسوخ کردیں جو انہوں نے معاویہ سے کیا ہے کیونکہ جیسا کہ دنیا کو معلوم ہے معاویہ کو معاہدے کی شرائط کا کوئی پاس نہیں۔

گو یہ دونوں مخلص شیعہ بزرگ تھے اور ان کی مسلمانوں میں بڑی عزت تھی، امام حسنؑ نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کو صبر و ضبط کی تلقین کی اور اسلام کی میراث کی حفاظت اور خونریزی نہ ہونے دینے کا حکم دیا۔

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ جو لوگ کوفہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں حکومت کی مخالفت اور انقلاب کی باتیں کررہے تھے ان میں کچھ موقع پرست گروہ بھی شامل تھے جو تشیع کے نام پر خود اپنی ذاتی تحریک کو کامیاب بنانا چاہتے تھے۔ تشیع کا نام وہ اس لئے استعمال کرتے تھے تاکہ عوام کے مختلف حلقوں کی حمایت حاصل کرسکیں اور ان کی مدد سے اموی حکام کا مقابلہ کریں۔ شیعوں کی بڑی جمعیت عراق میں تھی اور اس نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا جو ظلم و تعدی کے خلاف اٹھی چاہے اس کے لیڈر اولادِ علیؑ اور ان کے حامیوں میں سے ہوں یا نہ ہوں۔ اس کی ایک بہترین مثال یہ ہے کہ جب عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث نے ناصر المؤمنین کا لقب اختیار کرکے امویوں کے خلاف بغاوت کی تو شیعوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اسی طرح ابو مسلم خراسانی کی تحریک کا دارومدار بھی مختلف شیعہ جماعتوں کی اعانت پر تھا۔ اس نے اپنی انقلابی تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے اس پروپیگنڈے کا سہارا لیا کہ میں

اہلبیتؑ کو ان کا حق دلانے اور انہیں ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لئے اٹھا ہوں۔[1]

بہرحال تاریخ ایسے شواہد سے پُر ہے جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تشیع کی طویل تاریخ میں اس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ کسی تاریخی واقعہ سے ان مصنفین کی تائید نہیں ہوتی جو یہ کہتے ہیں کہ تشیع کے جو معنی فقہاء اور متکلمین سمجھتے ہیں اس معنی میں تشیع امام علیؑ کے بعد وجود میں آیا ہے۔ رسول اکرمؐ کے جو وفادار صحابہ رسول اکرمؐ کی زندگی میں اور آپ کی رحلت کے بعد امام علیؑ کے جانے پہچانے شیعہ رہے ہیں ان کے زمانے میں اور بعد کے لوگوں کے زمانے میں تشیع کے مفہوم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔[2]

۱۔ بنی امیہ کے خلاف خراسان (ایران) میں اہلبیت رسولؐ کے نام پر ایک تحریک کی ابتدا ہوئی۔ اس تحریک کا قائد ابو مسلم خراسانی تھا۔ وہ عباسی فوج کا ایک ایرانی جرنیل تھا۔ اُس نے اپنی طاقت بڑھا کر بنی امیہ کے خلاف بغاوت کردی اور آخر اُن کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اگرچہ اس تحریک کا پس منظر خالصتاً شیعہ تھا اور یہ اہلبیت رسولؐ کے خون کا بدلہ لینے کے دعوے کے ساتھ وجود میں آئی تھی حتیٰ کہ لوگوں کو خفیہ طور پر خانوادۂ رسول کے ایک اہل فرد کی بیعت کرنے کے لئے بھی کہا گیا مگر اس کی ابتدا ائمہ کی براہ راست ہدایت کے تحت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب ابو مسلم نے امام جعفر صادقؑ کو مدینے میں خلافت کی پیشکش کی تو انہوں نے یہ کہہ کر یہ پیشکش رد کردی کہ "تم میرے آدمیوں میں سے نہیں ہو اور یہ وقت میرا وقت نہیں ہے۔"

(تاریخ یعقوبی، جلد۳، صفحہ۷۹، ۸۶۔ مروج الذہب، جلد۳، صفحہ۲۶۸)

۲۔ تشیع کے بارے میں معلومات کے لئے مندرجہ ذیل معتبر اور مستند کتابیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) اعیان الشیعہ مولفہ علامہ سید محسن امین ۵۰ جلدیں

(۲) الذریعہ الی تصانیف الشیعہ مولفہ آغا بزرگ تہرانی ۳۰ جلدیں

(۳) اصل الشیعہ و اصولہا مولفہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء

(۴) عقائد امامیہ مولفہ شیخ محمد رضا مظفر

(۵) شیعہ در اسلام مولفہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی

(موخر الذکر دونوں کتابیں اردو زبان میں بالترتیب مکتب تشیع اور ہاسلداران اسلام کے نام سے جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان نے شائع کی ہیں۔

باب سوم

بعد رسولؐ فقہ اور اصول فقہ کے مختلف ادوار

جس زمانے میں اسلام کا غروب نہ ہونے والا سورج طلوع ہوا اس وقت دنیا کو پہلے سے کہیں زیادہ اس کی ضرورت تھی کہ ایک ایسا نظام وجود میں آئے جو انسانی زندگی کے تمام مسائل پر محیط ہو اور جو سب لوگوں کو مساوی حقوق کی ضمانت دے اور ان کو خدائے واحد کی پرستش پر متفق کردے۔ ایک ایسے نظام کی سخت ضرورت تھی جو ایسا صالح معاشرہ تشکیل دے سکے جس میں عدل و انصاف کا بول بالا ہو اور بھلائی اور ہدایت کو بدی اور شر کی قوتوں پر غلبہ حاصل ہو۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے اللہ کے رسولؐ ایک ایسا سرمدی نظام لے کر آئے تھے جس میں توہمات، باطل اور لغو خیالات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جو ہر زمانے اور ہر جگہ کے لئے موزوں تھا اور زندگی کے تمام مسائل کو فطری طریقوں سے حل کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے نظام کے لئے ضروری تھا کہ وہ رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد بھی ترقی کے مختلف مراحل سے گزرتا رہے اور درجۂ کمال تک پہنچے۔

فقہ کا پہلا دور

فقہ کے پہلے دور میں اسلامی قانون کی بنیاد قرآن وسنت پر تھی۔ سنت میں آپ کا قول، آپ کا عمل اور وہ باتیں شامل ہیں جن کو آپ نے دیکھا یا سنا مگر

کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ تقریباً بائیس سال کے عرصے میں یہ قوانین و احکام وحی کے ذریعے سے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

اس دوران میں خدا کی طرف سے جو وحی نازل ہوتی تھی نبی اکرمؐ اور دوسرے لوگ جن کو آپ نے احکامات کی تبلیغ کے لئے منتخب کیا تھا اس کو لوگوں تک پہنچاتے رہتے تھے۔ اس کام کی نگرانی مدینے سے ہوتی تھی جو اسلامی حکومت کا صدر مقام تھا۔

ہم نے اس کتاب کے شروع میں قرآن و سنت کے مطابق اسلام کے وضع کردہ قوانین کی کچھ مثالیں دی ہیں اور ایسے قوانین کے نمونے پیش کئے ہیں جن کو اجمالی طور پر قرآن مجید نے بیان کیا اور پھر نبی محتشمؐ نے وحی الٰہی کے مطابق اپنے قول و عمل سے ان کی تکمیل فرمائی۔ وفات رسولؐ کے بعد آسمانی وحی کا سلسلہ منقطع ہوجانے پر یہ مرحلہ ختم ہوگیا۔ اب نہ کوئی تازہ پیغام آئے گا اور نہ کوئی نئی خبر۔ آپ خاتم المرسلین ہیں اور آپ نے اپنے بعد ایک ایسا مکمل نظام چھوڑا ہے جو ہر عہد اور ہر عصر میں انسانی زندگی کی تمام ضروریات پوری کرتا ہے۔ آپ کی وفات کے بعد مختلف ادوار میں جو نئے نئے واقعات پیش آتے اور نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ان کے متعلق احکام معلوم کرنے کا مسلمانوں کے پاس ایک ہی طریقہ تھا اور وہ یہ کہ قرآن و سنت میں تحقیق و جستجو کی جائے۔

فقہ کا دوسرا دور

یہ دور آنحضرتؐ کی وفات اور وحی کے انقطاع کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ قرآن اور حدیث سے رجوع کریں۔ احادیث نبویؐ سے قوانین، احکام اور پیش آمدہ مسائل کے استنباط کے علاوہ مختلف روایات میں اختلاف دور کرنے کا مسئلہ بھی تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بھاری کام کی ذمہ داری صحابہ کرام کے کندھوں

پر تھی۔ انہوں نے فروعی اور جزوی احکام کے استخراج اور ان کی کلی اصول وقواعد سے تطبیق میں بہت محنت کی۔ احکام سے متعلق قرآنی آیات میں صرف عام قاعدے بیان کئے گئے ہیں، ان کی توضیح وتشریح اور تفصیل کا کام رسول اکرمؐ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچھ آیات ایسی بھی ہیں جن کا اصل مقصود پوری طرح واضح نہیں۔ ظاہر الفاظ کے معنی تو سیدھے سادھے ہیں لیکن اصل مطلب تک رسائی مشکل ہے۔ معدودے چند آیات ہی ایسی ہیں جن میں احکام کا بیان بالکل واضح ہے۔ جہاں تک احادیث مبارکہ کا تعلق تھا تو ان کا کوئی مجموعہ کتابی شکل میں تو موجود نہیں تھا بلکہ یہ احادیث مبارکہ صحابہ کرام کے سینوں میں متفرق طور پر محفوظ تھیں۔ اس کے علاوہ صحیح احادیث بھی گزشتہ اور آئندہ کے تمام مسائل کی جزئیات سے بحث نہیں کرتی تھیں، خصوصاً اس لئے کہ چند ہی سال کی مدت میں اسلام بہت وسیع علاقے میں پھیل گیا تھا۔ ایران اور روم کی فتح کے بعد جہاں تہذیب وتمدن اور علوم وفنون مدینہ منورہ کی نسبت بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے ایک طرف مسلمانوں کو بے اندازہ دولت ہاتھ آئی تو دوسری طرف بے شمار نت نئے مسائل سے بھی واسطہ پڑا۔

دوسرے تمدنوں سے دوچار ہونے پر عربوں کی زندگی کے ہر میدان میں انقلاب آ گیا اور اس کی وجہ سے بہت سے نئے مسائل پیدا ہوگئے۔ ان مسائل کو حل کرنے اور نئی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایسے نئے قوانین کی ضرورت ہوئی جن کی پہلے ضرورت نہیں تھی اور نہ ان کا کتاب وسنت میں کوئی وجود تھا۔ اس صورت حال کے نتیجے میں اہل سنت نے دو نئے اصول وضع کئے۔ ایک اجماع دوسرے قیاس۔ اس طرح رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد اسلامی قانون سازی اور فقہ کی بنیاد چار اصولوں پر ہوگئی۔ اپنی نشوونما کے ابتدائی دور میں اجماع کا اطلاق فقہاء کا کسی مسئلے پر اتفاق رائے ہوجانے پر ہوتا تھا۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ اپنی کتاب دراسۃ نظام المعاملات میں لکھتے ہیں:

''جب حضرت ابوبکرؓ سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا یا کوئی قضیہ فیصلے کے لئے ان کے سامنے لایا جاتا تھا تو وہ اول قرآن مجید پر نظر ڈالتے تھے۔ اگر قرآن مجید میں اس سوال کا جواب مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ اگر قرآن مجید میں جواب نہ ملتا تو احادیث رسولؐ جو انہیں معلوم تھیں ان کی طرف رجوع کرتے۔ اگر احادیث رسولؐ میں بھی جواب نہ ملتا تو صحابہ کرام سے مشورہ کرتے۔ اگر کوئی صحابی اس مسئلے کے متعلق کسی حدیث سے واقف ہوتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرتے تھے کہ امت میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے سینوں میں علم نبوی محفوظ ہے۔ جب انہیں کسی کام کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوتا تو وہ اہل رائے اور دانشمند اصحاب کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جس بات پر اتفاق رائے ہوجاتا اسی کے مطابق حکم دیتے۔''

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو اگر انہیں کسی سوال کا جواب قرآن وسنت میں نہ ملتا اور حضرت ابوبکرؓ کا بھی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ موجود نہ ہوتا تو صاحب الرائے صحابہ کرام کا جس بات پر اتفاق ہوجاتا وہ اسی پر عمل کرتے تھے۔''[1]

اس طرح وفات رسولؐ کے بعد اس قسم کی مشکلات پر قابو پانے کی ضرورت بہت بڑھ گئی۔ ان مشکلات کی اصل وجہ ایسے مآخذ کی کمی تھی جو مسائل کے صحیح حل میں رہنمائی کرسکیں۔ جب صحابہ کرام کی بڑی تعداد نئے مفتوحہ علاقوں میں منتقل ہوگئی تو اس کے نتیجے میں احادیث کے کام میں انتشار پیدا ہوگیا اور وضعی احادیث کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مسلمان قرآن وحدیث کے مطالعے پر کافی توجہ دیتے تھے اس لئے قدرتی طور پر بعض احادیث نسبتاً کم معتبر سمجھی گئیں اور بعض احادیث کو کچھ لوگوں نے

۱۔ دراسۃ نظام المعاملات ص ۲۹۔ اعلام الموقعین از ابن قیم ج ۱ ص ۵۱ و ۷۰

صحیح سمجھا اور کچھ نے غیر صحیح۔ یہی صورت ان احکام کے بارے میں ہوئی جو قرآن سے بذریعہ اجتہاد استنباط کئے گئے۔ اس طرح صحابہ کرام کے درمیان آیات کو سمجھنے اور ان سے احکام اخذ کرنے کے معاملے میں اختلاف بڑھ گیا۔ ہر صحابی اپنے نقطہ نظر کی تائید میں قرآن و حدیث سے استدلال کرنے لگا۔ اس خلفشار میں رسول اکرمؐ کے وصی برحق امام علیؑ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کو نظرانداز کر دیا گیا۔

بہرحال اجماع کا بیج حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بویا تھا۔ جب کسی مسئلے کا حل انہیں کتاب و سنت میں نہیں ملتا تھا تو وہ اجماع سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس کی تائید شیخ خضری کی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب حضرت ابوبکرؓ کو کسی سوال کا جواب قرآن مجید میں اور ان احادیث میں نہیں ملتا تھا جن کا انہیں علم تھا تو وہ لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب کسی بات پر اتفاق رائے ہو جاتا تو اس کے مطابق حکم صادر کر دیتے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں: ''حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جب کسی معاملے میں مختلف لوگوں سے مشورہ کر کے کوئی رائے دیدیتے تھے تو لوگ اس کی پیروی کرتے تھے۔ پھر کسی کو اس کی مخالفت کی اجازت نہیں تھی۔ اس طرح کسی حکم کے دریافت کرنے کو اجماع کہتے ہیں۔''

سرخسی کی کتاب المبسوط میں ہے: ''حضرت عمرؓ اپنے علم و فضل کے باوجود صحابہ سے مشورہ کرتے تھے۔ جب کوئی مسئلہ ان کے سامنے لایا جاتا تو وہ کہتے کہ علیؑ اور زیدؓ کو بلاؤ۔ اس کے بعد ان دونوں سے مشورہ کرتے اور جس بات پر اتفاق ہو جاتا اس کے مطابق حکم صادر کر دیتے۔''

شعبی (عامر بن شرجیل کوفی) کہتے ہیں: ''جو مسائل حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوتے وہ ان پر خوب غور کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے بھی مشورہ کرتے تھے۔''

ان روایات اور دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلے میں صحابہ کرام اگر کسی رائے پر متفق ہو جاتے تھے تو اس رائے کا احترام کیا جاتا تھا اور اسے قبول

کرلیا جاتا تھا۔ یہیں سے اجماع کی داغ بیل پڑی جس کے مفہوم میں اب تک تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر علماء نے مفصل بحثیں کی ہیں۔ ہم اس کتاب کے آئندہ ابواب میں ان علماء کی بعض آراء کا تذکرہ کریں گے۔

اجماع کے بعض طرفداروں نے اس سے بھی بڑھ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اجماع کی بنیاد خود رسول اکرمؐ نے رکھی ہے۔ یہ لوگ ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: مَا اجْتَمَعَتْ اُمَّتِیْ عَلٰی ضَلَالٍ، وَیَدُ اللّٰہِ مَعَ الْجَمَاعَۃِ ''میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی۔ خدا کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے۔''

یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے حکم دیا ہے کہ جب تمہیں کوئی مشکل پیش آئے اور اس کے متعلق کتاب وسنت میں کوئی حکم نہ ملے تو سمجھدار لوگ جمع ہو کر باہم مشورہ کریں اور ان کی رائے پر عمل کیا جائے۔ یہ لوگ بعض قرآنی آیات سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس کے بھی چند نمونے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ''جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبرؐ کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا کسی اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے اُدھر ہی چلنے دیں گے اور قیامت کے دن اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔'' (سورۂ نساء: آیت ۱۱۵)

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَاکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسولؐ تم پر گواہ بنیں۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۴۳)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔'' (سورۂ آل عمران: آیت ۱۰۳)

اجماع کے حامی ان کے علاوہ اور بھی بعض آیات سے استدلال کرتے ہیں۔[1]

۱۔ العدۃ از شیخ طوسی، الاحوال العامۃ للفقہ المقارن ص ۲۵۷ سید محمد تقی الحکیم

قیاس

قرآن ، حدیث اور اجماع کے بعد اہل سنت کے نزدیک استنباط احکام کی چوتھی بنیاد قیاس ہے جس کے ذریعے سے رسول اکرمؐ کے بعد انہوں نے اپنی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور دوسری قوموں کے ساتھ ربط ضبط ہونے پر جو نئے مسائل پیدا ہوئے ان کا حل دریافت کیا ہے۔

قیاس کے اصول پر عمل کرنے والے قیاس کا جو مطلب بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس مسئلے کے بارے میں کوئی حکم موجود نہ ہو اس کا کسی دوسرے ایسے ملتے جلتے مسئلے پر قیاس کیا جائے جس کے بارے میں حکم موجود ہو اور دونوں مسئلوں میں اشتراک علت کی وجہ سے ایک ہی طرح کا حکم دیا جائے۔[۱]

دوسرے صحابہ کرام کے مقابلے میں حضرت عمرؓ اس اصول پر زیادہ عمل کرتے تھے اور اس کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے مختلف علاقوں کے حکام اور قاضیوں کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ اپنے فیصلوں کی بنیاد زیادہ تر قیاس پر رکھیں۔ جب حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو کوفہ کا قاضی بنا کر بھیجا تو انہیں حکم دیا:

''جن مسائل کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی حکم نہ ملے ان میں اپنی رائے سے اجتہاد کر کے فیصلہ کرو۔''

انہوں نے اپنے ایک دوسرے قاضی ابوموسیٰ اشعری کو لکھا تھا:

''قضاء ایک واجب ہے جس میں ایک مستقل قاعدے کی پابندی ضروری ہے... جو حکم قرآن وسنت میں نہیں اس کے بارے میں خوب غور وفکر کر کے رائے قائم کرو۔ ملتے جلتے مسائل کو سمجھو اور ان کو ایک دوسرے پر قیاس کرو۔ جس رائے کو خدا کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور انصاف کے قریب جانو اس پر اعتماد کرو۔''[۲]

۱۔ مصادر التشریع فیما لا نص فیہ ص ۱۲، از شیخ عبدالوہاب خلاف

۲۔ مصادر التشریع ص ۱۸، شیخ عبدالوہاب خلاف، تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۵۱، شیخ خضری

عصر صحابہ کے بعد قیاس میں اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہوگئی اور اکثر فقہاء نے یہ اصول تسلیم کرلیا۔ فقہائے عراق اور احناف میں یہ اصول خوب مقبول ہوا۔ جب قیاس کے طرفدار علماء نے فقہ کی تدوین کا آغاز کیا اور احکام کی علت پر غور کرنا شروع کیا تو انہوں نے احکام کے استخراج میں قیاس ہی سے کام لیا اور اس اصول کو مستند قرار دینے کے لئے کتاب و سنت اور عقل سے استدلال کیا۔ ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بہت سے مسائل میں جن کے بارے میں بذریعہ وحی کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، خود رسول اکرمؐ نے قیاس سے کام لیا۔ قیاس کے طرفدار حضرت معاذؓ کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ نے انہیں یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ان سے پوچھا: ''جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے گا تو تم اس کا فیصلہ کیسے کروگے؟''

حضرت معاذؓ نے کہا: ''کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اگر اس میں حکم نہیں ملے گا تو سنت رسولؐ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اگر سنت میں بھی حکم نہیں ملے گا تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ بہر حال کسی مسئلے میں اپنی طرف سے کوشش میں کمی نہیں کروں گا۔''

اس پر رسول اکرمؐ نے ان کے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

''خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسولؐ کے ایلچی کو عمل بالرائے کی جس میں قیاس بھی شامل ہے توفیق بخشی۔''[1] آپ نے حضرت معاذؓ کے جواب پر خوشنودی کا اظہار فرمایا اور ان کو حکم دیا کہ اسی طریقے پر عمل کریں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے قیاس کے ساتھ عمل بالرائے کا حکم دیا ہے ان کے مطابق آپ نے حضرت معاذؓ کو دعا بھی دی۔

قیاس اور اجماع نے ابتدائے اسلام سے اب تک مختلف مراحل سے گزر کر موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ اس عرصے میں ان دونوں اصولوں پر کافی بحث

۱۔ مصادر التشریع، شیخ عبدالوہاب خلاف اور تاریخ التشریع الاسلامی، شیخ خضری

ہوتی رہی ہے۔ نئے مسائل کے متعلق احکام دریافت کرنے کی شدید ضرورت نے اہل سنت کو مجبور کیا کہ وہ اجماع اور قیاس کو فقہ میں قانون سازی کی بنیاد بنائیں۔ ان اصولوں کے پیروکاروں کا دعویٰ ہے کہ احکام کے دوسرے مآخذ میں جدید مسائل کا اتنا صاف اور واضح حل موجود نہیں۔ اس کے باوجود دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ احادیث کو قبول کرنے میں یہ لوگ بہت سختی سے کام لیتے ہیں اور کسی حدیث کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے جب تک راوی قسم نہ کھائے یا روایت کی صحت کی کوئی اور دلیل پیش نہ کرے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو تازیانے مارے جو کثرت سے احادیث بیان کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ دوسی سے کسی نے پوچھا کہ آپ اتنی زیادہ حدیثیں کیوں بیان کرتے ہیں؟ کیا آپ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی ایسا ہی کرتے تھے؟

انہوں نے جواب دیا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایسا کرتا تو وہ اپنی چھڑی سے میری خبر لیتے۔[۱]

محمد بن احمد ترکمانی المعروف حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ رحلت رسولؐ کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ نے دیکھا کہ لوگ رسول اللہؐ سے احادیث نقل کرتے ہیں تو آپ نے ان کو جمع کر کے کہا: تم ایسی احادیث بیان کرتے ہو جن کے بارے میں خود تم میں اختلاف ہے۔ شاید تمہارے بعد لوگوں میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا۔ لہٰذا رسول اللہؐ سے کوئی حدیث نقل نہ کرو۔ اگر تم سے اس کے بارے میں پوچھا جائے تو کہو ہمارے تمہارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے۔ جو کچھ اس میں حلال ہے اس کو حلال اور جو کچھ اس میں حرام ہے اس کو حرام سمجھو۔

اسی کتاب میں قرظہ بن کعب انصاریؓ سے روایت ہے:

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۰۸، شیخ خضری

''جب حضرت عمرؓ نے ہمیں عراق بھیجا تو وہ کچھ دور تک ہمارے ساتھ آئے اور ہم سے کہا: تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں چل رہا ہوں؟ ہم نے کہا کہ ہماری عزت افزائی کے لئے۔ انہوں نے کہا: ہاں! پھر بولے کہ تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو قرآن سے بہت مانوس ہیں اور ہمیشہ اس کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ تم کہیں انہیں احادیث میں لگا کر قرآن سے نہ چھڑا دینا۔ حدیث کو رہنے دو اور رسول اکرمؐ سے روایت کم کرو۔ میں اس کام میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب قرظہ عراق پہنچے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ ہمیں رسول اللہؐ کی حدیثیں سناؤ۔ قرظہ نے کہا کہ خلیفہ عمرؓ نے ہمیں احادیث روایت کرنے سے منع کیا ہے۔''

جب حضرت ابی بن کعبؓ نے بیت المقدس کی تعمیر سے متعلق روایت بیان کی تو حضرت عمرؓ نے انہیں سرزنش کی اور مارنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت ابیؓ نے انصاریوں کی ایک جماعت کو بطور گواہ بلا لیا۔ جب انہوں نے شہادت دی کہ انہوں نے بھی یہ حدیث لسان رسولؐ سے سنی ہے تب حضرت عمرؓ نے حضرت ابیؓ کو چھوڑا۔

حضرت ابیؓ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا: کیا آپ مجھ پر یہ تہمت لگاتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے منسوب کر کے غلط حدیث بیان کی ہے؟

حضرت عمرؓ نے کہا: يَا اَبَا الْمُنْذِرِ ! وَاللّٰهِ مَا اتَّهَمْتُکَ عَلَيْهِ وَلٰكِنِّي كَرِهْتُ اَنْ يَّكُوْنَ الْحَدِيْثُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِؐ ظَاهِرًا ابو منذر! خدا کی قسم! میں تم پر تہمت نہیں لگاتا مگر احادیث کا بیان کرنا مجھے پسند نہیں۔[۱]

ایسی مثالیں بکثرت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کے قبول کرنے میں بڑی سختی کی جاتی تھی اور احادیث روایت کرنے سے منع کیا جاتا تھا۔ اس معاملے میں حضرت عمرؓ خاص طور پر بہت سختی کرتے تھے۔ اس کی تائید اس جواب سے ہوتی ہے جو حضرت عمرؓ نے حضرت ابیؓ کو دیا تھا کہ ''مجھے احادیث کا بیان کرنا پسند نہیں۔''

۱۔ السنة قبل التدوین ص ۹۷ و ۱۱۵، از ڈاکٹر محمد عجاج خطیب اور تاریخ التشریع ص ۱۰۸

جو صحابہ کرام احادیث بیان کرنے سے منع کرتے تھے ان کی دو دلیلیں تھیں۔
(۱) ایک اس بات کا خوف کہ کوئی غلط بات رسول اکرمؐ سے منسوب نہ کردی جائے جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔
(۲) دوسرے یہ اندیشہ کہ کہیں مسلمان حدیث میں مشغول ہو کر قرآن کو نہ چھوڑ دیں جیسا کہ حضرت قرظہؓ اور حضرت عمرؓ کی گفتگو سے مترشح ہوتا ہے۔

محمد عجاج خطیب السنۃ قبل التدوین کے صفحہ ۹۶ لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ قرآن مجید کی حفاظت کے خیال سے سنت کے معاملے میں اتنی سختی کرتے تھے۔ ان کو اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ روایات میں مشغول ہو کر قرآن مجید سے غافل نہ ہو جائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان قرآن مجید کو بخوبی حفظ کریں اور اس کے بعد احادیث کی طرف جو ابھی تک جمع نہیں ہوئی تھیں، توجہ کریں۔'' [۱]

بہرحال تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث کی تدوین حدیث کے مطالعے اور حدیث کو نقل کرنے کی مخالفت کا پرچم خلیفہ دوم نے بلند کیا تھا اور وہ اس معاملے میں بہت سختی سے کام لیتے تھے۔ جو لوگ کثرت سے احادیث بیان کرتے تھے انہیں سزا دیتے تھے۔ انہوں نے سب کو اس سلسلے میں متنبہ کیا تھا۔ ان کے اس طرز عمل کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ انہوں نے ابی بن کعبؓ سے کہا تھا مجھے احادیث رسولؐ کا بیان کرنا پسند نہیں۔ یہ بات ایسی ہے کہ اس سے کچھ شبہ اور سوال پیدا ہوتا ہے، خصوصاً اس لئے کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد جب مسلمان بہت سے نئے نئے مسائل سے دوچار تھے اس وقت انہیں قانونی نصوص کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت تھی۔ مسلمانوں کی پوری زندگی میں انقلاب آجانے کے باعث انہیں اپنے مسائل کے حل کے لئے سنت نبوی کی رہنمائی اور بھی زیادہ درکار تھی۔

اس طرح سوال کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ شاید اس قدر سختی کی وجہ کچھ سیاسی مصلحت ہوگی۔ شاید یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ ان کے سیاسی مخالفین کی برتری کے متعلق رسول اکرمؐ کے ارشادات عالیہ پھیلنے نہ پائیں۔

مختصر یہ کہ احادیث نقل کرنے پر سختی اور صحابہ کرام کا اپنے اجتہاد پر بھروسہ ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے احکام کے بارے میں خود صحابہ کرام میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ نمونے کے طور پر ہم ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں۔

امام علیؑ نے فتویٰ دیا تھا کہ اگر کسی حاملہ عورت کا شوہر مرجائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ عدت کی دو مدتوں میں سے ایک پوری کرے۔ اگر چار مہینے دس روز کی مدت ختم ہونے سے پہلے وضع حمل ہوجائے تب بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ مدت پوری کرے لیکن اگر یہ مدت پوری ہوجائے اور وضع حمل نہ ہو تو اس کے لئے وضع حمل تک عدت گزارنا لازمی ہے۔ ممکن ہے امام علیؑ نے مندرجہ ذیل دو آیتوں سے جن میں شوہر کے مرجانے یا الگ ہوجانے پر عورت کی عدت کا بیان ہے یہ حکم دیا ہو: ''حمل والیوں کی عدت یہ ہے کہ ان کو وضع حمل ہوجائے۔'' (سورۂ طلاق: آیت۴) '' تم میں سے جو فوت ہوجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک روکے رکھیں۔'' (سورۂ بقرہ: آیت۲۳۴)

ان دو آیتوں میں حاملہ عورت کی عدت کے بارے میں تعارض ہے۔ پہلی آیت کہتی ہے کہ حاملہ کی عدت وضع حمل کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ دوسری آیت کہتی ہے کہ شوہر کی موت کے بعد چار مہینے اور دس دن جب تک نہ گزر جائیں عدت ختم نہیں ہوتی۔ تعارض کی صورت میں جمع بین الدلیلین اصول فقہ کا مشہور قاعدہ ہے۔ اسی کے مطابق امام علی علیہ السلام نے فتویٰ دیا تھا۔

اس کے برخلاف حضرت عمرؓ کا فتویٰ یہ تھا کہ حاملہ عورت کی عدت ہر صورت میں وضع حمل کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔ انہوں نے سبیعہ بنت حارث اسلمیہ والی روایت پر اعتماد کیا۔ سبیعہ کے شوہر کی موت سے ۲۵ دن کے بعد اس کے بچہ پیدا ہوگیا تھا اور رسول اللہؐ نے اس کی عدت کے ختم ہوجانے کا حکم فرمایا تھا۔

شیخ خضری تاریخ التشریع الاسلامی میں لکھتے ہیں:

''حضرت علیؓ نے اپنے فتوے میں ان دونوں آیتوں پر جمع بین الآیتین

کے قاعدے پر عمل کیا تھا[1] اور یہ کہ صحابہ کرام کے درمیان اختلاف کی ایک اور مثال جو بعض روایات میں آئی ہے یہ ہے کہ کسی شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا لیکن اس کا مہر مقرر نہیں کیا اور ہمبستری سے قبل ہی مرگیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے فتویٰ دیا کہ اس عورت کو مہر مثل ملے گا یعنی اتنا مہر جتنا کہ اس جیسی عورتوں کا عموماً ہوتا ہے لیکن ابن مسعودؓ کو اس حکم میں تردّد تھا اور وہ ڈرتے تھے کہ کہیں یہ حکم غلط نہ ہو مگر جب معقل بن سنان اشجعیؓ نے جو ایک صحابی تھے، انہیں بتلایا کہ خود رسول اکرمؐ نے ایک موقع پر ایسا ہی حکم دیا تھا تو انہیں اطمینان ہوگیا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس معاملے میں ان سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ اس عورت کو عدت گزارنی ہوگی اور اسے شوہر کے مال سے میراث بھی ملے گی لیکن اس کا کوئی مہر نہیں ہوگا۔'' [2]

تاریخ فقہ و تدوین حدیث کی کتابوں میں اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے واضح ہوجاتا ہے کہ اکثر صورتوں میں امام علیؑ کی رائے بہت سے

۱۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امام علی کا فتویٰ قرآن کی ایک آیت واولات الاحمال[۱۲] میں تصرف کے بعد لاگو ہوا ہے۔ امام نے دونوں آیتوں پر عمل نہیں کیا تھا جیسا کہ شیخ خضری نے تاریخ التشریع الاسلامی میں دعویٰ کیا ہے۔ مذکورہ آیت میں تصرف کے جائز ہونے کی وجہ وہ قوت ظہور ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۴ میں موجود ہے۔ (مصنف)

علامہ اقبال نے ۲۴ر اپریل ۱۹۲۶ء کو ایک خط کے ذریعے علامہ سید سلیمان ندوی سے پوچھا تھا ''امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جاسکتا۔ اس مسئلے کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اصول محض ایک قاعدہ شہادت ہے یا جزو قانون ہے۔ اس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ... بعض مقدمات میں یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان بچہ جو فقہ اسلامی کے رو سے ولد الحلال ہے ایکٹ شہادت کی رو سے ولد الحرام قرار دیا جاتا ہے۔'' ندوی نے اقبال کو جواب میں لکھا تھا: اس کی اساس ایک تو حضرت عائشہؓ کا قول ہے جو دارقطنی میں ہے۔ دوسرے طبی تجربہ ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اکثر مدت حمل چار برس ہے۔ (ہدایہ) (کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم صفحہ ۴۷۵ مرتبہ سید مظفر حسین برنی)

۲۔ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۱۷

صحابہ سے مختلف ہوتی تھی کیونکہ ان احکام کے بارے میں ان صحابہ کی رائے فقہی اصولوں کے مطابق نہیں تھی۔ یہ سب گڑبڑ لازمی نتیجہ تھا اس بات کا کہ احادیث نبوی قبول کرنے میں سختی سے کام لیا گیا اور اپنے اجتہاد اور قیاس کو ترجیح دی گئی۔

جن مسائل میں علت مشترک نظر آئی یا جن باتوں کا مقصد اور فائدہ یکساں معلوم ہوا ان کے بارے میں ایک ہی طرح کا حکم دیدیا گیا۔ اس اصول کی بنیاد اس بات پر تھی کہ شارع مقدس نے ملتے جلتے مسائل میں ایک ہی طرح کا حکم دیا ہے اور جن مسائل میں کوئی مشابہت اور مماثلت موجود نہیں تھی وہاں حکم بھی مختلف دیا ہے۔

حالانکہ معلوم ہے کہ بعض موقعوں پر ملتے جلتے مسائل میں بھی حکم مختلف ہے اور بعض مواقع پر کوئی مماثلت نہ ہونے کے باوجود مختلف مسائل میں یکساں حکم دیا گیا ہے۔[1] یہی وجہ تھی کہ ابتدائے اسلام میں بعض فقہاء نے قیاس سے منع کیا تھا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ قیاس کے نتیجے میں کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرا دیا جائے۔

جو لوگ قیاس پر عمل کرتے ہیں ان کو مخاطب کر کے شعبی کہتے ہیں:

''جب تم نے حدیث کو چھوڑ کر قیاس کو اختیار کرلیا تو تم تباہ ہوگئے۔''[2]

یہی بات اس اجماع پر بھی صادق آتی ہے جو خضری اور دوسرے لوگ صحابہ سے منسوب کرتے ہیں کیونکہ اس طرح کا اجماع نہ تو کسی مسئلے میں اختلاف کو مانع ہے اور نہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس اجماع کے مخالف کوئی اور اجماع نہ ہو۔ کیونکہ اجماع کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ صحابہ کا کوئی گروہ کسی مسئلے کے بارے

۱۔ فقہائے کرام نے ''ایک جیسے افعال'' میں ''حکم مختلف ہونے'' کی بناء پر تھوڑے مال کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا اور کثیر مال غصب کرنے پر ہاتھ نہ کاٹنے کا فتویٰ دیا ہے اور ''مختلف افعال'' مثلاً انسان کو قتل کرنے، عمداً رمضان کا روزہ توڑنے اور اپنی بیوی سے ظہار کرنے پر ''ایک جیسے کفارے'' کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ اول الذکر میں قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ ''حکم ایک ہوتا'' اور مؤخر الذکر میں تینوں افعال کا ''حکم مختلف ہوتا۔'' (مصنف)

۲۔ ابطال القیاس ص ۷۰، از ابن حزم تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۲۴۶، از ڈاکٹر محمد یوسف

میں کسی ایک رائے پر متفق ہو جائے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا اجماع میں تمام صحابہ کا متفق الرائے ہونا شرط نہیں سمجھا جاتا۔

اگر رسول اکرمؐ کے بعد مقتدر حلقے قانون سازی کا کام امام علیؑ کے سپرد کر دیتے اور خود حکومت پر قناعت کر کے امور مملکت کے انتظام و انصرام سے سروکار رکھتے تو امام علیؑ وہ اختلافات نہ ہونے دیتے جو احادیث اور احکام کے بارے میں پیش آئے اور نہ قیاس کی ضرورت پڑتی جس کے نتیجے میں کبھی کبھی کوئی حلال حرام یا حرام حلال ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ابن مسعودؓ، شعبی اور دوسروں نے اس بارے میں صراحت سے بیان کیا ہے۔ بلکہ اجماع کی بھی مطلق ضرورت نہ پڑتی جو اگرچہ کم لیکن بعض مسائل میں بیان کیا جاتا ہے۔

بہرکیف امام علیؑ یہ اپنی ذمہ داری اور اپنا فرض سمجھتے تھے کہ جب انہیں امور مملکت سے علیحدہ رکھا گیا ہے اور یہ ذمہ داری حضرت ابوبکرؓ اور دوسروں نے سنبھال لی ہے تو وہ خود اسلام کی اشاعت، احکام کی تعلیم اور افتاء و قضاء کے کاموں کی طرف توجہ کریں۔ مسلمان امام علیؑ ہی سے آ کر کتاب اللہ اور دین اسلام کی تعلیم حاصل کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کو بھی آپ کے علم و تفقہ کی تعریف کرنی پڑی اور یہ کہنا پڑا کہ "جب علیؑ مسجد میں موجود ہوں تو تم میں سے کوئی فتویٰ نہ دے۔" اور "میں اس وقت باقی نہ رہوں جب مشکل کو حل کرنے کیلئے علی (ع) نہ ہوں۔" اور "اگر علی (ع) نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول تو کوئی بھی مسلمان بھولا نہیں تھا کہ اَقْضَاکُمْ عَلِیٌّ "تم میں بہترین فیصلہ دینے والے علیؑ ہیں۔"

انہیں وہ دعا بھی یاد تھی جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت دی تھی جب آپ نے امام علیؑ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَلْبَہٗ وَثَبِّتْ لِسَانَہٗ "اے اللہ! اس کے دل کو صحیح راستہ دکھا اور اس کی زبان کو مضبوطی عطا فرما۔"

جب وَتَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (سورۂ حاقہ آیت ۱۲) نازل ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یہ علیؑ کے کان ہیں۔"

یہ سب باتیں مسلمانوں کو معلوم تھیں اور ان کا ایمان تھا کہ امام علیؑ کو احکام بیان کرنے اور مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے میں ان گرانقدر دعاؤں کی بہترین تائید حاصل ہے۔ ان ہی دعاؤں کی وجہ سے خود امام علیؑ کو بھی اپنے فیصلوں پر اطمینان اور اعتماد تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: مَا شَكَكْتُ فِيْ قَضَاءٍ بَيْنَ اثْنَيْنِ "دو آدمیوں کے درمیان کسی تنازعہ کا فیصلہ کرنے میں مجھے کبھی تردّد نہیں ہوا۔"

گو بعض لوگوں نے سیاسی مصلحتوں کی بناء پر علی علیہ السلام کی خلافت و وصایت کے بارے میں احادیث کو بھلا دیا تھا لیکن وہ یہ نہیں بھول سکے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا:

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔ جو شہر علم میں داخل ہونا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ دروازے سے آئے۔"

اسی طرح رسول اکرمؐ کی بارگاہ اقدس میں آپ کو جو تقرب حاصل تھا نہ تو اس کا انکار کیا جا سکتا تھا، نہ آپ کے علم کی وسعت کا اور نہ آپ کے اس قول کی صداقت کا کہ آپ اپنے بارے میں خود فرماتے ہیں: "رسول اکرمؐ نے مجھے علم کے ایسے ہزار باب تعلیم کئے کہ ان میں سے ہر ایک سے علم کے اور ہزار باب کھل گئے۔"

ان میں سے کسی بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ رسول اکرمؐ سے امام علیؑ کی قرابت اور رسول اکرمؐ کے لئے آپ کی جاں نثاری اور فداکاری کا علم بھی سب کو تھا۔ اور یہ بھی سب جانتے تھے کہ آپ کو اسلامی احکام اور قرآنی اسرار سے کیسی وسیع اور عمیق واقفیت ہے۔ اس لئے لوگ مجبور تھے کہ آپ کی طرف رجوع کریں اور آپ کی رائے پر پورا اعتماد کریں۔

امام علیؑ بھی یہ ضروری سمجھتے تھے کہ لوگوں کو احکام کی تعلیم دینے، اسلام کے

پیغام کی اشاعت کرنے اور حدیث اور فقہ کی تدوین کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ سب سے پہلا اہم کام جس کو انجام دینے کا آپ نے ارادہ کیا وہ تھا قرآن مجید کی جمع آوری۔ اس کے مشکل مقامات کی تفسیر اور اس کے متشابہات کی توضیح۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں کاتبین وحی کے ذریعے سے قرآن مجید متفرق تختیوں اور نوشتوں پر لکھا گیا تھا لیکن آپ کے زمانۂ حیات میں ایک کتاب کی صورت میں جمع نہیں ہوا تھا۔ ابن شہرآشوب کہتے ہیں:

''اسلام میں سب سے پہلے جنہوں نے کتاب مدوّن کی وہ امیرالمومنین امام علی علیہ السلام تھے اور وہ کتاب ''قرآن مجید'' تھی۔[1]

ابن ندیم نے الفہرست میں نقل کیا ہے کہ امیرالمومنین امام علی بن ابی طالبؑ کے مصحف میں قرآنی سورتیں ترتیب وار درج تھیں۔ ابن ندیم کی روایت ہے کہ ابن منادی نے بیان کیا ہے کہ حسن بن عباس، عبدالرحمٰن بن ابی حماد سے، وہ حکم بن ظہیر سدوسی سے، وہ عبدخیر سے روایت کرتے ہیں کہ وفات رسولؐ کے بعد امام علیؑ نے دیکھا کہ لوگ پریشان ہیں تو آپ نے قسم کھائی کہ میں اس وقت تک اپنی عبا نہیں پہنوں گا جب تک قرآن جمع نہ کرلوں۔ اس کے بعد تین دن تک آپ اپنے مکان ہی میں رہے یہاں تک کہ قرآن جمع کرلیا۔ آپ نے اپنے حافظے سے قرآن جمع کیا تھا اور آپ کا مرتب کردہ یہ مجموعہ خاندان جعفرؑ کے پاس تھا۔

علامہ سید محسن امین نے اعیان الشیعہ، جلد اول میں سیوطی کی اتقان سے نقل کیا ہے کہ ابن حجر کہتے ہیں کہ روایت ہے کہ حضرت علیؑ نے وفات رسولؐ کے بعد قرآن کو ترتیب نزولی کے مطابق جمع کیا تھا۔ محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ اے کاش! یہ کتاب جو علم و دانش سے پُر تھی، میرے ہاتھ لگ جاتی۔

ابن شہرآشوب مناقب میں لکھتے ہیں کہ اہلبیتؑ کی روایات میں آیا ہے کہ

۱۔ اعیان الشیعہ جلد اول۔ شیعہ اکابرین کی زندگی پر یہ کتاب ۵۰ جلدوں میں لکھی گئی ہے۔

امام علی علیہ السلام نے قسم کھائی تھی کہ بجز نماز کے وقت کے میں اپنی عبا نہیں پہنوں گا جب تک کہ قرآن مجید کو جمع نہ کرلوں۔ اعیان الشیعہ میں ہے کہ سنی عالم شیرازی نے اپنی حدیث وتفسیر میں اور ابو یوسف یعقوب نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْآنَهٗ آپ اس قرآن کو لینے کیلئے جلدی جلدی اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے اس کا جمع کردینا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔" (سورۂ قیامت: آیت ۱۶ اور ۱۷) کی تفسیر میں ابن عباسؓ کہتے ہیں:

"اس آیت میں خدا نے اپنے رسولؐ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کے بعد علیؑ قرآن مجید کو جمع کریں گے۔ چنانچہ خدا نے قرآن مجید کو امام علیؑ کے دل میں محفوظ کردیا اور انہوں نے وفات رسولؐ کے چھ مہینے کے اندر اسے جمع کردیا۔"

اس کے بعد ابو یوسف یعقوب کہتے ہیں کہ ابورافع کی روایت ہے کہ

"رسول اکرمؐ نے اپنے مرض الموت میں امام علیؑ سے فرمایا:

اے علیؑ! یہ خدا کی کتاب ہے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چنانچہ امام علیؑ اسے ایک کپڑے میں اکٹھی کر کے اپنے گھر لے آئے۔ وفات رسولؐ کے بعد امام علیؑ اپنے گھر میں رہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تھا اس کے مطابق قرآن مجید کو جمع کیا۔ امام علیؑ اس کے نزول کی ترتیب سے واقف تھے۔"

علامہ شرف الدین "المراجعات" میں لکھتے ہیں:

"امام علیؑ نے قرآن مجید کو اس کے نزول کی ترتیب کے مطابق جمع کیا اور اس کے عام وخاص، مطلق ومقید، محکم ومتشابہ، ناسخ ومنسوخ، امر واباحت اور مستحبات و آداب کو بیان کیا۔ آیات کی شان نزول کی وضاحت کی۔ قرآنی علوم کی ساٹھ اقسام تحریر میں لائے اور ہر ایک کی ایک ایک مثال بیان کی۔"

اعیان الشیعہ میں آیا ہے کہ امام علیؑ نے قرآنی علوم کو ساٹھ اقسام پر تقسیم کیا تھا۔ اس کے بعد مصنف موصوف نے یہ سب اقسام گنوائی ہیں اور جس طرح امام علیؑ

سے روایات میں مروی ہے اسی کے مطابق کتاب اللہ سے ان کی مثالیں دی ہیں۔
اس کے بعد علامہ لکھتے ہیں:

''جب امام علیؑ سے ناسخ ومنسوخ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:
''اللہ نے ہمیشہ اپنے پیغمبروں کو لوگوں کا ہمدرد اور ان پر مہربان بنا کر مبعوث کیا ہے۔
اسی مہربانی اور ہمدردی کی ایک صورت یہ تھی کہ رسول اکرمؐ نے اپنی نبوت کی ابتداء میں اپنی قوم کی عادتوں اور ان کے طور طریقوں کو اس وقت تک نہیں بدلا جب تک اسلام نے ان کے دلوں میں گھر نہیں کرلیا، اور اللہ کا دین ان کے باطن میں نہیں سما گیا۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب کوئی عورت زنا کرتی تھی تو اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے اس پر پہرا بٹھا دیتے تھے یہاں تک کہ وہ مرجاتی تھی اور اگر کوئی مرد زنا کرتا تھا تو اس کا معاشرتی بائیکاٹ کردیتے، اسے برا بھلا کہتے، زجرو توبیخ کرتے اور اذیت دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ قرآن مجید میں ہے کہ ''(اے مسلمانو!) تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں ان پر اپنے میں سے چار آدمی گواہ کرلو۔ سو اگر وہ گواہی دیدیں تو ان عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردے یا اللہ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکال دے۔ اور جو دو مرد تم میں سے بدکاری کریں، انہیں اذیت پہنچاؤ۔ پھر اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے تعرض نہ کرو۔ بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔'' (سورۂ نساء: آیت ۱۵ و ۱۶) اس کے بعد جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی، اسلام نے طاقت پکڑلی اور لوگ جاہلیت کے طریقوں سے بیگانہ ہوگئے تو یہ آیت نازل ہوئی ''بدکار عورت اور بدکار مرد دونوں کو سو سو کوڑے مارو'' (سورۂ نور: آیت ۲) اس آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کردیا۔ مندرجہ بالا حدیث میں نسخ کی تمام صورتوں کا بیان ہے۔ اسی طرح ساٹھ علوم کو بیان کیا گیا ہے۔''

(اعیان الشیعہ۔ مکمل حدیث علامہ مجلسی کی بحارالانوار میں موجود ہے)۔

اہلبیتؑ کی احادیث میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ امام علیؑ پہلے شخص تھے جنھوں نے قرآن کو نزول کی ترتیب کے مطابق جمع کیا۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ امام علیؑ نے قرآن کی تفسیر کی اور اس کے مشکل مقامات کی تشریح کی۔ بعض[۱] محدثین نے کہا ہے کہ رحلت رسولؐ کے بعد سب سے پہلے امام علیؑ نے قرآن جمع کیا تھا جبکہ بعض دوسرے سنی محدثین نے لکھا ہے کہ عہد ابو بکرؓ میں زید بن ثابتؓ نے قرآن کو جمع کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔[۲]

شیخ محمد خضری لکھتے ہیں: ''قرآن مجید کے ضائع ہوجانے کے خوف سے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے قرآن مجید کو جمع کرنے کی تجویز پیش کی۔ جب جنگ یمامہ میں مہاجرین و انصار میں سے متعدد حفاظ قرآن قتل ہوگئے اور اس بات کا اندیشہ لاحق ہوا کہ آئندہ ہونے والی جنگوں میں باقی حفاظ بھی شہید ہوجائیں گے تو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ سے کہا کہ قرآن مجید کو جمع کرلیا جائے۔ حضرت زیدؓ کو اس کام کی انجام دہی میں بڑی دشواری پیش آئی لیکن بالآخر انہوں نے ایک مجموعہ تیار کرلیا اور قرآنی آیات کو ایک دوسری سے مربوط کیا۔ یہ نسخہ حضرت حفصہؓ کی تحویل میں تھا۔ جب قرآن مجید کے حفاظ اور قاری مختلف شہروں میں پھیل گئے اور وہاں انہوں نے لوگوں کے سامنے قرآن پڑھا تو بعض آیات کے الفاظ میں

۱۔ آیت اللہ خوئی رضوان اللہ علیہ جمع و تدوین قرآن کے زیر عنوان البیان فی تفسیر القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کرام کی زندگی کا بغور مطالعہ کرے گا اسے یہ علم اور یقین حاصل ہوجائے گا کہ قرآن مجید رسول اکرمؐ کے عین حیات ہی میں جمع کرلیا گیا تھا۔ حدیث اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قرآن عصر رسولؐ میں کتابی صورت میں موجود تھا کیونکہ اس حدیث میں قرآن کو کتاب سے تعبیر کیا گیا ہے اور آپ نے اس کتاب کو بطور امانت امت کے لئے چھوڑا ہے۔

۲۔ تفصیلی اور تحقیقی بحث کے لئے سید محمد علی ایازی کی کتاب مصحف امام علیؑ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی ملاحظہ فرمائیں۔

اختلاف پیدا ہوگیا۔ حضرت حذیفہؓ جو ایک لشکر کے ساتھ لڑائی پر آرمینیا اور آذربائیجان کی طرف گئے تھے، یہ اختلاف دیکھ کر رنجیدہ ہوگئے۔ واپسی پر انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اس سے پہلے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح مسلمانوں میں بھی اختلافات رونما ہوجائیں آپ اس کا کچھ تدارک کریں۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ قرآن مجید کی جو تحریریں تمہارے پاس ہیں وہ ہمیں بھیج دو تاکہ ہم ان کی نقلیں تیار کرالیں۔ بعد میں ہم یہ تحریریں واپس کردیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ تحریریں بھیج دیں۔ حضرت عثمان نے حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن عاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حرث بن ہشامؓ کو حکم دیا کہ قرآن مجید کی نقول تیار کریں چنانچہ انہوں نے چند نسخے تیار کیے۔ حضرت عثمانؓ نے ان تین قریشیوں سے کہا کہ جہاں تمہارے اور حضرت زیدؓ کے درمیان کچھ اختلاف ہو اسے قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ قرآن مجید ان ہی کی زبان میں اترا ہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اصل نسخہ کی کئی نقلیں تیار کرلیں۔ حضرت عثمانؓ نے اصل نسخہ حضرت حفصہؓ کو واپس بھجوا دیا اور ایک ایک نقل ہر اسلامی مرکز کو روانہ کردی اور حکم دیا کہ اگر کہیں اس سے مختلف کوئی قرآنی تحریر ہو تو اسے نذر آتش کردیا جائے۔ یہ کام ۲۵ھ میں انجام پایا۔"[۱]

اس روایت سے یہ بات تو طے ہوجاتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ نے جس کام کا حضرت زیدؓ کو حکم دیا تھا، بشرطیکہ یہ بات سچ ہو، وہ ان تختیوں کا جمع کرنا نہیں تھا جن پر زمانہ رسولؐ میں قرآن مجید اس وقت لکھا گیا تھا جب وہ نازل ہورہا تھا کیونکہ یہ دونوں ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تختیاں ضائع ہوجائیں اور حافظان قرآن بھی قتل ہوجائیں۔ صحیح بخاری کی روایت سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تختیوں کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کرنے کا کام ۲۵ھ سے پہلے انجام

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی، بحوالہ صحیح بخاری نقل از مالک بن انس

نہیں پایا تھا بلکہ یہ کام حضرت حذیفہؓ کی تجویز پر اس وقت شروع ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ مختلف لوگ قرآن مجید کو مختلف طریقوں سے پڑھتے ہیں اور انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ مسلمانوں کے اس اختلاف کا کہیں وہی نتیجہ نہ ہو جو یہود و نصاریٰ کے اپنی کتابوں کے بارے میں اختلاف کا ہوا۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے چار آدمیوں کا انتخاب کیا جنہوں نے اپنے اجتہاد کی بنیاد پر قریش کے لہجے میں قرآن مجید کو دوبارہ لکھا اور وہ تمام تختیاں جن پر زمانۂ رسولؐ اور آپ کے بعد قرآنی آیات لکھی گئی تھیں جلادی گئیں۔ اس روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو کچھ ان چار اشخاص نے جمع کیا تھا اس میں اور جو کچھ مسلمانوں کے پاس پہلے سے موجود تھا اس میں کچھ فرق تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

چونکہ اس روایت کو اہل سنت کے محدثین نے بھی قبول کیا ہے اس لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں قدرے رک کر سوچیں۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کو جمع کرنے اور ان تحریروں کی جو حضرت زیدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت پر جمع کی تھیں، نقلیں تیار کرنے کا کام چار مسلمانوں کے سپرد کیا جن میں سے ایک حضرت زیدؓ تھے۔ دوسرے تین ایسے مسلمان تھے جو نوعمر تھے اور نزول قرآن کے زمانے میں موجود نہیں تھے۔ مسلمانوں میں اس وقت ایسے بزرگ صحابی بھی موجود تھے جن کو پہلی وحی کے وقت ہی سے رسول اکرمؐ کی بابرکت صحبت کا شرف حاصل تھا جیسے امام علیؑ، حضرت عمارؓ، حضرت ابوذرؓ۔ یہ لوگ حافظان و قاریان ہونے کے علاوہ قرآن مجید کے اسرار و رموز سے آشنا اور اس کی شان نزول سے بھی واقف تھے۔

بہرحال یہ چار آدمی ان تحریروں کو دوبارہ لکھنے پر مامور کئے گئے جو حضرت زیدؓ نے جمع کی تھیں اور جن کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس رکھوا دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں ہدایت کی کہ اگر باقی تین آدمیوں کا حضرت زیدؓ

سے کسی آیت میں اختلاف ہو تو اسے لغت قریش کے مطابق لکھیں۔ ان میں حضرت زیدؓ وہ شخص تھے جن کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے ان تختیوں کے جمع کرنے کے لئے موزوں اور قابل اعتماد سمجھا تھا جن پر وہ قرآنی آیات درج تھیں جو مختلف اوقات میں رسول اکرمؐ پر نازل ہوئی تھیں۔ بخاری کی روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چار آدمیوں کو خلیفہ وقت نے صرف ان تحریروں کو نقل کرنے کی ہدایت کی تھی جو حضرت حفصہؓ کے پاس موجود تھیں۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ دوسری تحریروں سے بھی مقابلہ کرتے اور اس لغت کو پیش نظر رکھتے جس میں عہد رسولؐ میں یہ تحریریں لکھی گئی تھیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ضرور آپ کو سنایا گیا ہوگا۔ اس لئے وہ اسی صورت میں نقل ہونا چاہئے تھا۔ حضرت عثمانؓ یا کسی اور شخص کو کسی خاص لغت کے انتخاب کا حق نہیں ہوسکتا تھا۔ قرآن مجید میں کوئی ایسا اشارہ موجود نہیں کہ قرآن مجید کسی خاص قبیلے کی بولی میں اترا ہو۔ جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید عرب کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ یوسف آیت ۲ میں اس کی تصریح ہے:

اِنَّا اَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا ''ہم نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے۔''

علمائے اہل سنت نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ اس کی تشریح میں کہا جاتا ہے کہ سات حروف سے مراد عرب کی مختلف بولیاں ہیں۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید عرب کی تمام بولیوں میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ بیشتر محققین اسی کے قائل ہیں۔ شیخ طبرسی نے بھی اپنی تفسیر کے مقدمے میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اس حدیث کی تشریح میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سات مختلف قرأتیں ہیں۔

بہرحال شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ہی حرف پر نازل ہوا ہے۔ شیخ جواد بلاغی کی تفسیر آلاء الرحمن میں متعدد روایات امام باقرؑ وامام جعفر صادقؑ

سے منقول ہیں جو اس شیعہ عقیدے کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ کافی میں فضیل بن یسار کی ایک روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: جھوٹ کہتے ہیں۔ خدائے واحد نے قرآن مجید ایک ہی حرف پر نازل کیا ہے۔''

بہرحال شیعوں کا اس پر اتفاق ہے کہ مشہور قرأتوں میں سے کسی بھی قرأت کے مطابق قرآن مجید پڑھنا جائز ہے۔ اور جو قرآن مجید اس وقت مسلمانوں کے پاس موجود ہے یہی قرآن ایک حرف کی کمی بیشی کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس میں کسی باطل کی آمیزش کا امکان نہیں۔ شیعہ کتابوں، علمائے شیعہ کے اقوال اور ائمہ اہلبیتؑ سے مروی صحیح احادیث میں اس کی تصریح ہے۔

یہ جو بخاری میں آیا ہے کہ خلیفہ نے حکم دیا کہ قرآن کے متفرق اور ناقص نسخے جلادیئے جائیں، یہ اس اصول کے منافی ہے جس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے یعنی یہ کہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے مطابق قرآن کی تعظیم اور احترام واجب ہے۔ اور یہ کہ قرآن کے ساتھ ہرگز کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جو لوگوں کی نظروں میں ناروا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کو جلانا اس کے احترام کے منافی ہے۔ یہ تحریریں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جلوادیں رسول اکرمؐ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں محفوظ رکھی گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دین اسلام کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔

ان تحریروں کو جلانے کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جو کچھ حضرت عثمانؓ کے منتخب کردہ ان چار اشخاص نے لکھا تھا اس میں اور جو قرآن مجید پہلے سے مسلمانوں کے پاس تھا اس میں کچھ فرق ہوگا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو لازمی تھا کہ مسلمان اس فعل کو قبیح سمجھتے اور اس کی مخالفت کرتے جیسا کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کی بعض دوسری

کارروائیوں کی مخالفت کی تھی اور ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جو تحریریں حضرت زیدؓ نے حضرت عثمانؓ کے حکم سے جلادیں وہ رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ میں لکھی گئی تھیں اور جب جمع کی گئیں تو بجنسہٖ باقی تھیں۔ رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ میں یہ تحریریں مسلمانوں کے درمیان رائج تھیں۔ اگر یہ تحریریں وحی الٰہی سے کچھ الگ ہوتیں تو یہ ممکن نہیں تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو ایک لحہ کے لئے بھی خاموشی سے برداشت کرتے۔

اسی طرح اگر وہ قرآن مجید جو ان چار آدمیوں نے ترتیب دیا تھا پہلی تحریروں سے مختلف ہوتا تو لوگ ضرور حضرت عثمانؓ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے اور جن موقعوں پر فرق تھا ان کی کچھ نہ کچھ نشان دہی حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں ہوتی۔ اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلی تحریریں اس لئے جلادی گئیں کہ حضرت عثمانؓ یہ چاہتے تھے کہ صرف ان کا مرتب کردہ قرآن لوگوں میں رواج پائے۔ لوگ اس کو پڑھیں اور کسی دوسرے کے جمع کردہ قرآن کی اشاعت کا امکان باقی نہ رہے۔ خصوصاً اس قرآن مجید کی اشاعت کا جو امام علیؑ نے اپنے دست مبارک سے ترتیب نزولی کے مطابق جمع کیا تھا اور اس کی بعض آیات کی خود رسول اکرمؐ سے سنی ہوئی تفسیر کے مطابق تشریح کی تھی اور شان نزول بیان کی تھی۔

بہرحال مندرجہ بالا حدیث سنی محدثین کے خیال میں صحیح ہے۔ اور ان کی معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ایسا کیا تھا۔ اہل سنت کی احادیث یہ بتلاتی ہیں کہ ۲۵ھ سے قبل قرآن مجید ایک کتاب کی شکل میں جمع نہیں ہوا تھا۔

لیکن اہلبیتؑ اور ان کے شیعوں کے نزدیک ثابت ہے اور بعض اہل سنت محدثین بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ امام علیؑ نے پندرہ سال قبل ہی قرآن کو ایک کتاب کی صورت میں اپنے قلم سے جمع کرلیا تھا۔ اور یہ اس زمانے کی بات تھی جب رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد انہیں خلافت کے امور سے دور رکھا گیا تھا۔

امام علیؑ کے لئے یہ ضروری بھی تھا کہ وہ قرآن کو جمع کرتے اور اس کی آیات اور سورتوں کو اس طرح مرتب کرتے جس طرح وہ نازل ہوئی تھیں کیونکہ قرآن ان کے گھر میں اور ان کے استاد اور مربی پر نازل ہوا تھا اور انہوں نے تمام قرآنی علوم وفنون ان ہی سے سیکھے تھے۔ ہم نے اس باب کے آغاز میں قابل اعتماد سنی مآخذ کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ وفات رسولؐ کے بعد آپ کے صحابہ نے پوری توجہ اس پر مبذول کی تھی کہ ان تمام تختیوں اور دوسرے نوشتوں کو جمع کریں جن پر قرآنی آیات رسول اکرمؐ کے زمانے میں لکھی گئی تھیں۔ جو آیات ان تختیوں میں نہ مل سکیں وہ حفاظ کے سینوں سے لے لی گئیں۔ حضرت زیدؓ جن کو حضرت ابوبکرؓ نے یہ کام سونپا تھا کہتے ہیں: "میں نے قرآن مجید کو لوگوں کے سینوں اور تمام تحریروں میں تلاش کیا یہاں تک کہ مجھے سورۂ برأت کا آخری حصہ صرف ابن خزیمہؓ کے پاس سے ملا۔ یہ حصہ کسی اور صحابی سے نہیں ملا۔"[1]

یہ بات مسلم ہے کہ احکام کے دو ماخذ کتاب اور سنت ہیں۔ ان ہی پر اسلام کی بنیاد اور اساس قائم ہے۔ صحابہ کرام نے اس خوف سے کہ کہیں قرآن مجید نابود نہ ہوجائے اس کے جمع کرنے کی تو کوشش کی لیکن سنت کے سلسلے میں جس کی اہمیت قانون شریعت میں قرآن سے کم نہیں کوئی مثبت کام انجام نہیں دیا حالانکہ سنت کے بغیر قانون شریعت مکمل نہیں ہوسکتا اور اسلام کی تعلیمات واضح نہیں ہوتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ اور تابعین کے دور میں بعض لوگوں نے سخت غلطیاں کیں۔

اس مقصد سے کہ قرآن مجید میں کسی کو دخل اندازی کا موقع نہ مل سکے صحابہ نے قرآنی آیات کی تختیوں اور تحریروں کو جمع کرنے کی پوری کوشش کی۔ مناسب یہ تھا کہ سنت کے بارے میں بھی ایسی ہی کوشش سے کام لیا جاتا اور احادیث اور آثار کو بھی جمع کرلیا جاتا تاکہ دروغ بافوں کے لئے راہ مسدود ہوجاتی خصوصاً جبکہ یہ معلوم

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی، ص۱۰۶، شیخ محمد خضری

تھا کہ قرآن مجید میں تمام تفصیلی احکام کا تذکرہ نہیں ہے۔ صرف عمومی قاعدے بیان کئے گئے ہیں اور جزئیات کی تشریح اور توضیح رسول اکرمؐ پر چھوڑ دی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم تھا کہ قول رسولؐ کی بھی وہی حیثیت ہے جو قرآن کی ہے کیونکہ اللہ کے رسولؐ ہوائے نفسانی سے کبھی کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ اس لئے احادیث کے ضائع ہوجانے یا ان میں کسی کی دخل اندازی کا نتیجہ احکام معلوم کرنے اور قرآنی آیات کو سمجھنے کے ضمن میں نہایت ناخوشگوار ہوتا۔ اہل سنت کے علماء یہ سب کچھ جانتے تھے اور کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ دین اسلام کی حفاظت میں دلچسپی بھی ظاہر کرتے تھے لیکن بجائے کوئی ایسا کام کرنے کے جس سے سنت اپنی تمام تابانی و درخشندگی اور پاکی و زیبائی کے ساتھ محفوظ رہے، خلیفۂ وقت نے جو مسلمانوں کے امور کا نگراں ہوتا ہے احادیث لکھنے کی اس بناء پر ممانعت کردی کہ یہود و نصاریٰ میں سے کچھ لوگوں نے کتاب الٰہی کے بجائے کچھ اور کتابیں لکھی تھیں اور ان میں مشغول ہو کر کتاب الٰہی کو فراموش کردیا تھا۔ خلیفہ وقت کو اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان بھی اسی راستے پر نہ چل نکلیں جو یہود و نصاریٰ نے اختیار کیا تھا۔[۱]

ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ میں قاسم بن محمد کی روایت ہے کہ بی بی عائشہؓ نے کہا:

''میرے والد نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ سو حدیثیں جمع کی تھیں۔ ایک روز رات کو سوتے میں بہت بے چین رہے۔ صبح ہوئی تو مجھ سے کہا کہ بیٹی! جو احادیث تمہارے پاس ہیں وہ لے آؤ۔ میں نے وہ احادیث لاکر انہیں دیدیں۔ انہوں نے آگ منگا کر انہیں جلادیا۔''[۲]

جامع بیان العلم و فضلہ میں ہے: ''حضرت عمر بن خطابؓ نے اس شخص کے کام پر سخت ناراضگی ظاہر کی جو دانیال کی کتابیں نقل کر رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی، تاریخ الفقہ الاسلامی اور اضواء علی السنۃ المحمدیۃ

۲۔ السنۃ قبل التدوین از محمد عجاج الخطیب ص ۳۰۹

کو اس کام سے منع کیا اور اس کو مارا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اس کی تحریریں ضائع کردی جائیں۔ پھر اس کو دانیال کی کتابیں پڑھنے یا دوسروں کو سنانے سے منع کردیا اور کہا کہ اگر مجھے اطلاع ملی کہ تو ان کتابوں کو پڑھتا ہے یا دوسروں کو سناتا ہے تو تجھے سزا دوں گا۔ اس کے بعد لوگوں سے کہا کہ اے لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس کچھ کتابیں آئی ہیں جو خدا کے نزدیک بہترین اور بالکل صحیح ہیں۔ تمہارے پاس جو کتاب بھی ہو وہ میرے پاس لاؤ تاکہ میں اس کے بارے میں رائے دے سکوں۔ راوی کہتا ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھا کہ حضرت عمرؓ یہ چاہتے ہیں کہ ان کتابوں کو دیکھ کر ایسی ترمیم کردیں کہ ان میں کوئی اختلافی بات نہ رہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتابیں ان کے پاس لے آئے۔ مگر حضرت عمرؓ نے ان کو جلوادیا اور کہا کہ ان میں اہل کتاب کے سے خیالات ہیں۔ ساتھ ہی سب شہروں کو لکھ بھیجا کہ جس کسی کے پاس ان کتابوں میں سے کوئی کتاب ہو وہ اس کو ضائع کردے۔"[۱]

ڈاکٹر محمد یوسف نے دو اور وجوہ کا ذکر کیا ہے جو حضرت عمرؓ کے ذہن میں اس وقت نہیں تھیں جب وہ احادیث جمع کرنے سے منع کررہے تھے۔ یہ دو دلیلیں سنی محدثین نے ان الفاظ میں نقل کی ہیں۔

اول: رسول اکرمؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ شَيْئًا سِوَى الْقُرْآنِ فَمَنْ كَتَبَ عَنِّيْ شَيْئًا سِوَاهُ فَلْيَمْحُهُ "بجز قرآن کے اور کوئی چیز میرے حوالے سے نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو وہ اسے ضائع کردے۔"

دوم: "خلیفہ اور ان کے ساتھی مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ راوی احادیث بیان کرنے میں کوئی غلطی نہ کریں یا کوئی جھوٹ رسول اکرمؐ سے منسوب نہ کردیں۔ اگر کوئی اس طرح کا مجموعہ وجود میں آجاتا تو وہ آئندہ بھی باقی رہتا۔"[۲]

۱۔ السنۃ قبل التدوین ص ۳۱۰ و ۳۱۱ از محمد عجاج الخطیب

۲۔ تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۱۷۲ از محمد یوسف موسیٰ

ڈاکٹر محمد یوسف اور بعض دوسرے مصنفین جنہوں نے فقہ اسلامی کی تاریخ کے موضوع پر لکھا ہے ان روایات کو غلط نہیں سمجھتے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حدیث جمع کرنے سے منع کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ جو شخص صدر اول کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرے گا اسے ایسی مثالیں ملیں گی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی دور میں تدوین حدیث کا آغاز ہو گیا تھا بلکہ خود رسول اکرمؐ کے زمانے میں بھی تدوین حدیث کی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً یمن کے رہنے والے ایک شخص نے آپ سے اس خطبہ کو لکھنے کی اجازت مانگی جو آپ نے فتح مکہ کے موقع پر دیا تھا۔ آپ نے اجازت دیدی اور فرمایا کہ لکھ لے۔ (صحیح بخاری، باب کتابة العلم)

ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے پاس ایک کتاب تھی جس کا نام الصادقه تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں انہوں نے فقط وہی لکھا ہے جو انہوں نے رسول اکرمؐ سے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ مدینہ ہجرت کے بعد رسول اکرمؐ نے حکم دیا کہ زکوٰۃ کے احکام، وہ چیزیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس کا نصاب لکھ لیا جائے۔ چنانچہ یہ سب دو ورق پر لکھا گیا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت ابوبکر بن عمر بن حزمؓ کے گھر میں محفوظ تھے۔[1]

رسول اکرمؐ اور ان کے بعد کے دور میں تدوین حدیث پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے علامہ سید سلیمان ندوی کی — جن کو وہ ہندوستان کا بہت بڑا عالم کہتے ہیں — رائے نقل کی ہے۔ وہ خود بھی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سید سلیمان ندوی نے جمع حدیث کے تین دور قرار دیئے ہیں:

پہلا دور: لوگوں کے پاس جو علمی معلومات تھیں انہوں نے ان کو جمع کیا۔

دوسرا دور: ہر اسلامی شہر میں وہاں کے علماء کے پاس علمی مسائل سے متعلق جو معلومات تھیں ان کو کتابوں اور مخصوص تصانیف میں یکجا کیا گیا۔

۱۔ تاریخ الفقه الاسلامی ص۱۷۳

تیسرا دور: تمام اسلامی علوم مختلف شہروں سے ضخیم کتابوں اور قیمتی تالیفات میں مدون کئے گئے۔ یہ تصانیف ہم تک پہنچی ہیں اور ہمیشہ سے ہمارا سرمایہ رہی ہیں۔

پہلا دور ۱۰۰ھ تک رہا، دوسرا دور ۱۵۰ھ تک اور تیسرا دور ۱۵۰ھ سے شروع ہو کر تیسری صدی ہجری تک باقی رہا۔ مصنف اس بحث سے یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ پہلے دور میں جو کچھ یکجا کیا گیا وہ دوسرے دور میں مدون ہوا اور جو کچھ دوسرے دور میں مدون ہوا، تیسرے دور میں اسے مختلف عنوانوں کے تحت مبوب (مختلف ابواب میں تقسیم) کیا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلا دور، مصنف کے نظریے کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے شروع ہو کر صحابہ کرام کے دور کے اختتام پر ختم ہوتا ہے اور جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے اور ڈاکٹر یوسف نے اس کی تائید کی ہے، اس دور میں کوئی مسئلہ یا حدیث مدون نہیں کی گئی بلکہ احکام اور احادیث کی تدوین کا کام ۱۰۰ھ اور ۱۵۰ھ کی درمیانی مدت میں انجام پایا۔

شیخ محمد خضری کہتے ہیں: ”اس کے باوجود کہ تابعین کے زمانے میں حدیثوں کی روایت بہت زیادہ ہوئی اور تابعین کی ایک جماعت ہمیشہ احادیث بیان کرنے میں مشغول رہی، اس دور میں احادیث کی تدوین قطعی نہیں ہوئی لیکن یہ صورت زیادہ مدت تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ چونکہ عام طور پر سب مسلمان سنت کے قائل تھے اور اسے قرآن کے ساتھ قانون شریعت کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو اس عقیدے کا مخالف ہو اس لئے ضروری تھا کہ اس کمی کو دور کیا جائے۔ جس کو سب سے پہلے اس کمی کا احساس ہوا وہ عمر بن عبدالعزیز تھے۔ ان کا زمانہ دوسری صدی ہجری کے اوائل کا تھا۔ انہوں نے مدینے میں اپنے گورنر ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم کو لکھا: ”جو احادیث نبوی موجود ہوں ان کو جمع کر کے لکھ لو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں علم اور عالم ختم نہ ہو جائیں۔“

نہیں ہوئی۔ چنانچہ ان کے زمانے میں اور ان کے بعد کے دور میں متعدد حدیث کے مجموعے وجود میں آگئے۔

ابن ندیم الفہرست میں لکھتے ہیں: ''شہر حدیثہ میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام محمد بن حسین تھا۔ اسے کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے پاس جو کتب خانہ تھا اس میں اتنی کتابیں تھیں جتنی میں نے کسی اور کے پاس نہیں دیکھیں۔ اس کتب خانے میں نحو، لغت اور ادب کی کتابیں اور قدیم نسخے تھے۔ میں نے اس سے کئی بار ملاقات کی اور آہستہ آہستہ اس سے دوستی کرلی۔ اس کے پاس جو کتابوں کا ذخیرہ تھا وہ اس کے بارے میں بنی حمدان سے خوفزدہ تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس پر قبضہ نہ کرلیں۔ ایک دفعہ اس نے مجھے کتابوں کی ایک بڑی الماری دکھائی جس کا وزن تقریباً ۳۰۰ رطل (۱۵۰ کلوگرام) تھا۔ یہ الماری چمڑے اور کاغذ پر لکھی ہوئی اور کھدی ہوئی نایاب تحریروں سے بھری ہوئی تھی۔ اس میں چینی اور حجازی کاغذ تھے اور چمڑے کے ٹکڑے تھے جن پر اشعار، قصیدے، علم نحو سے متعلق مسائل، حکایات، اخبار، لوگوں کے نام، ان کے شجرے اور دوسرے مضامین درج تھے۔ میں نے ان کا مطالعہ کیا تو بہت عجیب عجیب چیزیں دیکھنے میں آئیں جو وقت گزرنے کے ساتھ پرانی ہوکر نیست و نابود ہوگئی تھیں۔ جس جزو یا ورق، یا کسی صفحہ کا کوئی حصہ مٹا دیا گیا تھا اس پر کسی عالم کے دستخط موجود تھے۔ ان ہی میں ایک قرآن مجید تھا جو خالد بن ابی الہیاج کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ امیرالمومنینؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ اسی طرح امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کچھ چیزیں تھیں۔ ان ہی میں میں نے کچھ مکتوبات اور عہدنامے امیرالمومنینؑ اور دوسرے کاتبین وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دیکھے۔ ایک تحریر ایسی نظر پڑی جس میں ابوالاسود دؤلی[۱] (متوفی ۶۹ھ) کے بیان کئے ہوئے نحو کے کچھ مسائل درج تھے۔ یہ تحریر چار اوراق پر مشتمل تھی اور بظاہر چینی کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ اس میں ابوالاسود کی بیان کردہ فاعل اور مفعول کی بحث تھی۔

۱۔ ابوالاسود نے سب سے پہلے قرآن مجید پر اعراب لگوائے تھے۔ (دیکھئے: احیائے دین جلد دوم)

اس کے بعد شیخ محمد خضری کہتے ہیں: ''اس دور کے بزرگوں میں محمد بن مسلم بن شہاب زہری احادیث جمع کرنے میں سب سے نامور اور ممتاز ہوئے۔''

ہم نے اس سے قبل بیان کیا ہے کہ ڈاکٹر یوسف یہ نہیں مانتے کہ صحابہ کرام کے زمانے میں احادیث بالکل جمع نہیں کی گئی تھیں۔ وہ عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے اس دعوے کو صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے الصادقہ نامی کتاب مدون کی تھی۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ ہمارے چوتھے خلیفہ حضرت علی بن ابی طالبؓ کے پاس بھی ایک مجموعہ تھا جس میں کچھ احکام لکھے ہوئے تھے۔ بخاری نے اپنی سند سے روایت بیان کی ہے کہ ابوجحفہ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے؟ حضرت نے فرمایا: نہیں! سوائے کتاب اللہ کے جس کی سمجھ مجھے عطا ہوئی ہے۔ اور جو کچھ اس صحیفے میں ہے اس کے سوا میرے پاس کوئی کتاب نہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر یوسف لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس بھی ایک کتاب تھی جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے درج تھے۔

بہر حال جیسا کہ سنی محدثین اور دوسروں نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مہینے تک تدوین احادیث کے اچھے برے نتائج پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ مسلمانوں کو احادیث جمع کرنے سے روکا جائے۔ خلیفہ کا فرمان صادر ہونے کے بعد مسلمانوں نے احادیث کو جمع کرنا چھوڑ دیا اور احادیث یاد کرنے اور انہیں زبانی بیان کرنے پر اکتفا کرنے لگے۔ پہلی صدی ہجری کے اختتام تک یہی صورت حال رہی۔ اس مدت کے دوران مسلمان اسی کے مطابق فتویٰ دیتے رہے جو انہوں نے رسول اکرمؐ سے سنا تھا یا جس پر ان کا اپنا اجماع ہوگیا تھا۔ اس صورت حال کی وجہ سے بڑی گڑبڑ ہوگئی اور وضعی احادیث کی کثرت ہوگئی۔ بعض حکمرانوں نے جعلی احادیث کے ذریعے اپنی حکومت کی بنیاد مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

گو حضرت عمرؓ نے تدوین حدیث کو روکنے کی کوشش کی لیکن انہیں مکمل کامیابی

اس شخص کے انتقال کے بعد پھر اس الماری کا اور جو چیزیں اس میں تھیں ان کا کچھ پتا نہیں چلا اور نہ ان کے متعلق کچھ سننے میں آیا۔ میں نے ہر چند تلاش کی مگر ایک قرآن مجید کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔[۱]

محمد عجاج خطیب السنة قبل التدوین میں زور دے کر کہتے ہیں کہ صحابہ کرام نے تدوین حدیث سے کنارہ کشی نہیں کی۔ مثال کے طور پر انہوں نے بعض بزرگ صحابہ کے متعلق روایات بیان کی ہیں۔ان میں امام علیؑ، امام حسنؑ، حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ اور دوسرے صحابہ شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب احادیث لکھنے اور جمع کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کا شوق دلاتے تھے۔ انہوں نے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے بھانجے عروہ بن زبیرؓ سے کہا کہ بیٹے! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم حدیثیں لکھتے ہو۔ جاؤ لکھو۔ انہوں نے عروہ بن زبیرؓ کو اس کام سے منع نہیں کیا۔

ابن عباسؓ کہا کرتے تھے: قَيِّدُوا الْعِلْمِ بِالْكِتَابَةِ ”علم کو لکھ کر محفوظ رکھو۔“

دوسری روایات سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

بہر حال اہلبیت رسولؐ اور ان کے پیروکاروں کی روایات کے مطابق اور جیسا کہ بعض اہل سنت محدثین نے بھی کہا ہے یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ امام علیؑ اور بعض صحابہ نے جن کا شمار بزرگان شیعہ میں ہے، فقہی احکام جمع کئے تھے۔ شیعہ حدیث کی کتابوں میں ائمۂ اہلبیتؑ سے ایسی روایات بکثرت آئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ فقہی احکام امام علیؑ کو خود رسول اکرمؐ نے املاء کرائے تھے۔

اعیان الشیعہ اور المراجعات میں باوثوق شیعہ ذرائع سے منقول ہے کہ امام علیؑ نے ایک کتاب لکھی تھی جس کی لمبائی ۷۰ ذراع تھی۔ یہ کتاب رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو املاء کرائی تھی۔ یہ ایک چمڑے پر لکھی گئی تھی جس کو رَق کہا جاتا تھا اور جو

۱۔ فجر الاسلام، احمد امین ص ۱۶۷ اور السنة قبل التدوین ص ۳۱۶

اس زمانے میں عام طور پر لکھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ضروری ہے کہ یہ کتاب فقہ کے تمام ابواب پر حاوی ہو۔ ائمۂ اہلبیتؑ کی روایات میں کہیں اس کتاب کا تذکرہ جامعہ کے نام سے، کہیں کتاب علیؑ کے نام سے اور کہیں امام علیؑ کو رسول اکرمؐ کی املاء کردہ کتاب کے نام سے کیا گیا ہے۔

محمد بن حسن صفار کی بصائر الدرجات میں ہے کہ امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے بعض قابل اعتماد رفقاء جیسے سوید بن ایوب، ابوبصیر اور بعض دوسرے حضرات نے اسے امام کے پاس دیکھا ہے۔

علی بن اسماعیل نے علی بن قطان سے روایت کی ہے کہ ان سے سوید بن ایوب نے بیان کیا: "میں امام محمد باقر علیہ السلام کے پاس تھا۔ امام نے کتاب جامعہ منگائی اور اس پر نظر ڈالی۔"

بصائر الدرجات میں ہے کہ احمد بن محمد، علی بن حکم سے اور وہ علی بن ابی حمزہ سے روایت کرتے ہیں کہ ابونصر کہتے تھے: "امام محمد باقرؑ نے مجھے ایک کتاب دکھائی جس میں حلال و حرام اور واجبات کا بیان تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ امام نے فرمایا کہ یہ کتاب امام علیؑ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور اسے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے املاء کرایا تھا۔ پھر فرمایا کہ یہ جامعہ ہے۔"

بصائر ہی میں ہے کہ علی بن حسین، حسن بن حسین سجال سے اور وہ محمد بن ابراہیم سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے ابومریم نے کہا: "امام محمد باقرؑ فرماتے تھے کہ ہمارے پاس جامعہ ہے جس کا طول ستر ذراع ہے۔ اس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے یہاں تک کہ خراش کی سزا بھی۔ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی املاء کرائی ہوئی ہے اور امام علی علیہ السلام کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

بصائر ہی میں ہے کہ محمد بن حسن نے ابن محبوب سے انہوں نے ابن رئاب سے اور انہوں نے ابو عبیدہ سے روایت کی ہے کہ جامعہ کے متعلق دریافت کئے

جانے پر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ''جامعہ ایک کتاب ہے جس کا طول ستر ذراع ہے اور عرض رنگے ہوئے چمڑے کا ہے۔ دو کوہان والے اونٹ کی ران کے برابر۔ اس میں وہ سب مسائل بیان کئے گئے ہیں جن کی لوگوں کو ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو اس میں نہ ہو یہاں تک کہ خراش کی سزا بھی مذکور ہے۔''

اسی کتاب میں ابوبصیر سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا:

''میں ایک دفعہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو امام نے فرمایا: اے ابومحمد! ہمارے پاس جامعہ ہے۔ لوگوں کو کیا معلوم کہ جامعہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں آپ پر قربان! جامعہ کیا ہے؟ فرمایا: ایک کتاب ہے جس کا طول ذراع نبوی کے حساب سے ستر ذراع ہے (تقریباً ۳۵ گز)۔ یہ رسول اکرمؐ کی املاء کرائی ہوئی اور امام علیؑ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں سب حلال وحرام اور ہر اس چیز کا بیان ہے جس کی لوگوں کو ضرورت پیش آتی ہے یہاں تک کہ خراش کی سزا کا بھی ذکر ہے۔''

شیخ مفید کی کتاب'' مجالس'' میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

''ہمارے پاس جامعہ ہے جس کا طول ستر ذراع ہے۔ یہ رسول اکرمؐ کی املاء کرائی ہوئی اور امام علیؑ کے دست مبارک کی لکھی ہوئی ہے۔ بخدا اس میں وہ تمام مسائل ہیں جن کی لوگوں کو قیامت تک ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس میں خراش کی سزا اور ایک تازیانہ اور نصف تازیانہ سزا تک کا ذکر موجود ہے۔''

ائمۂ اطہارؑ سے مروی بعض روایات میں کتاب علیؑ کو جامعہ کہا گیا ہے۔

شیخ طوسی نے ابوایوب سے ایک روایت نقل کی ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا:

کتاب علیؑ میں ہے کہ اِنَّ الْعَمَّةَ بِمَنْزِلَةِ الْاَبِ پھوپھی بمنزلہ باپ کے ہے۔

شیخ کلینی نے عبدالرحمٰن بن حجاج سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے احکام کے بارے میں کچھ سوال پوچھے۔ امامؑ نے ان کے جواب دے کر فرمایا: ''کتاب علیؑ میں یہی آیا ہے۔''

شیخ صدوق نے خالد بن جریر کی روایت نقل کی ہے۔ خالد بن جریر کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر دادا موجود ہو تو اخیافی (ماں شریک) بھائیوں کو کتنا حصہ ملے گا؟ امام نے فرمایا: کتاب علیؑ میں ہے کہ ان کا حصہ میراث کا ایک تہائی ہوگا۔

بعض روایات میں ہے کہ امام محمد باقرؑ نے کتاب علیؑ منگائی۔ ان کے فرزند امام جعفر صادقؑ کتاب لے کر آئے تو میں نے دیکھا کہ اس کی شکل ایسی ہے جیسے کسی شخص نے اپنی ران موڑی ہوئی ہو۔ بعدازاں امام محمد باقرؑ نے فرمایا: بخدا یہ امام علی علیہ السلام کے دست مبارک کی لکھی ہوئی اور رسول اکرمؐ کی املاء کرائی ہوئی ہے۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''ہمارے پاس امام علی علیہ السلام کی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے جس کا طول ستر ذراع ہے۔ اس میں جو کچھ لکھا ہے ہم اسی کی پیروی کرتے ہیں اور اس سے تجاوز نہیں کرتے۔ امام علی علیہ السلام نے اس میں علم کی جملہ اقسام لکھ دی ہیں۔ مثلاً قضاء، واجبات، احادیث۔

امام محمد باقرؑ کے ان الفاظ سے کہ ''ہمارے پاس امام علیؑ کی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے جو علم کی سب اقسام پر حاوی ہے جیسے قضاء، واجبات، احادیث'' یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہاں کتاب علیؑ سے مراد امام علیؑ کی سب سے بڑی کتاب جامعہ ہوگی جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ فقہ کے تمام مسائل کی جامع تھی یہاں تک کہ اس میں کسی کو خراش لگانے کی سزا کا بھی ذکر تھا جیسا کہ بعض احادیث میں اشارہ ملتا ہے۔ لیکن یہ بھی بعید نہیں کہ کتاب علیؑ صرف احکام میراث کے بارے میں ہو کیونکہ میراث ہی سے متعلق مسائل کا جواب دیتے ہوئے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ نے اس کتاب کا نام لیا ہے۔

بخاری کی جس روایت کا ہم نے تذکرہ کیا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی

ہے کیونکہ اس روایت میں ہے کہ حضرت علیؑ نے قضاء کے مسائل ایک مخصوص کتاب میں جمع کیے تھے اور یہ کتاب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس تھی۔

اعیان الشیعہ میں جفر کا بھی امیرالمومنینؑ کی تالیفات میں شمار کیا گیا ہے۔ ابن خلدون کی کتاب **مقدمہ** میں بھی اس کتاب کا نام آیا ہے۔احمد بن مصطفیٰ المعروف بسطا نے کشف الظنون اور مفتاح السعادۃ میں ذرا تفصیل سے اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔ معریٰ نے کتاب جفر کے بارے میں کہا ہے:

لَقَدْ عَجِبُوْا لِاَهْلِ الْبَيْتِ لَمَّا اَرُوهِمْ عِلْمَهُمْ فِيْ مِسْکِ جَفْرٍ
وَمِرْآةُ الْمُنَجِّمِ وَهِيَ صُغْرىٰ اَرَتْهُ کُلُّ عَامِرَةٍ وَ قَفْرٍ

" لوگ علم جفر میں اہلبیتؑ کی مہارت دیکھ کر تعجب کرتے ہیں۔جفر علم نجوم کا ایسا آئینہ ہے جو تمام آبادیوں اور ویرانوں کے حالات آشکار کر دیتا ہے۔"

اعیان الشیعہ اور مجمع البحرین میں ان باتوں کے ذیل میں کہ جن پر شیعوں اور سنیوں میں اتفاق ہے لکھا ہے کہ جفر اور جامعہ رسول اکرمؐ نے امیرالمومنینؑ کو املاء کرائی تھیں۔ پھر ایک حدیث کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے کہ جفر اور جامعہ تمام علوم پر مشتمل ہیں حتیٰ کہ بھیڑ بکری کے مارنے کے معاوضے، کسی کو خراش لگانے کی دیت اور ایک تازیانہ اور نصف تازیانہ سزا کا بھی بیان ہے۔

اعیان الشیعہ میں محقق میر سید شریف جرجانی کی شرح المواقف سے نقل کیا گیا ہے کہ جفر اور جامعہ امام علی علیہ السلام کی دو کتابیں ہیں۔

فیروز آبادی کی قاموس المحیط میں ہے کہ "جفر وہ بھیڑ کا بچہ ہے جو بڑا ہو جائے اور جس کا پیٹ پھول جائے یا جس کی عمر چار مہینے کی ہو جائے۔"

لغت کی دوسری کتاب صحاح اللغۃ میں جوہری نے بھی یہی معنی لکھے ہیں۔ اہلبیتؑ کی بعض روایات میں ہے کہ " جفر رنگے ہوئے چمڑے کے تھیلے کو کہتے ہیں۔" ایسے ہی ایک تھیلے میں امام علیؑ کی کتابیں اور نبی اکرمؐ کے متروکات رکھے جاتے تھے۔

محمد بن حسن صفار سے روایت ہے کہ ان سے علی بن سعید نے کہا:

''ایک دن میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر تھا کہ محمد بن عبداللہ بن علی کہنے لگے: تعجب ہے کہ عبداللہ بن حسن مذاق اڑاتے اور کہتے ہیں کہ ''یہ اس جفر میں ہے جس کی تم لوگ باتیں کرتے ہو۔'' امام صادقؑ نے کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا: جفر تو رنگے ہوئے چمڑے کا ایک تھیلا سا ہے جس میں کتابیں اور علم ہے۔ حلال وحرام سے متعلق تمام مسائل جن کی لوگوں کو تا قیامت ضرورت ہو سکتی ہے اس میں موجود ہیں۔''

کچھ روایات میں آیا ہے کہ جفر گائے کے چمڑے کا بنا ہوا تھا۔ بعض دوسری روایات کے بموجب بکری کی کھال کا تھا۔ اس کی ساخت کے بارے میں کچھ اور بھی روایات ہیں۔ بہرحال وہ کسی چیز کا بھی بنا ہوا ہو ائمۂ اطہارؑ نے اس کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے قابل اعتماد ساتھیوں نے اسے دیکھا ہے۔ ائمۂ اطہارؑ کے معتبر اصحاب نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ امام علیؑ نے ''واجبات'' کے بیان میں ایک کتاب تالیف کی تھی اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ اسی کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔

ثقۃ الاسلام شیخ کلینی نے زرارہ بن اعین سے روایت کی ہے جس میں زرارہ کہتے ہیں: ''ایک بار امام محمد باقرؑ نے امام جعفر صادقؑ سے فرمایا کہ فرائض کی کتاب پڑھ کر مجھے سناؤ۔ میں نے دیکھا کہ اس کے خاص مضامین چار حصوں پر مشتمل تھے۔''

شیخ کلینی نے ایک اور روایت محمد بن مسلم سے نقل کی ہے جس میں محمد بن مسلم کہتے ہیں: ''امام محمد باقرؑ نے فرائض کی کتاب جو رسول اکرمؐ کی املاء کرائی ہوئی اور امام علیؑ کے ہاتھ کی تحریر شدہ تھی مجھے پڑھ کر سنائی۔ اس میں لکھا تھا کہ میراث کے سہام میں عول (کمی بیشی) نہیں ہے۔

اس طرح کی بہت سی احادیث ہیں جنہیں شیخ صدوق، شیخ کلینی، شیخ طوسی اور دوسرے بزرگ علماء نے بیان کیا ہے۔ بعض شیعہ محدثین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ امام علی علیہ السلام کی اور بھی کتابیں ہیں۔

علامہ شرف الدین العمرا جعات میں لکھتے ہیں: ''امام علی علیہ السلام نے ایک کتاب دیت کے بارے میں تالیف کی تھی اور اس کا نام ''صحیفہ'' رکھا تھا۔''

ممکن ہے کہ یہ وہی کتاب ہو جس کے بارے میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا تھا کہ ''ہمارے پاس امام علی علیہ السلام کی کتابوں میں سے ایک صحیفہ ہے جس کا طول ستر ذراع ہے۔ ہم اسی کی پیروی کرتے ہیں اور اس سے تجاوز نہیں کرتے۔''

ابن سعد نے بھی الطبقات الکبریٰ کے آخر میں اپنی سند سے امیرالمومنینؑ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ''صحیفہ'' کا ذکر آیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بخاری و مسلم بھی اپنی اپنی صحیح میں ''صحیفہ'' کے متعلق متعدد روایتیں بیان کرتے ہیں۔ منجملہ ان روایات کے ایک حدیث ہے جو اعمش، ابراہیم تیمی سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ ابراہیم تیمی کہتے ہیں کہ میرے والد نے کہا:

''امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ہمارے پاس قرآن مجید کے علاوہ کوئی پڑھنے کی کتاب نہیں بجز اس صحیفے کے۔ یہ کہہ کر انہوں نے وہ صحیفہ کھولا۔ اس میں زخموں اور اونٹ کے دانتوں سے متعلق مسائل تھے۔''

احمد بن حنبل نے بھی اپنی مسند میں طارق بن شہاب سے کئی روایتیں اس صحیفے کے بارے میں نقل کی ہیں۔

ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم یہاں ان تمام روایات کا مکمل جائزہ پیش کریں جو محدثین اور اہل اخبار نے امام علیؑ کی فقہ و حدیث سے متعلق تالیفات کے ضمن میں بیان کی ہیں۔ ہم صرف ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے تھے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ظہور اسلام کی ابتداء ہی سے تشیع کو اصول و فروع دین کی تدوین میں دوسروں پر سبقت حاصل رہی ہے۔ مسلمانوں میں امام علیؑ اور ان کے پیروکاروں کی علم فقہ میں ہمیشہ نمایاں ترین حیثیت رہی ہے۔ انہوں نے احادیث اور احکام کی تدوین کی اور اسلامی تعلیمات کو پھیلایا۔

اسلام کا مفاد، اس کی تعلیمات اور اس کی وہ اقدار جن کے لئے انہوں نے جہاد کیا امام علیؑ کو ہمیشہ عزیز رہے۔انہوں نے آغاز بعثت ہی سے سخت ترین حالات اور خطرناک ترین زمانے میں بھی خود کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کئے رکھا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ فقہ و حدیث کی تدوین کے مہتم بالشان کام کو نظرانداز کردیتے۔چنانچہ امام علیؑ نے فقہ کے تمام مسائل کو مدون کیا یہاں تک کہ کسی کو خراش لگانے کی سزا بھی بیان کردی۔ احادیث بھی جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی تھیں اسی طرح بلا کم وکاست جمع کیں۔ امام علیؑ اور ان کے رفقاء اس اصول کے قائل نہیں تھے کہ احکام میں ذاتی رائے کا کوئی دخل ہوسکتا ہے۔ان کا مطمح نظر اسلام اور قرآن کی سر بلندی تھا جب کہ دوسروں کا زاویۂ نگاہ کچھ اور تھا۔ وہ ان احادیث و احکام کو بھی جمع نہیں کرتے تھے جن کا انہیں علم تھا۔ بیشتر صحابہ اور تابعین اسی دوسرے طریقے پر کاربند تھے۔

نقطہ نظر کے اسی فرق کی وجہ سے صحابہ کرام میں اس بات پر اختلاف تھا کہ آیا حدیث اور فقہ کو لکھا جائے یا نہیں۔ بعض اس کو منع کرتے تھے اور کچھ دوسرے جائز سمجھتے تھے۔علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں لکھا ہے:"علم مدون کرنے کے بارے میں صحابہ اور تابعین میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کچھ لوگ جائز سمجھتے تھے اور یہ کام کرتے تھے۔ ان ہی میں حضرت علیؑ اور ان کے فرزند حضرت حسنؑ تھے۔"

صحیح طریقہ لکھنے ہی کا تھا۔ اور اس کے بہتر ہونے کے لئے امام علیؑ اور ان کے فرزند امام حسنؑ کا عمل حجت ہے۔ قدرتی طور پر ان صحابہ نے بھی جو امام علیؑ کا اتباع کرتے تھے ان ہی کی رائے قبول کی۔ ان صحابہ کا درجہ کسی دوسرے صحابی سے کمتر نہیں تھا۔ کسی دوسرے مسلمان کے حق میں راویوں نے ایسی صحیح احادیث نبوی روایت نہیں کیں جیسی حضرت سلمانؓ، حضرت عمارؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور ان دوسرے صحابہ کے حق میں کی ہیں جو امام علیؑ کی رائے کو قبول کرتے اور ان کا

اتباع کرتے تھے۔ ان لوگوں نے حدیث کی تدوین میں حصہ لیا جس کی تائید کتب رجال وحدیث سے ہوتی ہے۔

نجاشی کہتے ہیں: ''ابورافع ان لوگوں میں سے ہیں جو اسلام کی ابتداء میں مکے میں ایمان لائے اور رسول اکرمؐ کے ساتھ ہجرت کی۔ اکثر غزوات میں رسول اکرمؐ کے ہمرکاب رہے۔ وفات رسولؐ کے بعد امام علیؑ کے اصحاب میں شامل ہوگئے۔ ان کا شمار بزرگان شیعہ میں ہوتا تھا۔ ابورافع نے کتاب السنن والاحکام والقضایا لکھی تھی۔ ان کی کتاب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قضایا کے بارے میں تھی۔''

اس کے بعد کہتے ہیں: ''ابی رافع کے فرزند علی بھی بزرگان شیعہ میں سے تھے۔ وہ امام علیؑ کے کاتب اور ان کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی فقہ کی کتاب میں وضو، نماز اور دوسرے فقہی ابواب جمع کئے تھے۔''

نجاشی نے رجال میں امام حسنؑ کے پوتے موسیٰ بن عبداللہ سے روایت کی ہے:
''ایک شخص نے میرے والد سے تشہد کے بارے میں کچھ پوچھا۔ میرے والد نے مجھ سے کہا کہ ذرا علی بن ابی رافع کی کتاب دینا۔ اس کے بعد کتاب میں سے وہ مسئلہ نکال کر ہمیں لکھایا۔''

علامہ شرف الدین المراجعات میں کہتے ہیں: ''عبیداللہ بن ابی رافع امام علیؑ کے کاتب اور دوست تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جعفر طیارؓ کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا تھا: ''جعفر بن ابی طالبؑ خَلق اور خُلق میں مجھ سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں۔'' احمد بن حنبل نے بھی اپنی مسند میں یہی بات لکھی ہے۔

عبیداللہ بن ابی رافع نے ان صحابہ کے نام جو جنگ صفین میں امام علیؑ کے ہمرکاب تھے ایک کتاب میں جمع کئے تھے۔ ابن حجر نے اصابہ فی تمییز الصحابہ میں متعدد جگہوں پر اس کتاب سے نقل کیا ہے۔

شیخ طوسی، نجاشی، ابن شہرآشوب اور کئی دوسرے مصنفین نے ان شیعوں کے

نام لکھے ہیں جنہوں نے صدر اسلام میں کتابیں تالیف کی تھیں۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک کتاب میں بادشاہ روم کے ایلچی جاثلیق کا قصہ لکھا تھا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک کتاب تالیف کی تھی جس میں رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد کے حالات کی تفصیل تھی۔ اس کا نام الخطبہ تھا۔

جناب اصبغ بن نباتہؒ نے دو کتابیں لکھی تھیں۔ ایک کا نام مقتل الحسینؑ اور دوسری کا عجائب احکام امیر المؤمنینؑ تھا۔ جو فرمان امام علیؑ نے جناب مالک اشتر نخعیؒ کے نام جاری کیا تھا اور جو وصیت نامہ آپ نے اپنے فرزند محمد بن حنفیہؒ کے نام لکھا تھا، ان دونوں کی روایت اصبغ بن نباتہؒ ہی سے ہے۔[1]

جناب سُلیم بن قیسؒ نے ایک کتاب امامت کے بارے میں تالیف کی تھی۔ اس میں امام علیؑ اور بعض بزرگ صحابہ کرام کی روایات ہیں۔ شیعوں میں کسی کو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب جناب سُلیمؒ ہی کی تصنیف ہے۔

حضرت میثم تمارؒ نے ایک کتاب میں احادیث جمع کی تھیں۔ شیخ طوسی نے امالی میں، کشی نے رجال میں اور طبری نے بشارۃ المصطفیٰ(ص) میں اس کتاب سے روایات نقل کی ہیں۔

محمد بن قیس بجلی امیر المومنینؑ کے اصحاب میں سے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ہے جس میں وہ امام علیؑ سے روایت کرتے ہیں۔ شیخ طوسی الفہرست میں لکھتے ہیں:

''جب محمد بن قیس کی کتاب امام محمد باقرؑ کی خدمت میں پیش کی گئی تو امام نے فرمایا: یہ واقعی امیر المومنین علیہ السلام کے اقوال ہیں۔''

۱۔ مالک اشترؒ کے نام یہ فرمان نہج البلاغہ مترجمہ مفتی جعفر حسینؒ میں مکتوب نمبر ۵۳ پر موجود ہے۔ ابو محمد حسن بن علی شعبہ حرانی نے تحف العقول عن آل رسول میں اور سید رضی علیہ الرحمہ نے نہج البلاغہ میں لکھا ہے کہ یہ وصیت نامہ حضرت امام حسنؑ کے نام ہے جبکہ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ یہ جناب محمد بن حنفیہؓ کے نام ہے۔ مفتی جعفر حسینؒ اور علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ کے ترجمہ نہج البلاغہ میں یہ وصیت نامہ مکتوب نمبر ۳۱ پر درج کیا ہے۔

جن کتابوں کے نام ہم نے اب تک گنوائے ہیں ان کے علاوہ بھی کتابوں کی ایک بڑی کثیر تعداد ہے جن کا ذکر کتب رجال میں ملتا ہے اور جو وفات رسولؐ کے بعد اور حکومت معاویہ کے اختتام کی درمیانی مدت میں لکھی گئیں۔ ہمارا مقصد ان تمام کتابوں اور ان کے مصنفین کا استقصاء نہیں ہے۔ یہی تھوڑی سی تعداد یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلامی احکام اور احادیث نبوی کی تدوین میں تشیع نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر تاریخ میں ان کتابوں میں سے کسی کا بھی ذکر نہ ہوتا جب بھی خود امام علیؑ ہی کی اپنی تالیفات اس ضمن میں کافی تھیں۔ امیر المومنینؑ نے جو کوششیں احکام بیان کرنے، فیصلے صادر کرنے اور فتویٰ دینے کے سلسلے میں کیں وہ اس کے لئے کافی ہیں کہ رسول اکرمؐ کے بعد اسلامی علوم کو آپ ہی سے منسوب کیا جائے۔

یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ امام علیؑ نے فقہ، اصول فقہ، قرآنی احکام اور احادیث رسولؐ کو مدوّن کیا۔ آپ کے بعد ائمۂ اہلبیتؑ کے لئے سب سے بڑا مآخذ آپ ہی کی کتابیں تھیں۔ امام باقرؑ اور امام صادقؑ اپنی امامت کے دور میں اسلامی تعلیمات اور فقہی احکام کے لئے آپ ہی کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے راویان حدیث اور ان دونوں بزرگوں کے اصحاب نے اس کی تصریح کی ہے۔ بعض روایات میں امام باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "امام علیؑ کی کتابوں میں سے ہمارے پاس ایک صحیفہ ہے جس کا طول ستر ذراع ہے۔ جو کچھ اس میں لکھا ہے ہم اسی کی پیروی کرتے ہیں اور اس سے تجاوز نہیں کرتے۔"

امام باقرؑ اور امام صادقؑ کے زمانے سے قبل ان کتابوں کی اشاعت آسان نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ نے تدوین حدیث کی ممانعت کردی تھی اور ان کا یہ حکم مسلمانوں نے بھی قبول کرلیا تھا یہاں تک کہ یہی طریقہ اسلامی شعار بن گیا تھا۔ خلفائے ثلاثہ کے دور کے بعد اقتدار امویوں کے ہاتھ میں چلا گیا جن کی پوری کوشش یہ تھی کہ تشیع اور شیعی آثار کو مٹا دیا جائے حتیٰ کہ تشیع کی بات کرنے کا انجام بھی شدید ترین سزا ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر شیعہ تاریخ کے اس سخت ترین دور میں نہ یہ کتابیں منظر عام پر آسکتی

تھیں اور نہ ان کی اشاعت ہوسکتی تھی۔ اس زمانے میں تو صورتحال یہ تھی کہ جب کوئی شخص امیرالمومنین علی علیہ السلام سے کوئی روایت نقل کرنا چاہتا تھا تو آپ کا نام لینے کے بجائے یوں کہتا تھا کہ یہ بات مجھ سے ابوزینب نے کہی۔[۱]

اگرچہ امام علیؑ ، اُن کی نسل پاک میں ہونے والے ائمہ اوراُن کے پیروکار اُن بیش قیمت کتابوں کی جن کے مضامین قرآن وسنت سے ماخوذ تھے عام اشاعت نہیں کرسکتے تھے پھر بھی کبھی کبھی وہ ان کتابوں کو لوگوں کو دکھایا کرتے تھے اور ان میں سے احادیث اور احکام سنایا کرتے تھے۔ ان کتابوں میں موجود احکام ان فتوؤں سے جو دوسرے لوگ دیتے تھے اور ان حدیثوں سے جو دوسرے لوگ بیان کرتے تھے مختلف ہوتے تھے۔ اس موضوع پر مزید گفتگو عصر صحابہ میں شیعوں کے نزدیک احکام کے مآخذ بیان کرتے ہوئے کریں گے۔

۱۔ معاویہ نے اپنے حکام کے نام فرمان جاری کیا تھا کہ جس کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ دوستدار علیؑ اور محب اہلبیتؑ ہے اس کا وظیفہ بند کر دیا جائے اور فوجی اور شہری وظیفہ یابوں کی فہرست سے اس کا نام خارج کر دیا جائے۔ دوسرا فرمان یہ جاری ہوا تھا کہ جس پر ہوا دار علیؑ ہونے کا شبہ ہو اسے سزا دی جائے اور اس کا گھر مسمار کر دیا جائے۔ یہ حکم اتنا سخت تھا کہ بقول ابن ابی الحدید شیعہ اپنے عزیزوں اوردوستوں کے گھروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے اور اس پر بھی خود اپنے غلاموں اور کنیزوں سے خوفزدہ رہتے تھے کہ مبادا کوئی چغلی نہ کھائے۔ جو کوئی کسی سے ناراض ہوتا شکایت کردیتا کہ فلاں شخص دوستدار علیؑ ہے اور پھر اس کی شامت آجاتی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ سختی عراق میں ہوئی جہاں کا والی زیاد بن سُمیّہ تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہر جگہ جمعہ کے خطبوں اور دیگر موقعوں پر امام علیؑ پر ان کی درخشندہ اسلامی خدمات کے باوجود سب وشتم کیا جاتا اور معاویہ اور یزید کی تعریف وتوصیف کی جاتی۔ عراق کے والی زیاد بن سُمیّہ کو یہ حکم بھی ملا تھا کہ جس شخص کے متعلق معلوم ہو جائے کہ شیعہ ہے اس کی شہادت قبول نہ کی جائے اور اگر وہ کسی شخص کو پناہ دے تو اس کی دی ہوئی پناہ کا اعتبار نہ کیا جائے۔ (ڈاکٹر ابراہیم آیتی کی کتاب ''تاریخ عاشورا'' مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پر علی اکبر غفاری کے ''مقدمہ'' سے اقتباس۔)

اسلامی قانون سازی پر
تدوین حدیث کی ممانعت کے اثرات

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اکابرین صحابہ نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ جس طرح سے قرآن کریم کو مختلف تختیوں اور نوشتوں سے جمع کیا گیا ہے اسی طرح سے وہ حدیث کو بھی جمع کرنے کا حکم صادر فرمائیں لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر خلیفہ نے تدوین حدیث کا حکم جاری کیا تو مسلمان بھی یہود و نصاریٰ کی طرح سے کتاب خدا کو چھوڑ دیں گے اور حدیث میں مشغول ہو جائیں گے۔ اس بات کو بنیاد بنا کر انہوں نے اکابرین صحابہ کے اس خیال کی مخالفت کی اور حدیث کی جمع و تدوین نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ خلیفہ اول کے دور سے لے کر خلیفہ سوم کے دور تک تدوین حدیث کی ممانعت رہی۔

اس ممانعت کے نتیجے میں مسلمان ایک طویل عرصہ تک رسول اکرمؐ اور آپ کے صحابہ سے سینہ بہ سینہ سنی ہوئی احادیث پر انحصار کرتے رہے۔ انہوں نے اس عرصہ میں حدیث مدون نہیں کی جیسا کہ محدثین اہل سنت کہتے ہیں جبکہ اسلامی قانون سازی کے لئے حدیث بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ قرآن۔ کیونکہ حدیث استنباط احکام کے لئے اصل ثانی اور مرجع کا حکم رکھتی ہے۔ اور اس زمانے کے مسلمان باقی ادوار کے مسلمانوں کی طرح سے علم، فقہ، حفظ اور فکر و فہم میں یکساں نہیں تھے بلکہ ان

کے بھی مختلف درجات اور طبقات تھے۔ فہم دین اوردین پر عمل کرنے میں بھی یہی صورت تھی۔ علاوہ ازیں اسلامی حکومت کی توسیع کی وجہ سے علماء اور حفاظ حدیث کی ضرورت بھی لوگوں میں بڑھ چکی تھی۔

اسلام دنیا کے نقشے پر تیزی سے ابھر رہا تھا اور مسلمان صحرا نشینی کے دور سے تہذیب وتمدن کے دور میں داخل ہورہے تھے۔ جب مفتوح اقوام سے مسلمانوں کے تعلقات قائم ہوئے اور وہ ان میں گھل مل گئے تو انہیں فقہ، حلال وحرام کی پہچان، حدیث رسولؐ اور تفہیم قرآن کی شدید ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ دین کے اصولوں کے مطابق آئین زندگی مرتب کرسکیں۔ اس کی ضرورت اس لئے اور بھی زیادہ تھی کیونکہ دین ہی حکومت کا قانون تھا اور لازم تھا کہ امت زندگی کے تمام مراحل میں دین کے تقاضوں پر عمل پیرا ہو۔

فتوحات کی وجہ سے اسلامی مملکت کی سرحدیں وسیع ہوئیں تو بہت سے مسلمانوں کے ساتھ فقہاء ومحدثین کو بھی حجاز سے باہر کی دنیا میں قدم رکھنے کا موقع ملا اور یوں فقہاء ومحدثین عالم اسلام کے مختلف شہروں میں پھیل گئے۔

مفتوحہ علاقوں میں اسلام نیا نیا داخل ہو رہا تھا اس لئے لوگ اس نئے دین کے اصول وفروع کو سمجھنے کے خواہش مند تھے۔ نومسلموں کو اسلامی احکام سمجھنے کی شدید ضرورت تھی کیونکہ اسلام کی اساس پر ہی لوگوں کے معاملات طے ہوتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اسلامی مرکز سے آنے والے مسلمانوں کی طرف رجوع کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیث رسولؐ بیان کرنے والوں کی کثرت ہوگئی اور رسول اکرمؐ کی طرف منسوب احادیث کی خوب نشرو اشاعت ہونے لگی۔

ان دنوں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت مدینہ منورہ میں ہی قیام پذیر رہی۔ ان کے قیام مدینہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو حسب منشاء احادیث بیان کرنے کا موقع مل گیا جس کی وجہ سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور اسلام کی سنہری

تعلیمات مسخ ہوئیں۔ اس حساس مرحلے پر حدیث گوئی کا معاملہ صرف حفاظِ حدیث کے بھروسے پر قائم تھا اور ان کے دین وضمیر کے علاوہ کوئی ان پر نگران نہیں تھا۔

فقہائے صحابہ اور رواۃ حدیث کو اندازہ نہیں تھا کہ رسول کریمؐ کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ہی حدیث کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ حد یہ ہے کہ تدوین حدیث سے منع کرنے والے خلیفہ کو بھی یہ گمان نہیں تھا کہ حدیث جیسا حساس علم ابوہریرہ اور ان کی ''انجمن'' کے ہاتھوں کھلونا بن جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہ کو اپنے دُرے سے سزا بھی دی تھی کیونکہ انہوں نے آنحضرتؐ پر غلط بیانی کی تھی۔

حضرت عمرؓ نے حدیث گوئی کی وجہ سے صرف ابوہریرہ کو ہی سزا نہیں دی تھی بلکہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو درداؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کو بھی مدینہ میں نظر بند کر دیا تھا کیونکہ انہوں نے آنحضرتؐ سے زیادہ روایات نقل کی تھیں جب کہ ان تینوں بزرگواروں کا تعلق اخیار صحابہ کی جماعت سے تھا۔[1]

حضرت عمرؓ نے ایک ماہ تک گہرے غور وخوض کے بعد حدیث وفقہ کی تدوین سے منع کیا تھا کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں رسول خداؐ پر جھوٹ نہ باندھا جائے جبکہ ماضی قریب میں وہ کہہ چکے تھے:

لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَکَ عُمَرُ ''علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔''

لَا بَقِيْتُ لِمُعْضَلَةٍ لَيْسَ لَهَا اَبُو الْحَسَنِ ''خدا مجھے کسی ایسی مشکل کے وقت زندہ نہ رکھے جسے حل کرنے کے لئے ابوالحسنؑ موجود نہ ہوں۔''

حضرت عمرؓ نے فقہائے صحابہ کی موجودگی میں مسجد نبوی میں یہ اعلان کیا تھا:

لَا يُفْتِيَنَّ اَحَدُكُمْ فِي الْمَسْجِدِ وَعَلِيٌّ حَاضِرٌ ''جب علیؑ مسجد میں موجود ہوں تو تم میں سے کوئی فتویٰ نہ دے۔''

حضرت عمرؓ کے اس طرح کے اعلانات سے ایک محقق کے متجسس ذہن میں بہت سے شبہات جنم لیتے ہیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ حضرت علیؑ کی اہلیت کے اتنے معترف تھے تو انہوں نے حدیث کی جمع آوری اور

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی از شیخ محمد خضری۔ السنۃ قبل التدوین از محمد عجاج الخطیب

تدوین کا کام ان کے سپرد کیوں نہ کیا ؟ جبکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت علیؑ جملہ قوانین فقہ سے واقف ہیں اور تمام لوگوں سے حدیث کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ وہ بعثت رسولؐ سے رحلت رسولؐ تک کے سارے واقعات کے چشم دید گواہ ہیں۔ جس طرح جمع قرآن کی ذمے داری حضرت زیدؓ کے سپرد کی گئی تھی اگر اسی طرح سے امام علیؑ کو تدوین حدیث کی خدمت پر مامور کر دیا جاتا تو مسلمانوں کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتیں اور وہ احکامِ الٰہی اور آیات قرآنی کو آسانی سے سمجھ سکتے۔

تدوین حدیث سے بے توجہی برتنے کے نتیجہ میں ابوہریرہ، کعب الاحبار اور وہب بن منبہ جیسے محدث پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام میں بدعات داخل کر دیں جس سے اسلام کا حسین چہرہ مسخ ہوگیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ راہِ اسلام سے منحرف کچھ حکام کی تائید بھی انہیں حاصل ہوگئی جس کی وجہ سے ان کے لئے میدان ہموار ہوگیا اور انہوں نے جھوٹ کو خوب فروغ دیا اور دین کو سیاست کا آلہ کار بنا دیا۔[1]

۱۔ حدیث سازوں کی "انجمن" کے دیگر افراد میں عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، انس بن مالک اور سمرۃ بن جندب کا نام لیا جاسکتا ہے۔ سمرۃ بن جندب کا قصہ بیان کرتے ہوئے جن کی آنکھوں کو دولت کی چمک خیرہ کرتی تھی ابن ابی الحدید کے استاد جعفر اسکافی کہتے ہیں: معاویہ نے سمرۃ کو ایک لاکھ درہم بھیجے تاکہ وہ رسول اکرمؐ سے ایک روایت نقل کرے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهِ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۰۴) علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ رسول اکرمؐ کے قول کے مطابق دین خدا کے دشمن ہیں۔ اور وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۰۷) ابن ملجم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ سمرۃ بن جندب نے اتنی رقم قبول نہ کی اور معاویہ نے اسے بڑھا کر دو لاکھ درہم بھیج دیئے۔ سمرۃ نے یہ رقم بھی قبول نہ کی اور معاویہ نے اسے چار لاکھ درہم تک بڑھا دیا۔ یہ رقم سمرۃ نے قبول کرلی اور لوگوں کے سامنے ایک جھوٹی حدیث بیان کرکے بغض علیؑ کا ثبوت دیا۔ (شرح نہج البلاغہ ج۱ ص ۳۵۸۔۳۶۱۔ قدیم ایڈیشن)

عصر حاضر میں اس کی مثال مصر کے محمد حسین ہیکل ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "حیات محمدؐ" طبع اول کے صفحہ ۱۰۴ پر پوری حدیث دار نقل کی لیکن جب انہوں نے ۱۳۵۴ھ میں دوسرا ایڈیشن شائع کرایا تو ۵۰۰ مصری روپے کے عوض اس حدیث سے خَلِيْفَتِيْ مِنْ بَعْدِيْ کے الفاظ نکال دیئے۔

اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنی تعلیمات اور اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف انحراف نے جنم لیا۔ جب ایک محقق حدیث میں صحابہ کے تصرفات کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف تقدس صحابہ کے عقیدہ پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے ذہن میں بہت سے شبہات پیدا ہوتے ہیں اور ان شبہات سے نکلنے کا اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

ہمیں نہایت تعجب ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حدیث اور احکام اسلام کی تدوین کو اس خدشہ کے پیش نظر ممنوع قرار دیا تھا کہ کہیں لوگ اللہ کے رسولؐ پر جھوٹ نہ تراشنے لگیں حالانکہ انہیں اتنا مایوس نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ محدثین صحابہ میں حضرت سلمانؓ، حضرت ابوذرؓ، حضرت عمارؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابیؓ، حضرت خزیمہؓ اور حضرت ابن عباسؓ جیسی قد آور شخصیات بھی موجود ہیں جن کی صداقت و پرہیزگاری کی گواہی خود رسول خداؐ نے دی تھی۔

علاوہ ازیں امت اسلامیہ میں عترت رسولؐ بھی موجود تھی جنہیں رسول خداؐ نے حدیث ثقلین کی رو سے ہمدوش قرآن قرار دیا تھا اور مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ وہ کتاب اللہ کے بعد اہلبیتؑ کی طرف رجوع کریں۔

حدیث ثقلین، کو اکثر شیعہ اور سنی محدثین نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حضرت عمرؓ ایک ذہین انسان تھے۔ مسلمانوں کو یونہی چھوڑ دینا ان کی ذہانت کے خلاف تھا مگر انہوں نے اس مسئلہ میں اپنی روایتی ذہانت کے مطابق عمل نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت کے حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ حدیث رسولؐ کی تدوین کا حکم دیتے اور تحقیق کے لئے تمام وسائل فراہم کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو امت اور سنت دونوں ایک بڑے فتنہ سے بچ جاتے اور حدیث سازی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے اور بنی امیہ کے خائن ہاتھ حدیث رسولؐ کو بازیچہ اطفال بنانے کی جسارت نہ کرسکتے۔

اگر حضرت عمرؓ تدوین حدیث کا حکم دیدیتے تو اسلام میں ملوکیت قائم کرنے والوں کا سدباب ہوسکتا تھا اور اسلام کی آڑ میں ملوکیت حدیث سازوں کو کھلا میدان

فراہم نہ کرسکتی۔ملوکیت نے جھوٹی احادیث کا سہارا لے کراپنا تخت و تاج تو بچایا مگر اسلام کو ایسی زبردست زک پہنچائی کہ اس کا مداوا نہیں ہوسکتا۔ بہر حال اس میں تو کلام نہیں کہ ملوکیت نے دانستہ یا نادانستہ طور پر حدیث سازی کے ذریعے حدیث پاک کے خدوخال ہی بدل دیئے۔

دریں حالات کتاب وسنت کے فروغ کے خواہش مندوں اور درد مندوں نے جن میں امام علیؑ سرفہرست تھے، اپنی ذمہ داریوں کا مکمل احساس کیا اور انہوں نے دین کے اصول اور اس کی تعلیمات کو فروغ دینے کی ان تھک جدوجہد کی۔انہوں نے حدیث وفقہ کو مدوّن کیا یہاں تک کہ ایک خراش کی دیت تک کو بھی بیان کیا جیسا کہ اہلبیتؑ کی صحیح کتب حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

سابق شیخ الازہر، استاد محمود ابوریہ لکھتے ہیں:[1]

تدوین حدیث اور اس کے الفاظ کے قرآن سے ارتباط کی ایک سو سالہ تاخیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ روایت سازی کے دروازے وا ہوگئے اور وضع حدیث کے دریا بہنے لگ گئے اور حدیث کے لئے کسی ضابطہ کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اس وقت تک لاکھوں جعلی احادیث منظر عام پر آچکی تھیں جن کی ایک بھاری تعداد آج بھی مشرق ومغرب کے درمیان مسلمانوں کی کتابوں میں موجود ہے۔وضع حدیث کا نقصان مسلمانوں کے خلاف اہل مشرق ومغرب کی یلغار سے زیادہ تھا اور مسلمانوں کا شیعی، رافضی، خارجی اور نصیری فرقوں میں تقسیم ہونا بھی وضع حدیث کا ہی شاخسانہ تھا۔

پھر استاد ابوریہ، سید رشید رضا کا قول نقل کرتے ہیں کہ سید فرماتے تھے:[2]

زنادقہ (نیکی اور بدی کے دو خداؤں اہرمن ویزداں کے قائل) جنہوں نے دھوکہ دہی کے لئے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا وضع حدیث میں بڑا گھناؤنا کردار ادا کیا۔

۱۔ اضواء علی السنة المحمدية باب الوضع فی الحدیث واسبابه ص ۸۰

۲۔ مجلّہ المنار ج ۳ ص ۵۴۵

انہوں نے جھوٹی احادیث گھڑ کر اسلام میں تباہی پھیلائی اور اس طرح مسلمانوں میں اختلافات کو ہوا دی۔

حمید بن زید لکھتے ہیں کہ ''زنادقہ نے چار ہزار احادیث گھڑی تھیں۔'' ہم سمجھتے ہیں کہ حمید بن زید نے یہ بہت کم تعداد بیان کی ہے۔ شاید ان کے علم میں اتنی ہی جعلی حدیثیں آئی ہوں گی جب کہ محدثین نے ایک زندیق ابن ابی العوجاء کے متعلق لکھا ہے کہ جب اس کو زندیقی کی سزا میں قتل کرنے کے لئے تختہ دار کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اس نے کہا تھا: ''میں تمہارے درمیان چار ہزار احادیث بنا کر پھیلا چکا ہوں جن میں، میں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

استاد ابو ریہ نے اپنی کتاب الاضواء علی السنة المحمدیہ میں ابوہریرہ اور کعب الاحبار کی زبانی ایسی بہت سی احادیث نقل کی ہیں جن میں انہوں نے معاویہ اور ملک شام کے شہروں کے فضائل بیان کئے ہیں۔[1]

مذکورہ وضعی احادیث نقل کرنے کے بعد موصوف لکھتے ہیں کہ وضع حدیث کی بیماری صرف اسلام دشمنوں اور بدعتیوں تک محدود نہیں تھی۔ ''نیک مسلمان'' بھی حسب توفیق اس ''کارِ خیر'' میں اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ حدیث سازی کے ذریعہ ثواب کما رہے ہیں اور جب کوئی ان سے یہ کہتا کہ تم رسول خداؐ پر جھوٹ کیوں تراش رہے ہو تو وہ کہتے تھے کہ ہم ان کے حق میں جھوٹ بول رہے ہیں ان کی مخالفت میں نہیں۔ چنانچہ جب عبداللہ نہاوندی نے احمد کے غلام سے پوچھا کہ تو یہ احادیث کہاں سے لایا ہے جسے تو نے اپنے رسائل میں نقل کیا ہے تو اس نے کہا: ہم نے یہ احادیث اس لئے وضع کی ہیں کہ عوام کے دل نرم ہو سکیں۔[2]

ان لوگوں کی حالت یہاں تک جا پہنچی تھی کہ جب وہ کسی چیز کو بہتر سمجھتے تو اسے حدیث کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔ چنانچہ استاد ابو ریہ الاضواء میں تاریخ ابن عساکر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

۱۔ اضواء علی السنة المحمدیة ص ۹۱ تا ۹۸　　۲۔ ایضاً ص ۱۰۲، ۱۰۳

ابوہریرہ نے اس طرح کی بہت سی احادیث وضع کی ہیں۔ ان کی یہ احادیث محدثین اہل سنت نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں۔[1] چنانچہ طحاوی مشکل الآثار میں ابوہریرہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا جب تم ایسی حدیث بیان کرو جو تمہیں اچھی لگتی ہو اور بری نہ لگتی ہو تو تم اس کی تصدیق کرو خواہ میں نے اسے کہا ہو یا نہ کہا ہو کیونکہ میں وہ بات کہتا ہوں جو اچھی ہو اور جسے برا نہ سمجھا جاتا ہو۔

ابوہریرہ کی زبانی ابن حزم الاحکام میں لکھتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

میری طرف سے تمہیں جو بھی اچھی بات پہنچے جسے میں نے نہ کہا ہو تو یہ سمجھ لو کہ میں نے اسے کہا ہے۔

۱۔ معاویہ کے دور میں ابوہریرہ مکہ کے والی مقرر ہوئے تھے۔ ان دنوں عکہ سے پیاز کا ایک بیوپاری مکہ آیا لیکن اسے پیاز کے خریدار نہ مل سکے جس کی وجہ سے پیاز خراب ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب کیا کروں؟ آخر وہ والی مکہ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا: اے ابوہریرہ! آپ ایک ثواب کا کام کرسکتے ہیں؟ ابوہریرہ نے پوچھا: کیسا ثواب کا کام؟ اس نے کہا: میں ایک مسلمان ہوں، مجھے بتایا گیا تھا کہ مکہ میں پیاز پیدا نہیں ہوتی اور اہل مکہ کو پیاز کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میرے پاس جو سرمایہ تھا اس سے میں نے پیاز خریدی لیکن یہاں میری پیاز کوئی نہیں خرید رہا اور یہ خراب ہو رہی ہے۔ آپ ایک مسلمان کا مال ضائع ہونے سے بچاسکتے ہیں۔

ابوہریرہ نے کہا: بہت خوب! تم نماز جمعہ کے وقت وہ پیاز فلاں جگہ لے آؤ۔ چنانچہ جمعہ کے دن جب اہل مکہ نماز کے لئے جمع ہوگئے تو ابوہریرہ نے کہا: اَیُّهَا النَّاسُ سَمِعْتُ مِنْ حَبِیْبِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَنْ اَکَلَ بَصَلَ عَکَّةَ فِیْ مَکَّةَ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ. اے لوگو! میں نے اپنے حبیب رسول خداؐ سے سنا ہے کہ جو شخص عکہ کا پیاز مکہ میں کھائے اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔

یہ سن کر لوگ پیاز پر ٹوٹ پڑے اور ایک گھنٹے کے اندر اندر اس شخص کی ساری پیاز بک گئی۔ ابوہریرہ بھی دل ہی دل میں خوش تھے کہ انہوں نے ایک مسلمان کو نقصان سے بچالیا ہے۔

صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۱۲۶ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی میں ہے کہ ابوہریرہ نے ایک حدیث رسولؐ بیان کی تو حاضرین نے پوچھا: اے ابو ہریرہ! کیا یہ حدیث تم نے خود رسول اکرمؐ سے سنی تھی؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ یہ حدیث میں نے اپنی جیب سے نکالی ہے۔ مسعودی کی مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۴۵۴ مطبوعہ دار الاندلس میں ہے کہ ابو ہریرہ نے پانچ ہزار تین سو سے زائد جھوٹی احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کی ہیں۔

ابو ہریرہ نے صرف اسلام کو کمزور کرنے اور اپنے ولی نعمت معاویہ بن ہند کو خوش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ نہوں نے دوسروں کے لئے وضع حدیث کی راہیں کشادہ کر دی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے رسول خداؐ کی طرف حدیث کی اس قسم کو منسوب کیا تاکہ وہ مستقبل میں کذب بیانی کرنے والوں کے لئے اساس کا کام دے سکے اور اس کے لئے انہوں نے یہ بہانہ تراشا کہ وہ رسول خداؐ کے حق میں جھوٹ بول رہے ہیں ان کے خلاف نہیں۔

استاد ابوریہ نے وضعی احادیث کی اقسام اور ان کے اسباب اور عصر صحابہ کے بعد ان کے فروغ کی بحث کے بعد اس جماعت کی نشاندہی کی ہے جو عصر صحابہ میں حدیث سازی کیلئے مشہور تھی اور جو بعد میں آنے والے حدیث سازوں کیلئے مرجع ثابت ہوئی چنانچہ استاد موصوف الاسرائیلیات فی الحدیث کے زیر عنوان لکھتے ہیں

''یہود، مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا کنبہ تصور کرتے تھے اور اپنے علاوہ کسی کی فضیلت کے قائل نہیں تھے۔ نہ وہ حضرت موسیٰ کے بعد کسی کی رسالت کو ماننے پر آمادہ تھے اور نہ ان کے احبار کسی کے شرف کے قائل تھے۔ جب وہ مغلوب ہوئے اور انہیں سرزمین عرب سے جلا وطن ہونا پڑا تو انہوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مکر و فریب کا ہمرنگ زمین جال بچھایا اور اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تاکہ لوگ انہیں مسلمان سمجھیں اور ان کے فریب کی طرف متوجہ نہ ہوسکیں۔ چنانچہ یہودی کاہنوں میں سے کعب الاحبار، وہب بن منبہ اور عبداللہ بن سبا[1] بڑے شاطر تھے۔ انہوں نے ظاہری زہد و تقویٰ کا مظاہرہ کیا اور جب انہیں لگا کہ اب مسلمان ان پر اعتماد کرنے لگ گئے ہیں تو انہوں نے اسلام کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا اور اپنے افسانوں کو مسلمانوں میں فروغ دینے لگ گئے۔

۱۔ یہ بات غلط طور پر مشہور کردی گئی ہے کہ عبداللہ بن سبا ایک یہودی تھا۔ عبداللہ بن سبا دراصل سیف بن عمر تمیمی کا تخلیق کردہ ایک افسانوی کردار ہے۔ ڈاکٹر طہٰ حسین نے الفتنۃ الکبریٰ میں بڑے وزنی دلائل کے ساتھ ابن سبا کے وجود سے انکار کیا ہے۔ علامہ مرتضیٰ عسکری نے تحقیق عمیق کے بعد اپنی کتاب عبداللہ بن سبا (مطبوعہ مجمع علمی اسلامی) میں اس افسانے سے پردہ اٹھایا ہے۔

چالاک اور شاطر یہودیوں نے دیکھا کہ قرآن مجید میں کسی طرح کی تحریف ممکن نہیں ہے کیونکہ قرآن مدوّن ہو چکا تھا اور لاکھوں مسلمان قرآن کو حفظ کر چکے تھے اس لئے انہوں نے اپنی تمام تر کوششوں کا رخ حدیث کی طرف موڑ دیا۔ چنانچہ انہوں نے جی کھول کر جھوٹی احادیث بنائیں اور کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ احادیث کے اصول اس وقت منضبط ہی نہیں ہوئے تھے اور جس طرح سے قرآن کی تدوین ہوئی تھی اس طرح سے حدیث کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ حدیث نہ تو عہد پیغمبرؐ میں مدون تھی اور نہ ہی صحابہ نے اسے جمع کیا تھا اسی لئے حدیث سازوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور انہوں نے دل کھول کر حدیث میں تحریف کی۔ جب کچھ صحابہ نے پچھلی امتوں کی تاریخ کے لئے ان سے رجوع کیا تو ان کا کام اور بھی آسان ہوگیا۔"

استاد موصوف کی یہ بھی سوچی سمجھی رائے ہے کہ حیات رسولؐ میں اور رحلت رسولؐ کے فوراً بعد حدیث کی عدم تدوین نے حدیث سازوں کے لئے اسلام کے خلاف سازشوں کی راہ ہموار کر دی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے بعد میں آنے والے کذب بیان افراد کے لئے وضع حدیث کا دروازہ کھول دیا اور انہیں یہ موقع فراہم کیا کہ وہ امراء وسلاطین کی خوشنودی کے لئے احادیث گھڑیں اور ملوکیت کو آئینی چھتری فراہم کریں اور ستم پیشہ حکام کے ظلم واستبداد کو ان کیلئے حلال اور جائز ثابت کریں۔

اگر وفات رسولؐ کے بعد حدیث وفقہ کی تدوین ہو جاتی تو آج مسلمانوں میں یہ تفرقہ بازی دکھائی نہ دیتی اور اگر بالفرض کوئی غلط بات کو رواج دینا بھی چاہتا تو مسلمانوں کے پاس صحیح احادیث کا ذخیرہ موجود ہوتا جس کی مدد سے وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر لیتے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہوسکتا تھا جب اصول حدیث مدون ہوتے جب ایک محقق ابوہریرہ اور ان کے" ہم قبیلہ" افراد کی وضعی احادیث کو دیکھتا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کی بنیادی ذمہ داری اُن حضرت پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے حدیث وفقہ کی تدوین سے منع کیا تھا۔ اگر انہوں نے اس اہم کام پر پابندی نہ

لگائی ہوتی تو ابن ابی العوجاء جیسے زندیق کو چار ہزار احادیث اسلام میں داخل کرنے کی جرأت نہ ہوتی جس میں اس نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرایا تھا۔

استاد ابو ریہ نے ابو ہریرہ، کعب الاحبار اور وہب بن منبہ وغیرہ کی بیان کردہ بہت سی ایسی روایات نقل کی ہیں جنہیں سنت نبوی شمار کیا جاتا ہے اور وہ احادیث اس وقت صحاح اہل سنت میں موجود ہیں۔

حالات و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ نے کعب الاحبار اور اس کے ''ہم قبیلہ'' افراد کو اپنا مقرب بنایا ہوا تھا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کعب نے معاویہ کی خوشنودی کیلئے شام وحمص میں رہائش پذیر مسلمانوں کی فضیلت میں رسول خداؐ کی طرف نسبت دے کر یہ حدیث بنائی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اَهْلُ الشَّامِ سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ، يَنْتَقِمُ اللّٰهُ بِهِمْ مِنَ الْعُصَاةِ ''اہل شام خدا کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں، ان کے ذریعہ سے خدا نافرمانوں سے انتقام لیتا ہے'' اور یہ بات بڑی واضح ہے کہ کعب الاحبار اور اس کے ولی نعمت معاویہ کی نظر میں نافرمانوں سے مراد امام علیؑ اور ان کے ساتھی ہیں کیونکہ وہ ہند کے بیٹے کو خلافت کیلئے نا اہل سمجھتے تھے۔

کعب الاحبار نے شام اور معاویہ کے زیرفرمان علاقوں کی تعریف میں ایک حدیث یہ تخلیق کی: ''شام خدا کا پسندیدہ ملک ہے اور خدا کے پسندیدہ بندے وہاں رہائش اختیار کریں گے۔ جو شام کو چھوڑ کر کہیں اور جائے گا وہ اپنے ساتھ خدا کی ناراضگی کو لے کر جائے گا اور جو شام میں داخل ہوگا وہ اپنے ساتھ خدا کی رحمت کو لے کر داخل ہوگا۔ شام کے لئے خوش خبری ہے۔ خدا اس پر اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شام کے ایک شہر حمص سے ستر ہزار افراد کو قیامت کے دن اٹھائے گا جن سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا اور ان پر کوئی عذاب نہیں ہوگا۔''[۱]

آخر اللہ تعالیٰ شام پر نظر کرم کیوں نہ کرے کہ وہاں کعب الاحبار کا ولی نعمت

۱۔ اضواء علی السنة المحمدیة ص ۱۳۱

حکومت کرتا تھا۔ شام اس لئے بھی خدا کا پسندیدہ خطہ تھا کہ اس پر یزید بن معاویہ اور بنی امیہ کی حکومت تھی !!

البتہ خدا نے مدینہ منورہ کو اپنی رحمتوں سے محروم کر دیا تھا جہاں اس کے پیارے حبیبؐ اور دوسرے صالح بندے مدفون تھے جنہوں نے ابوسفیان اور معاویہ کے علاوہ مشرکین قریش سے جہاد کیا تھا!!

حمص بھی خدا کو اس لئے محبوب تھا کہ کعب الاحبار نے وہاں آکر رہائش اختیار کر لی تھی اور وہیں دفن ہوا تھا نیز معاویہ کے وہ جاں نثار جنہوں نے خدا کی زمین میں فساد مچایا تھا اور خدا کے صالح بندوں کو قتل کیا تھا وہیں دفن تھے !!

استاد ابوریہ نے حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد تدوین حدیث کی ممانعت کرنے والوں کا اپنے مذہبی نقطہ نظر سے دفاع کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا عمل اخلاص پر مبنی تھا۔ اس بحث کے بعد انہوں نے ابوہریرہ پر خوب تنقید کی ہے جو وفات پیغمبرؐ سے صرف تین سال قبل مسلمان ہوئے تھے مگر اس کے باوجود ان سے چھ ہزار احادیث راویت کی گئی ہیں جبکہ صحابہ کرام کی جماعت میں ایسے ایسے اصحاب بھی موجود تھے جنہوں نے ایک طویل عرصہ آنحضرتؐ کے ساتھ گزارا تھا اور ان میں سب سے زیادہ نمایاں امام علیؑ کی شخصیت تھی۔ اگرچہ آپ شہر علم کا دروازہ تھے اس کے باوجود کتب حدیث میں آپ سے اتنی روایات نقل نہیں کی گئیں جتنی کہ ابوہریرہ سے۔

مؤلف نے حضرت ابوہریرہ کی زندگی کا مرقع اس لئے پیش کیا ہے کہ محترم قارئین ان کی وضع کردہ ان احادیث سے واقف ہوسکیں جو برادران اہل سنت کی کتب احادیث میں پائی جاتی ہیں۔

اہل سنت کی صحیح السند کتب حدیث میں ابوہریرہ کی احادیث کو بڑی فوقیت حاصل ہے جبکہ مؤلف کو تو محدثین کی اس روش پر حیرت ہے کہ انہوں نے ابوہریرہ پر کیسے اعتماد کرلیا اور ان کی بیان کردہ احادیث کو تقدس کا درجہ کیونکر دیدیا حالانکہ ان کی

احادیث مشکلات ، خرافات اورلاف زنی پر مشتمل ہیں۔زیادہ صحیح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابوہریرہ کی احادیث میں دین کومطعون کیا گیا ہےاور قرآن و اسلام کی تعلیمات کی نفی کی گئی ہے۔ اسلام اور قرآن کی مقدس تعلیمات تو انسانی عقول کو اوہام اور خرافات سے نجات دلاتی ہیں ،علم کی طرف راغب کرتی ہیں ،عقول کو جلا بخشتی ہیں نفوس کا تزکیہ کرتی ہیں ، انسانیت کے لئے مفید ہیں اور کفر و الحاد کے منافی ہیں۔

استاد ابو ریہ نے حضرت ابوہریرہ کا اصلی نام ڈھونڈھنے کی بھی بڑی کوشش کی ہے لیکن پوری بحث میں وہ ان کا اصلی نام نہیں بتا پائے ہیں۔ انہوں نے قطب حلبی کے حوالے سے ان کے اوران کے والد کے چوالیس نام لکھے ہیں۔ جبکہ نووی نے تیں ناموں میں سے ان کے لئے عبدالرحمٰن بن صخر کا نام منتخب کیا ہے۔

چنانچہ جب استاد ابوریہ چوالیس ناموں میں سے کوئی نام منتخب نہ کر سکے تو انہوں نے ان کی کنیت پر ہی اکتفا کرتے ہوئے خود ان کی زبانی ان کے نام کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے خاندان کی بکریاں چرایا کرتا تھاتو میرے ساتھ ایک بلی بھی ہوا کرتی تھی جس سے میں اکثر اوقات دل بہلایا کرتا تھا اس لئے میری کنیت ہی ابوھریرہ مشہور ہوگئی۔

حضرت ابوہریرہ کے بچپن اور جوانی کے حالات کا کسی کو کوئی علم نہیں ہے۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ انہیں کی روایت ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ میں انتہائی غریب اور نادار شخص تھا۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے لوگوں کی خدمت کیا کرتا تھا۔میں جوانی میں بسرہ بنت غزوان کا خدمتگار تھا اور وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلاتی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتی میں اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔جب وہ اونٹ پر سوار ہوتی تو میں حدی خوانی کرتا اور اس کا اونٹ ہانکا کرتا تھا۔

ابن قتیبہ کی روایت میں ہے کہ ابوہریرہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور وہ غزوہ خیبر کے وقت اسلام لائے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تیں برس سے کچھ زیادہ تھی۔ انہوں نے نبی اکرمؐ کی صحبت بھی اسی واسطے اختیار کی تھی کہ انہیں پیٹ بھر کر

کھانا نصیب ہو جیسا کہ احمد بن حنبل، بخاری اور مسلم نے سفیان سے اور سفیان نے زہری سے اور زہری نے عبدالرحمٰن اعرج سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا کہ میں نے ابو ہریرہ سے سنا کہ وہ کہتے تھے: ''میں ایک مسکین شخص تھا چنانچہ میں پیٹ بھرنے کے لئے رسول اکرمؐ کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔''

ابو ہریرہ، حضرت جعفر طیارؓ کو تمام صحابہ پر حتی کہ ان کے سگے بھائی حضرت علیؓ پر بھی فضیلت دیتے تھے کیونکہ وہ غریب پرور تھے اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے ابو ہریرہ کو اپنے لئے ''شیخ المضیر ہ'' کا لقب بڑا پسند تھا۔ مضیرہ ایک خاص قسم کا پکوان تھا جو معاویہ کے دستر خوان پر میسر ہوتا تھا۔ ابو ہریرہ کا یہ جملہ مشہور ہے:

مَضِیْرَۃُ مُعَاوِیَۃَ اَطْیَبُ وَاَدْسَمُ وَالصَّلٰوۃُ خَلْفَ عَلِیٍّ اَفْضَلُ

استاد ابوریہ لکھتے ہیں کہ ابو ہریرہ کا مطمح نظر ہمیشہ شکم پری ہوتا تھا خواہ اس کے لئے کتنی ہی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔ ثعالبی نے لکھا ہے کہ ابو ہریرہؓ کہتے تھے روٹی کی خوشبو سے بہتر خوشبو میں نے نہیں سونگھی اور کھجوروں پر مکھن سے بڑھ کر شہسوار میں نے نہیں دیکھا۔[1]

استاد ابوریہ کے مطابق ابو ہریرہ کی کثرت سے حدیث بیانی کے سبب لوگ انہیں اور ان کی احادیث کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ ابو رافعؓ کہتے ہیں کہ ایک قریشی لباس فاخرہ پہن کر نخوت سے چلتا ہوا ابو ہریرہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تم بہت زیادہ حدیثیں بیان کرتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم نے میرے اس لباس کے بارے میں بھی آنحضرتؐ سے کچھ سنا تھا؟ ابو ہریرہ نے کہا: میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا: ''تم سے پچھلی امت کا ایک شخص لباس پہن کر غرور اور نخوت سے چل رہا تھا کہ خدا نے اسے زمین میں دھنسا دیا۔ وہ قیامت تک زمین میں دھنسا رہے گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ تمہارے قوم اور قبیلہ سے تھا یا نہیں۔[2]

۱۔ الاضواء ص ۱۵۸ بحوالہ خاص الخاص ثعالبی ج ۲ ص ۱۱۲

۲۔ الاضواء ص ۱۶۲ بحوالہ البدایہ والنہایہ

معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ نے حدیث سازی پر کمر باندھ رکھی تھی اور ان کے لئے رسول اکرمؐ سے جھوٹ منسوب کرنا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ان کے اسی "فن" کی وجہ سے معاویہ ان کی قدردانی کرتا تھا اور اس نے انہیں اپنا مقرب بنایا ہوا تھا۔ معاویہ نے ان کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس ایک ایسا "فن" موجود ہے جس سے وہ اس کے تخت کو استحکام دے سکتا ہے اور اس کے مخالف امام علیؑ کی حکومت کو کمزور کرسکتا ہے۔ چنانچہ معاویہ نہ صرف انہیں مضیرہ کھلایا کرتا بلکہ بیت المال سے لاکھوں دینار انعام بھی دیا کرتا تھا۔ شدہ شدہ نوبت بانیجا رسید کہ پھٹے پرانے کپڑے پہننے والا ریشم و کمخواب پہننے لگ گیا۔[1]

ابوہریرہ اصحاب صفہ (وہ نادار صحابہ جو مسجد نبوی کے چبوترے میں رہتے تھے) میں سے تھے۔ رسول خداؐ کے زمانہ میں وہ پھٹے پرانے کپڑوں سے اپنا جسم ڈھانپا کرتے تھے اور اپنی شرم گاہ چھپانے کے لئے کپڑوں کو ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھتے تھے۔ جوئیں ان کے کپڑوں پر چلا کرتی تھیں اور وہ بھوک کی شدت سے نڈھال ہوکر مسجد میں گر پڑتے تھے۔ آنے جانے والے ان کی گردن پر پاؤں رکھ کر گزر جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ شخص پاگل ہے جسے بھوک کے سوا اور کوئی بیماری نہیں۔ یہ جملے ہم نے اپنی طرف سے نہیں کہے بلکہ خود ابوہریرہ نے اپنے متعلق کہے ہیں۔[2]

ابوہریرہ کی ابتدائی زندگی بڑی تنگدستی میں گزری تھی۔ وہ پیٹ بھرنے کے لئے لوگوں کی خدمت کیا کرتے تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جس دولت کے خواب دیکھا کرتے تھے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور میں انہیں ان کی تعبیر نہیں مل سکی تھی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے انہیں بحرین کی حکومت سے معزول کیا تو انہوں نے کہا:

۱۔ طبقات ابن سعد اور ابوہریرہ کی دیگر سوانح حیات دیکھئے۔

۲۔ الاضواء ص ۱۸۶ بحوالہ صحیح بخاری۔ السنۃ قبل التدوین در حالات ابوہریرہ ص ۴۱۳

"کیا تمہیں وہ دن یاد ہے جب میں نے تم کو بحرین کا حاکم بنا کر بھیجا تھا تو تمہارے پاؤں میں جوتی تک نہیں تھی۔" یہ ۲۱ھ کا واقعہ ہے۔

جس شخص کی یہ حالت ہو اس کے لئے نان شعیر کھانے والے علیؑ کو چھوڑنا اور لذیذ غذائیں کھلانے اور دولت کو سیال رکھنے والے بنی امیہ کی حمایت کرنا ہرگز تعجب خیز نہیں ہونا چاہئے۔

ابوہریرہ امام علیؑ کی حمایت کیسے کرسکتے تھے جبکہ وہ مالی معاملات میں اتنے محتاط تھے کہ انہوں نے اپنے نابینا بھائی عقیل کی طرف لوہے کی گرم سلاخ اس لئے بڑھائی تھی کہ عقیل نے ان سے اپنے حصہ سے زیادہ مانگا تھا تاکہ وہ اپنے بچوں کی بھوک مٹا سکیں لیکن امام علیؑ نے اپنے بھائی کو ان کے حصہ سے ایک دانہ بھی زیادہ دینا گوارا نہیں کیا۔ بھلا ایسے عادل اور محتاط علیؑ سے ابوہریرہؓ کی امیدیں کیسے برآتیں۔

اس سے قبل ابوہریرہ کو بنی امیہ کی داد و دہش کا تجربہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے جب حضرت عثمانؓ کے دربار میں یہ روایت پیش کی کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: میرے بعد تمہارے درمیان فتنہ و اختلاف پیدا ہوگا تو ایک کہنے والے نے یہ کہا تھا کہ یارسول اللہؐ! اس وقت ہم کس کی طرف رجوع کریں۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا: اس وقت تم "امین" اور اس کے اصحاب کا ساتھ دینا۔ یہ کہہ کر نبی اکرمؐ نے عثمانؓ کی طرف اشارہ کیا تھا۔" اس خود ساختہ روایت کے عوض حضرت عثمانؓ نے انہیں دس ہزار دینار انعام دیا تھا۔[1]

مصحف عثمانؓ کی ترویج کے لئے ابوہریرہ نے اپنی زنبیل سے یہ روایت نکالی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: میری امت میں مجھ سے زیادہ محبت کرنے والا گروہ وہ ہوگا جو میرے بعد آئے گا اور بغیر دیکھے مجھ پر ایمان لائے گا اور وہ معلق اوراق پر عمل کرے گا۔ اس سے ان کی مراد وہ مصاحف تھے جنہیں حضرت عثمانؓ نے لکھوایا تھا۔[2]

۱۔ الاضواء بحوالہ مسند احمد بن حنبل ۲۔ الاضواء بحوالہ البدایہ والنہایہ

عہد عثمانی میں حضرت ابوہریرہ بنی امیہ سے اپنے تعلقات استوار کر چکے تھے اور ان تعلقات کی وجہ سے ان کی دیرینہ امنگیں پوری ہونے لگی تھیں۔ بنی امیہ نے بھی انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ حضرت عثمانؓ انہیں انعام و اکرام سے نوازا کرتے تھے اور اپنے قریب رکھتے تھے۔ قتل عثمانؓ کے بعد ابوہریرہ نے امام علیؑ سے انحراف اور معاویہ سے الحاق کرلیا۔ معاویہ کو ایسے لوگوں کی شدید ضرورت تھی کیونکہ ایسے لوگ اس کے لئے حضرت عثمانؓ سے بھی زیادہ مفید تھے۔ چنانچہ معاویہ نے ان کی خوب قدر دانی کی اور انہیں سرکاری مراعات سے نوازا۔ اس نے ابوہریرہ کو مدینہ کے قریب عقیق میں ایک عالیشان محل تعمیر کروا دیا اور عقیق اور ذی الحلیفہ کی زمینیں الاٹ کر دیں۔ علاوہ ازیں معاویہ نے ابو ہریرہ پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ امیر عتبہ بن غزوان کی بہن بسرہ سے ان کا نکاح کروا دیا۔ یہ وہی بسرہ تھی جس کی ابوہریرہ خدمت کیا کرتے تھے۔[1]

ابن سعد نے خود ابوہریرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ دختر غزوان کے لئے میں نے اپنی جان کو کرایہ پر دے رکھا تھا۔ وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا تو کھلاتی تھی مگر کھڑے ہوئے اونٹ پر سوار ہونے کا حکم دیتی اور پابرہنہ چلنے پر مجبور کرتی تھی۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ وہ میری بیوی بن گئی تب میں اسے حکم دیتا تھا کہ وہ کھڑے ہوئے اونٹ پر سوار ہو اور پا پیادہ میرے پیچھے چلے۔[2]

کسی بھی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ ابوہریرہ نے میدان کارزار میں معاویہ کی حمایت میں تلوار اٹھائی ہو۔ اس بات کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جسے محدثین نے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ میدان صفین میں موجود تھے۔ وہ نماز امام علیؑ کے پیچھے پڑھتے تھے مگر کھانا معاویہ کے دستر خوان پر کھاتے تھے اور عین لڑائی کے وقت پہاڑ پر چڑھ جاتے تھے۔ جب کسی نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا:

۱۔ الاضواء ص ۱۸۷ ۲۔ طبقات ابن سعد مطبوعہ بیروت

عَلِيٌّ اَعْلَمُ وَمُعَاوِيَه اَدْسَمُ وَالْجَبَلُ اَسْلَمُ علیؑ کا علم زیادہ ہے، معاویہ کا کھانا روغنی ہے اور پہاڑ پر بیٹھنے میں سلامتی ہے۔[۱]

ممکن ہے کہ خود معاویہ نے ابوہریرہ سے کہا ہو کہ جنگ کے دوران وہ اس سے علیحدہ رہے تاکہ اس کی غیر جانبداری کو دیکھ کر علیؑ کے ساتھی اس کے دھوکے میں آسکیں اور اس کی جھوٹی احادیث کے جال میں پھنس سکیں کیونکہ ابوہریرہ کے پاس جو ہتھیار تھا وہ معاویہ کے کسی ساتھی حتی کہ اس کے دست راست عمرو بن عاص کے پاس بھی نہیں تھا۔ معاویہ کو شمشیر زنی کے لئے ابوہریرہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کام کے لئے تو اہل شام ہی کافی تھے۔

معاویہ کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کی فضیلت میں رسول اکرمؐ نے کوئی حدیث ارشاد نہیں فرمائی تھی۔ دوسری طرف اس کے حریف امام علیؑ کی شان میں بے شمار احادیث موجود تھیں۔ فضیلت کے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ابوہریرہ، معاویہ کی مجبوری بن گیا تھا۔ معاویہ کو ابوہریرہ اور ان کے ہم پیشہ افراد کی شدید ضرورت تھی تاکہ وہ اس کی فضیلت رفقیت میں حدیث سازی کریں اور علیؑ پر زبان طعن دراز کر کے لوگوں کو علیؑ سے منحرف کردیں۔ چنانچہ حدیث سازی ایک ایسا ہتھیار تھا جو ہزاروں تلواروں پر بھاری تھا۔

معاویہ کی خواہش تھی کہ اس کے پاس شیخ المضیرہ جیسے بیسیوں افراد ہوں جو اس کی مدح اور علیؑ کی قدح میں احادیث تخلیق کریں جو عشق پیچاں کی طرح پھیل جائیں۔ اور معاویہ اس کام کا بڑے سے بڑا معاوضہ دینے پر تیار تھا۔

چنانچہ خطیب بغدادی نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک تیر اٹھا کر معاویہ کو دیا اور فرمایا: یہ تیرے لئے ہے۔ تو اس تیر کو لے کر جنت میں مجھ سے ملاقات کرنا۔ ابن عساکر، ابن عدی اور خطیب بغدادی نے ابوہریرہ سے روایت

۱۔ ابوہریرہ از استاد محمود ابوریہ مصری

استاد ابوریہ اپنی کتاب ابو ھریرہ میں ''ابوہریرہ اور بنو امیہ کی پیروی'' کے زیرِعنوان لکھتے ہیں: ابوہریرہ نے صرف شکم پُری کی غرض سے نبی اکرمؐ کی صحبت اختیار کی تھی جیسا کہ انہوں نے خود کئی بار اپنی ناداری کے اظہار کے لئے اس کا اعتراف بھی کیا تھا۔ وہ نبی اکرمؐ اور دوسرے مخیّر صحابہ کی طرف سے ملنے والے طعام سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ اور جس شخص کا مقصد ہی پیٹ بھرنا ہو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ نبی اکرمؐ اور شیخین کے عہد تک بے قدر ہی رہے۔ پھر حضرت عثمانؓ کے عہد میں ایک عرصہ تک گمنام رہنے کے بعد وہ منظرِعام پر آئے۔

پھر جب امام علیؑ اور معاویہ کے درمیان جنگ ہوئی — اگر آپ چاہیں تو اسے بنی امیہ اور بنی ہاشم کی جنگ[۱] بھی کہہ سکتے ہیں — اور اس جنگ کی وجہ سے مسلمانوں میں گروہ بندی وجود میں آئی تو ابوہریرہ نے وہاں کا رخ کیا جہاں اس کی طبیعت مائل تھی۔ اس نے معاویہ کے کیمپ کو چنا کیونکہ وہاں انواع و اقسام کے پکوان اور ہر طرح کا آرام میسر تھا جبکہ علیؑ کے پاس فقر و زہد کی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔

جس شخص نے ابوہریرہ کی سی زندگی بسر کی ہو اس کے لئے علیؑ کو چھوڑ دینا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اگر ایسا شخص معاویہ کی طرف چلا جائے — جس کا پرتکلف دسترخوان سجتا ہو اور جو سرکاری اعزازات و القابات عطا کرتا ہو — تو یہ بات کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔ استاد ابوریہ نے ابوہریرہ کی ان احادیث کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جس میں انہوں نے معاویہ کا حق نمک ادا کیا تھا۔ وہ معاویہ کے منت کش تھے جنہوں نے انہیں غربت سے امارت میں داخل کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے معاویہ کا احسان اتارنے کے لئے مسلمانوں کو جعلی احادیث کے تیزاب میں ڈال کر ملائم کیا اور جدھر معاویہ چاہتا تھا ادھر موڑ دیا۔

استاد ابوریہ نے ابوہریرہ کی زندگی کے تمام مراحل اور اموی حکومت سے ان

۱۔ یہ وہی سوچ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے دو پہلو تھے ایک دینی اور دوسرا دنیاوی۔ اسی سوچ کے حامل لوگ کہتے ہیں کہ کربلا کی جنگ دو شہزادوں کی جنگ تھی۔

کی ہے کہ ابوہریرہ کہتے ہیں: میں نے رسول اکرمؐ سے سنا۔ آپ نے فرمایا: اللہ نے اپنی وحی پر مجھے جبرئیلؑ کو اور معاویہ کو امین بنایا ہے۔[۱]

ایک دن ابو ہریرہ نے عائشہ بنت طلحہ کو دیکھا تو کہا: سبحان اللہ! تیرے گھر والوں نے تجھے بڑی اچھی غذا کھلائی ہے۔ خدا کی قسم میں نے تیرے چہرے سے زیادہ حسین چہرہ کوئی اور نہیں دیکھا البتہ منبر رسولؐ پر جب معاویہ بیٹھتا تھا تو اس کا چہرہ تجھ سے زیادہ حسین ہوتا تھا۔[۲]

اعمش (ابومحمد سلیمان بن مہران کوفی ۶۰ھ ـ ۱۴۸ھ) بیان کرتے ہیں کہ عام الجماعۃ[۳] میں جب ابوہریرہ، معاویہ کے ساتھ عراق آئے اور مسجد کوفہ پہنچے تو استقبال کرنے والوں کی بھیڑ دیکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور اپنا سر پیٹ کر بولے:

اے اہل عراق! کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ میں خدا اور اس کے رسولؐ پر جھوٹ باندھتا ہوں اور اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں جلانا چاہتا ہوں؟ خدا کی قسم! میں نے رسول اکرمؐ کو یہ کہتے سنا ہے کہ "ہر نبی کا ایک حرم ہوتا ہے اور مدینہ میں میرے حرم کی حدود عیر سے ثور تک ہے۔ جس نے اس میں زیادتی کی اس پر اللہ، ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی۔" میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ علی (ع) نے اس میں زیادتی کی تھی۔ جب معاویہ نے یہ حدیث سنی تو نہال ہو کر اس نے ابوہریرہ کو انعام دیا اور مدینہ کا گورنر بنا دیا۔[۴] یہ بغض علیؑ اور حب معاویہ کی ایک اور مثال ہے۔

۱۔ الاضواء ص ۱۸۹ بحوالہ البدایہ والنہایہ

۲۔ العقد الفرید ج ۲ ص ۱۰۹

۳۔ عام الجماعۃ سے مراد ربیع الاول ۴۱ھ ہے جب امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان صلح کے بعد تمام بلاد اسلامی پر معاویہ کی حکومت ہوگئی۔ اس سال کو عام الجماعۃ اس لئے کہتے ہیں کہ تمام صحابہ و تابعین نے معاویہ کی بیعت پر اتفاق کیا اور کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ یہ جو مکتب خلفاء کے پیروکار اہلسنت والجماعۃ کہلاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا خلفاء کی پیروی پر اتفاق اور اجماع ہے اور وہ ان کی مخالفت نہیں کرتے۔

۴۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۵۸ اور سفینۃ البحار (ہرر) ص ۷۱۲

کی وفاداری کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔انہوں نے ابوہریرہ کی بہت سی خود ساختہ احادیث بھی نقل کی ہیں جنہیں محدثین اہل سنت نے اصول و فروع کے زیر عنوان اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔انہوں نے یہ تذکرہ پوری دل سوزی اور دین وعلم وحق کے جذبے سے سرشار ہوکر کیا ہے۔تمام تر تفصیل لکھنے کے بعد وہ کہتے ہیں:

''ہم نے ابوہریرہ کی جو داستان لکھی ہے وہ سچ پر مبنی ہے۔ہم نے ان کی شخصیت کا جو رُوپ پیش کیا ہے وہ خدا نے انہیں عطا کیا تھا۔اس پوری بحث میں ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ صرف وہ صحیح روایتیں پیش کی ہیں جو ہم نے مستند مصادر سے اخذ کی ہیں اور جن کی صحت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ہم نے بہت سے ایسے واقعات نقل کرنے سے گریز کیا ہے جسے صحیح تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کیونکہ ہمارے ہاں کے دینی شیوخ ہمیشہ حق کی سربلندی سے خوفزدہ رہتے ہیں اور وہ قوت برہان کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔''

حق یہ ہے کہ استاد ابوریہ نے ابوہریرہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے تاریخی حقائق اس کی تائید کرتے ہیں مگراس کے باوجود اکثر دینی شیوخ ابوہریرہ کو مقدس انسان مانتے ہیں اور ان کی روایات کونقل کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ صحابی تھے اور ہر صحابی عادل ہوتا ہے چنانچہ انہیں ابوہریرہ کی روایات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔اس کے برعکس جب کوئی شیعہ راوی روایت کرتا ہے تو ہمارے شیوخ اسے ٹھکرانا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ یہ راوی اہلبیتؑ کا پیرو ہوتا ہے [۱] ان کی نظر میں تشیع ناقابل معافی جرم ہے جو کہ فسق کا موجب ہے جبکہ رسول خداؐ کی چند روزہ صحبت انسان کو تمام گناہوں سے محفوظ بنا دیتی ہے۔[۲]

محدثین کے اس خود ساختہ نظریہ سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا صحابہ میں

۱۔ دیکھئے: مقدمہ ابن خلدون جہاں اس نے امام مہدیؑ کے متعلق واردشدہ احادیث کو یہ کہہ کر رد کیا ہے کہ ان روایتوں کے راوی شیعہ ہیں یا ان پر شیعیت کی تہمت لگائی گئی ہے ص ۳۱۹ تا ۳۲۹

۲۔ الاضواء علی السنۃ المحمدیہ محدثین اہل سنت کے مطابق تمام صحابہ عادل ہیں اور ان پر کسی طرح کی جرح وتنقید درست نہیں ہے۔

کوئی منافق تھا ہی نہیں اور تمام صحابہ ہر قسم کی بشری لغزشوں سے بالاتر تھے اور ان میں سے کسی نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد نہ کوئی صحابی مرتد ہوا تھا اور نہ کسی نے آپ کی سنت و سیرت میں کوئی تبدیلی کی تھی۔ اور کتب تاریخ کے تمام صحیح ترین واقعات جیسے وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے تھے۔

شیخ خضری نے کتب تاریخ وحدیث و رجال سے تجاہل عارفانہ کا ثبوت دیتے ہوئے لکھا ہے: ابو ہریرہ وفات رسولؐ تک آپ کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ علم سے لبریز ظرف کی مانند تھے۔ وہ عظیم ائمہ فتویٰ میں سے ایک تھے۔ عبادت و تواضع میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ وہ حافظ ترین صحابہ میں سے تھے۔ ابن عمرؓ نے ان سے کہا تھا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم رسول خداؐ کی پیروی نہ کر سکتے اور ان کی حدیث پر عمل نہ کر سکتے۔[۱] حضرت ابو ہریرہ نے خود اپنے بارے میں کہا تھا: میرے پاس علم کے کئی "دفتر" ہیں جنہیں میں نے ابھی کھولا نہیں۔ اور میں نے رسول خداؐ سے علم کے دو "ظرف" حاصل کئے تھے۔ ایک کو تو میں نے پھیلا دیا ہے اور اگر میں دوسرے کو پھیلا دوں تو یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔ اور جو کچھ مجھے معلوم ہے اگر وہ سب کا سب میں تمہیں بتادوں تو لوگ کہیں گے کہ ابو ہریرہ دیوانہ ہو گیا ہے۔[۲]

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۵۰

ابو ہریرہ کے ممدوح جامعہ ازہر کے یہی شیخ محمد خضری تاریخ امۃ الاسلامیہ کے صفحہ ۵۱۷ پر لکھتے ہیں: اِنَّ الْحُسَیْنَ اَخطَأَ خَطَأً عَظِیْمًا فِیْ خُرُوْجِهِ هٰذَا الَّذِیْ جَرَّ لِاُمَّةِ وَبَالَ الْفُرْقَةِ وَالْاِخْتِلَافِ وَزَعْزَعَ عِمَادَ اُلْفَتِهَا اِلٰی یَوْمِنَا هٰذَا "یعنی حسین (ع) نے (یزید کے خلاف) خروج کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ انہوں نے وحدت امت کی بنیادوں کو ہلا دیا جس سے امت ایسے اختلاف اور افتراق کے جنجال میں پھنس گئی کہ آج تک نکل نہیں سکی۔

کسی ایسے ہی کم نظر عالم کے لئے یگانہ چنگیزی نے کہا تھا ؎

ڈوب کر پار اتر گیا اسلام　　آپ کیا جانیں کربلا کیا ہے

۲۔ السنۃ قبل التدوین ص ۴۲۶ بحوالہ طبقات ابن سعد، فتح الباری اور حلیۃ الاولیاء

محمد عجاج خطیب لکھتے ہیں:اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کے پاس علم کا جو دوسرا برتن تھا اس میں احکام اور آداب و اخلاق سے متعلق احادیث نہیں تھیں۔ممکن ہے اس میں سے بعض کا تعلق قیامت کے شرائط یا ملت اسلامیہ میں ہونے والے انتشار اور برے حکمرانوں سے ہو۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو ہریرہ اپنے ناپسندیدہ حکمرانوں کی مذمت اشاروں کنایوں میں کیا کرتے تھے اور اپنی جان کے خوف سے کسی کا نام نہیں لیتے تھے مثلاً وہ کہا کرتے تھے: اعوذ باللّٰہ من راس الستین و امارۃ الصبیان میں ساٹھویں سال کے اختتام اور لڑکوں کی حکومت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

ہمیں تو ابو ہریرہ کے وکلائے صفائی پر حیرت ہے جو ایک طرف تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ وفات رسولؐ سے تین سال پہلے اسلام لائے تھے اور انتہائی نادار شخص تھے۔ ان کا سب سے بڑا مقصد شکم پُری تھا۔اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ انہیں علم رسولؐ کے دو برتن ازبر تھے لیکن انہوں نے اپنی جان کے خوف سے علم کے دوسرے برتن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا تھا۔ان باتوں تو یوں لگتا ہے کہ پوری امت میں رسول خداؐ کو حضرت ابو ہریرہ کے سوا کوئی ایسا شخص ملا ہی نہیں تھا جس کے سامنے آپ اپنے علم کا اظہار کرتے۔جبکہ آنحضرتؐ کے صحابہ میں ایسے افراد بھی موجود تھے جو آپ کی بعثت سے لے کر رحلت تک آپ کے ساتھ ساتھ رہے تھے۔

شیخ خضری کا خیال ہے کہ حضرت ابو ہریرہ وفات رسولؐ تک آنحضرتؐ کے ساتھ وابستہ رہے اور وہ عظیم ائمہ فتویٰ میں سے تھے۔کسی بھی راوی نے ۷ھ سے پہلے ان کے اسلام کا تذکرہ نہیں کیا۔رسول خداؐ اور شیخین کے عہد میں انہیں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ عہد عثمانؓ سے پہلے کسی نے بھی ان کی حدیث کو قبول نہیں کیا تھا

حضرت رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے زمانہ میں ان کے اپنے اعتراف کے مطابق ابو ہریرہ کا مقصد صرف پیٹ بھرنا تھا اور سرکارؐ کی وفات کے بعد بھی ان کا یہی مقصد رہا تھا۔ بزرگ صحابہ کی ایک جماعت نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ یہ

شخص بہت بڑا کاذب ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی انہیں کوڑے مارے تھے اور دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے احادیث بیان کیں تو میں تمہیں مدینہ سے تمہارے آبائی علاقے کی طرف جلاوطن کردوں گا جہاں تم اسلام لانے سے پہلے بکریاں چرایا کرتے تھے[۱]

ان سارے حقائق کے باوجود استاد خضری نے ابو ہریرہ کے لئے وہ القاب لکھے ہیں جو انہوں نے کسی بھی صحابی کے لئے نہیں لکھے حتی کہ بعثت رسولؐ سے لے کر رحلت رسولؐ تک حضور کے ساتھ سائے کی طرح رہنے والے علی ابن ابی طالبؑ کے لئے بھی نہیں جن کی پوری زندگی پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ گزری تھی اور جو تمام حالات میں ان کے ساتھ رہے تھے۔ حالانکہ خضری اس سے بے خبر نہیں تھے کہ ابو ہریرہ اور معاویہ کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی اور ابو ہریرہ نے لوگوں کو حضرت علیؑ سے منحرف کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اور وہ اس سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ ابو ہریرہ نے سینکڑوں احادیث گھڑ کر سنت کے اصولوں میں رد و بدل کیا تھا۔

ہم تاریخی شواہد اور محدثین کے کلمات سے کچھ مثالیں دے کر صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وفات پیغمبرؐ کے بعد جن صحابی نے تدوین حدیث سے منع کیا تھا انہوں نے ہی لوگوں کے لئے رسول خداؐ پر جھوٹ باندھنے کی راہ ہموار کی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کعب الاحبار اور ابوہریرہ وغیرہ جھوٹی احادیث کو سنت صحیحہ میں کبھی داخل نہ کرسکتے اور آج ہمارے علماء میں حدیث و فقہ کا یہ وسیع اختلاف موجود نہ ہوتا اور ابن ابی العوجاء جیسے زندیق کو موقع نہ ملتا کہ وہ اسلام میں ایسی احادیث داخل کردے جن میں اس نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کردیا تھا۔

استاد ابوریہ نے بالکل درست فرمایا ہے:

جس طرح سے صحابہ کرام نے قرآن حکیم کی تدوین کی تھی اسی طرح اگر وہ حدیث کی تدوین کرتے تو احادیث پیغمبرؐ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے متواتر

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی ،الاضواء علی السنۃ المحمدیہ

ہوتیں اور ذخیرۂ احادیث میں صحیح، حسن اور ضعیف جیسی اصطلاحات دکھائی نہ دیتیں۔
جس طرح سے یہ اصطلاحات صدر اول میں نہیں تھیں اسی طرح سے بعد میں بھی ان کو وضع کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور یوں امت اختلاف سے بچ جاتی۔اور ہمارے علماء کے کندھوں سے حدیث کی صحت اور ضعف کا بوجھ بھی اتر جاتا۔نہ انہیں رجال کی ضخیم کتابیں لکھنی پڑتیں اور نہ رواۃ پر جرح و تعدیل کی طویل بحثیں کرنی پڑتیں۔ اگر علم حدیث صدر اول میں مدوّن کر لیا جاتا تو آج ہمارے علماء ایک ہی نہج پر چلتے ہوئے دکھائی دیتے اور ان میں کسی طرح کا کوئی اختلاف نہ ہوتا اور آج ان کے دلائل شرعیہ کو تواتر کی حیثیت حاصل ہوتی۔ انہیں ''ظن غالب'' پر عمل کرنے کی احتیاج نہ ہوتی۔ یقین جانئے اسی ظن غالب نے اختلافات کے دروازے کھولے ہیں اور امت کے حقوق کو پارہ پارہ کیا ہے۔ اسی ظن غالب نے امت کو فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور اس کا اثر مستقبل میں بھی باقی رہے گا۔

ہم اپنی اس بات کو پھر دُہراتے ہیں کہ اگر خلیفہ لوگوں کو امام علیؑ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتے اور حدیث کی جمع و تدوین کا کام ان کے سپرد کر دیتے تو حدیث میں جھوٹ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا۔ اس طرح فقہاء اور رواۃ ایک ہی راستے کے راہی نظر آتے اور ان میں تضاد اور اختلاف پیدا نہ ہوتا۔

امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ احمد بن حنبلؒ، نسائیؒ اور حاکم نیشاپوریؒ کے علاوہ دیگر علماء نے لکھا ہے کہ معتبر اسناد کے ساتھ جتنے فضائل حضرت علیؑ کی شان میں مروی ہیں اتنے کسی اور صحابی کے مروی نہیں ہیں۔ جاحظ کہتے ہیں کہ اسلام میں سبقت اور دین میں شرف تقدم کا معاملہ ہو یا فہم اسلام کا معاملہ ہر جگہ علیؑ ہی فرد اول دکھائی دیتے ہیں۔

احمد بن حنبلؒ لکھتے ہیں کہ ہم تک کسی صحابی کے فضائل کی اتنی احادیث نہیں پہنچی

ہیں جتنی حضرت علیؑ کی بابت پہنچی ہیں۔[1] امام علی علیہ السلام نے ۳۴ سال کا طویل عرصہ اللہ کے رسولؐ کے ساتھ گزارا تھا۔ آپ غزوہ تبوک کے علاوہ آنحضرتؐ کے ساتھ تمام سفر و حضر میں شریک رہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب رسول خداؐ نے

۱۔ اسی طرح حاکم نیشاپوری مستدرک ج ۳ ص ۱۰۷ مطبوعہ حیدر آباد دکن اور حسکانی حنفی شواھد التنزیل ج ۱ ص ۶۳ حدیث ۱۱۰۸ مطبوعہ بیروت میں لکھتے ہیں: ماجاء لاحد من اصحاب رسول اللہؐ من الفضائل ماجاء لعلی بن ابی طالب ہم تک کسی صحابی کے اتنے فضائل نہیں پہنچے جتنے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے پہنچے ہیں۔ (اس بحث کے آخر میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ فتنہ وضع حدیث کے مسلمان معاشرے پر نہایت گہرے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ فی نفسہ حدیث کو ہی رد کر دیا جائے جو قرآن کے بعد استنباط احکام کے لئے اصل ثانی ہے جیسا کہ بعض یورپی مستشرقین مثلاً گول ڈزیہر وغیرہ نے کہا ہے۔ احادیث کے بارے میں روایتی اسلامی تنقید کو نیز صحیح اور وضعی احادیث میں فرق کرنے کے لئے مقرر کئے گئے معیارات کو ان یورپی مستشرقین کی تنقید سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے جو احادیث کے سارے مجموعے پر اعتراض کرتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے مستشرقین کی یہ سوچ دین مبین اسلام کے مکمل ڈھانچے پر شدید ترین معاندانہ حملے کے مترادف ہے۔ ہمارے علمائے اعلام نے حدیث اور اصول حدیث کے ضمن میں صحیح اور ضعیف احادیث کو جانچنے کے لئے نیز راویان حدیث کے حالات اور حدیث کی درایت کے سلسلے کی تحقیق کے لئے مختلف علوم وضع کئے ہیں جن سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ برادران اہلسنت کی کتب حدیث کو جھوٹ کا پلندہ کہہ کر یکسر رد نہیں کیا جاسکتا۔ ان کتابوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت ساری "صحیح" احادیث موجود ہیں۔

ملوکیت کے سائے میں جو حدیث سازی ہوئی ہے اور نص کے مقابلے میں جو اجتہاد ہوا ہے اس سے اسلام میں جن انحرافات نے جنم لیا اس سلسلے میں عرض ہے کہ مثلاً جب کسی سائنسی، علمی یا سیاسی نظریے میں غلطی ہو جاتی ہے تو بعد میں آنے والے اہل نظر اس غلطی کی تلافی کر دیتے ہیں اور تحقیق کے سائے میں علم و دانش کا کارواں آگے بڑھتا رہتا ہے لیکن جب کسی دینی فکر اور عقیدہ میں کجی آجائے تو معاملہ اتنا سادہ نہیں رہتا کیونکہ عقیدہ انسان کی پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔

انہیں مدینہ میں رہنے کا حکم دیا تو انہیں مدینہ میں رہنا شاق محسوس ہوا۔ یہ دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ''کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ

اگر اسلام میں جو آخری آسمانی دین ہے جھوٹ کی ملمع کاری کے ذریعے غلط عقائد اور احکام کو شارع مقدس سے منسوب کر دیا جائے تو یہ ایسی غلطیاں ہیں جو نسلوں تک کروڑوں انسانوں کو متاثر کرتی ہیں اور ایسی غلطیوں کی تلافی بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر صحیح مسلم میں جلد ۷ صفحہ ۹۵ پر حدیث ۱۳۹ اور سنن ابن ماجہ جلد ۲ صفحہ ۸۲۵ پر کتاب الرھون باب تلقیح النخل میں انس بن مالکؓ سے مروی یہ حدیث موجود ہے کہ ایک روز رسول اکرمؐ کسی نخلستان سے گزرے تو آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجور کے درختوں پر زیرہ پاشی کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ نے انہیں زیرہ پاشی سے منع فرمایا جس کے سبب اس سال مدینہ میں کھجور کی فصل خراب ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد جب دوبارہ آنحضرتؐ کا گزر اس نخلستان سے ہوا تو آپ نے پوچھا کہ تمہاری کھجوریں کیوں خراب ہوگئی ہیں؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہؐ! آپ ہی نے فرمایا تھا کہ تم زیرہ نہ چھڑکو۔ چنانچہ ہم نے آپ کی بات مانی اور ہماری فصل خراب ہوگئی۔ اس پر رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''تم اپنے دنیاوی امور کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔''

انس بن مالک نے دو ہزار تین سو سے زائد جھوٹی احادیث رسول اکرمؐ سے منسوب کی ہیں۔

مندرجہ بالا حدیث یہ سمجھاتی ہے کہ دین صرف اس لئے آیا ہے کہ یہ بتائے کہ نماز کیسے پڑھنی ہے، روزہ کیسے رکھنا ہے اور حج کیسے کرنا ہے لیکن دنیا کے معاملات سے دین کا کوئی تعلق نہیں اور دنیَی معاملات لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے ہیں کیونکہ وہ انہیں بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

ایسی احادیث کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ اگر رسول اکرمؐ نماز روزے کی تعلیم دیں تو اسے مان لینا چاہیے لیکن دنیاوی امور میں ان کی بات ماننا ضروری نہیں کیونکہ ان معاملات میں وہ اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنے کے سبب غلطی کھا جاتے ہیں اور ان معاملات کے بارے میں اُن پر کوئی وحی نہیں آتی۔ کیا ایسی حدیثوں کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ دین سیاست سے جدا ہے؟ یعنی دین اجتماعی امور اور انسانوں کے دنیاوی مسائل سے الگ ہے اور اس کے پاس ان معاملات کے بارے میں کہنے کو کچھ نہیں ہے۔

سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔"

دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے دینی رہبر ہیں۔دنیاوی معاملات میں وہ ہماری صحیح رہنمائی نہیں کرسکتے۔ہم اپنا سیاسی سماجی، عدالتی، اقتصادی اور تعلیمی نظام بہتر طور پر وضع کرسکتے ہیں۔اپنی میڈیا پالیسی، خارجہ پالیسی اور مالیاتی پالیسی بنانے کی اجازت خود نبی کریمؐ نے ہمیں مرحمت فرمائی ہے کیونکہ ہم اپنے دنیاوی امور کو آنحضرتؐ سے بہتر سمجھتے ہیں۔(اے اللہ! ہم ایسی فکری غلطی سے تیری پناہ مانگتے ہیں)۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے   کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اس اکیڈمک بحث سے ہمارا مقصد متنازعہ فیہ مسائل پر نہ مجادلہ کرنا ہے نہ محاکمہ کرنا نہ حرب عقائد کا اعلان جس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہا۔ہم ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب اور ایک قبلہ کے ماننے والے تمام اسلامی بھائیوں کا احترام کرتے ہیں۔ہم تقریب بین المذاہب کے قائل ہیں۔اور ہمارا نعرہ کلمة التوحید و توحید الکلمة ہے۔ہم تو دیانتداری کے ساتھ حقائق بیان کر کے ملت کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ قال قال رسول اللہؐ کے عنوان سے ملنے والی ایسی تمام حدیثوں کی کھلے دل و دماغ سے تحقیق کیجئے اور سوچئے کہ کہیں ہم رسول پاکؐ کی شان میں "توہین" کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔ایسی ہی حدیثیں مستشرقین مثلاً گولڈ زیہر اور منحرفین مثلاً سلمان رشدی کے ترکش میں اسلام کے خلاف تیر ہیں جن سے وہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ناپاک حملوں کی جسارت کرتے رہتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ہم بیک وقت گرم اور سرد پھونکیں مار رہے ہیں بلکہ خدا گواہ ہے کہ ہم اپنے عظیم رہنما علی بن ابی طالبؑ کے تتبع میں ملت کی یکجہتی کے خواہاں ہیں اور سرکار ختمی مرتبتؐ کی ذات گرامی کو ملت کے لئے نقطہ اتحاد جانتے ہیں۔شیعہ اور سنی اس ملت کے دو مضبوط بازو ہیں۔ہم کبھی یہ پسند نہیں کریں گے کہ ہمارا کوئی ایک بازو کمزور ہو۔ہم دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ ملت استعمار کی سازشوں سے چوکنا رہے کیونکہ استعمار نہیں چاہتا کہ پھر سے اسلام کا پھریرا ساری دنیا میں لہرائے۔عالم اسلام کی شیرازہ بندی سے خوفزدہ یہ استعمار مسلمانوں کو باہم دست وگریبان کرنا چاہتا ہے تاکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے۔

بعد رسولؐ اسلامی فقہ میں تشیّع کا کردار

گزشتہ بحث سے یہ واضح ہوگیا ہے کہ وفات رسولؐ کے بعد دور صحابہ میں اسلامی فقہ کے بیان میں تشیّع کا کردار نمایاں رہا ہے۔ زمانۂ رسولؐ میں اور آپ کے بعد امام علیؑ نے فقہ و حدیث کی متعدد کتابیں بطور خاص تالیف کیں حتیٰ کہ جو لوگ اس کے مدعی ہیں کہ اس دور میں مسلمانوں کا طریقہ صرف زبانی احکام بیان کرنے اور زبانی احادیث روایت کرنے تک محدود تھا وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ امام علیؑ نے حلال و حرام کے بیان میں خود اپنے دست مبارک سے ایک کتاب لکھی تھی۔

اسی طرح بڑی تعداد میں صحیح احادیث شیعہ محدثین نے ائمۂ اہلبیتؑ سے روایت کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امام علیؑ نے ایک کتاب مسائل قضاء سے متعلق، ایک کتاب واجبات سے متعلق اور ایک کتاب ایسی لکھی تھی جو فقہ کے تمام ابواب پر محیط تھی۔ ان کتابوں کا کچھ حصہ خود رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو املاء کرایا تھا۔ امام علیؑ اور ان کے پیروکار گاہے گاہے ان احکام کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے جو اُن کتابوں میں بیان ہوئے تھے۔ امام علیؑ کی شہادت کے بعد یہ کتابیں آپ کی نسل پاک میں ہونے والے اماموں کی تحویل میں رہیں۔ جس زمانے میں اہلبیتؑ اور ان کے ماننے والوں پر سختی تھی ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسلامی احکام کے بارے میں اپنی رائے علانیہ بیان کرسکیں اور نہ وہ افتاء و قضا کا کام سنبھال سکتے تھے۔ جب امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی امامت کا زمانہ آیا اور حالات اس کے

لئے سازگار ہوئے کہ وہ اپنے جدامجد حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کو پھیلا سکیں، اس وقت یہ ممکن ہوا کہ ان کتابوں میں جو فقہ کے ابواب اور حلال وحرام کے مسائل جمع کئے گئے تھے ان کی اشاعت کرسکیں، ان کتابوں کی اطلاع شیعہ حلقوں میں پھیل گئی اور ان دونوں اماموں کے ان شاگردوں کو بھی مل گئی جو اپنی تعلیم کا زمانہ ختم کر کے حجاز، عراق اور دوسرے اسلامی ملکوں میں منتشر ہوگئے تھے۔
ان دونوں اماموں کے متعدد بزرگ اصحاب نے ان کتابوں کو بچشم خود دیکھا۔

شیعوں نے اسلامی احکام کی تشریح کے سلسلے میں صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ فقہی احکام کو کتابی صورت میں مدوّن کردیا ہو بلکہ شیعہ قاضی اور منصف کے فرائض کی بجاآوری میں بھی ممتاز رہے ہیں۔ اس ضمن میں امام علیؑ کو تمام صحابہ پر برتری حاصل تھی۔ جب بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ درپیش ہوتا اور اس کے بارے میں مختلف آراء ظاہر کی جاتیں تو آپ کا قول فیصلہ کن ثابت ہوتا اور مشکل حل ہوجاتی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کی طرف سے توجہ ہٹا سکے یا آپ کے فیصلے پر کوئی قدغن عائد کرسکے حتیٰ کہ خلفاء کو بھی کوئی مشکل درپیش ہوتی تو ان کے لئے بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ امام علیؑ کی طرف رجوع کریں۔ خود حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں اہل فتویٰ سے کہا تھا: ''جب علیؑ مسجد میں ہوں تو تم میں سے کوئی فتویٰ نہ دے۔''

انہوں نے بارہا کہا تھا: ''میں اس وقت باقی نہ رہوں جب مشکل کو حل کرنے کے لئے علیؑ نہ ہوں۔'' اور یہ کہ ''اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہوجاتا۔''

حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ محض اخلاقاً نہیں کہے تھے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کا سب مسلمانوں کو احساس تھا اور وہ اس کے اعتراف پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو صحابہ میں امام علیؑ کے سوا کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اُن کی مشکلات کو حل کرسکے۔ امام علیؑ کے علم وتفقہ کا کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا اور نہ ان کے فتوؤں اور فیصلوں پر کوئی روک لگا سکتا تھا۔

بعد رسولؐ مسلمانوں کو اور بھی زیادہ امام علیؑ کی ضرورت تھی کیونکہ علیؑ ہی رسولؐ کی زبان، شارح قرآن اور شہرِ علم کا دروازہ تھے۔ سب صحابہ جانتے تھے کہ رسول اکرمؐ نے جس قدر امام علیؑ کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور کسی کے نہیں فرمائے۔

حضرت عمرؓ نے مندرجہ بالا الفاظ کسی وجہ سے بھی کہے ہوں اِن سے اُن کوششوں پر ضرور روشنی پڑتی ہے جو امام علیؑ نے دین اسلام کو قائم رکھنے اور اسلامی تعلیمات کو پھیلانے کے لئے کیں۔ تذکرۃ الخواص میں امام علیؑ کے فضائل میں احمد بن حنبل سے ابوظبیان کی سند سے یہ روایت آئی ہے:

"ایک عورت زنا کے جرم میں حضرت عمر بن خطابؓ کے سامنے لائی گئی۔ حضرت عمرؓ نے اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا۔ جب امام علیؑ کو اس عورت کے معاملے کی خبر ملی تو آپ نے اس کی رہائی کا حکم دیا اور خلیفہ سے کہا: فلاں خاندان کی یہ عورت پاگل ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ : عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ وَالصَّبِیِّ حَتّٰی یَحْتَلِمَ وَالْمَجْنُوْنِ حَتّٰی یُفِیْقَ "تین قسم کے لوگوں پر حکم جاری نہیں ہوتا۔ ایک سویا ہوا جب تک کہ بیدار نہ ہوجائے دوسرا نابالغ جب تک کہ بالغ نہ ہوجائے اور تیسرا دیوانہ جب تک کہ اسے عقل نہ آجائے۔"[۱]

ایک اور موقع پر ایک عورت حضرت عمرؓ کے پاس لائی گئی جس کے نکاح کے چند مہینے بعد بچہ پیدا ہوگیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا۔ امام علیؑ نے اس حکم پر اعتراض کیا اور اِن آیتوں کی طرف توجہ دلائی کہ قرآن فرماتا ہے:

"مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں پورے دو سال۔ یہ اس کے لئے ہے جو رضاعت کی مدت کی تکمیل کرنا چاہے۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۲) "حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔" (سورۂ احقاف: آیت ۱۵)

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ

۱۔ النص والاجتہاد از علامہ شرف الدین بحوالہ صحیح بخاری جزء۴ ص ۱۷۷

ہے۔ یہ مدت پہلی آیت میں شیرخوارگی کی جو مدت بتلائی گئی ہے اسے دوسری آیت کی مدت میں سے گھٹانے سے معلوم ہو جاتی ہے۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: اَللّٰھُمَّ لَا تُبْقِنِیْ لِمُعْضِلَۃٍ لَیْسَ لَھَا ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ

شیخ مفید کی کتاب ارشاد میں ہے :ایک شخص کو جس نے شراب پی تھی حضرت ابوبکرؓ کے پاس لایا گیا۔ انہوں نے اس پر شراب کی حد جاری کرنی چاہی تو اس شخص نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ شراب حرام ہے۔ میں ایسے لوگوں میں پلا بڑھا ہوں جو شراب کو حرام نہیں سمجھتے۔ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس معاملے کا کیا فیصلہ کریں۔ جو لوگ وہاں موجود تھے انہوں نے کہا کہ آپ یہ مسئلہ امام علیؑ سے پوچھ لیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مسئلہ پوچھنے کے لئے کسی کو امام علیؑ کے پاس بھیجا۔ امام نے جواب میں فرمایا: مسلمانوں میں سے دو آدمیوں کو بھیجو کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان گھوم پھر کر حال دریافت کریں۔ اگر معلوم ہو کہ کسی نے اس کو تحریم شراب کی آیت سنائی ہے یا اس کو بتلایا ہے کہ شراب حرام ہے جب تو اس پر حد جاری کی جائے ورنہ اس پر حد نہیں ہے۔ خلیفہ کو امام علیؑ کی رائے پسند آئی۔ انہوں نے اس شخص کو دو معتبر آدمیوں کے ہمراہ مہاجرین اور انصار کے پاس بھیجا لیکن کسی نے بھی گواہی نہیں دی کہ میں نے اسے تحریم شراب کی آیت سنائی ہے یا یہ بتلایا ہے کہ شراب حرام ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اسے توبہ کرا کر چھوڑ دیا۔

کسی نے حضرت ابوبکرؓ سے لفظ کلالہ کے بارے میں پوچھا جو میراث کی آیت میں آیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنی رائے بتلا دیتا ہوں۔ اگر صحیح ہے تو یہ خدا کا فضل ہے اور اگر غلط ہے تو میری غلطی ہے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ امام علیؑ نے سنا تو فرمایا: انہیں اشتباہ کیوں پیدا ہوا؟ کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ کلالہ سگے اور سوتیلے بہن بھائیوں کو کہتے ہیں۔ چاہے باپ کی طرف سے بہن بھائی ہوں یا ماں کی طرف سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے

ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی مرجائے اور اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے ایک بہن ہو تو اسے اس کے ترکے کا نصف ملے گا۔" (سورۂ نساء: آیت ۱۷۶)

"اگر کوئی مرد ہو جس کے وارث کلالہ (بہن بھائی) ہوں یا عورت ہو اور اس کے ایک بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔" (سورۂ نساء: آیت ۱۲)

شیخ مفید ارشاد میں لکھتے ہیں: قدامہ بن مظعون نے شراب پی۔ جب حضرت عمرؓ نے اس پر حد لگانی چاہی تو قدامہ نے اپنی صفائی میں یہ آیت پیش کی:

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے ان پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں جو وہ کھائیں بشرطیکہ وہ پرہیزگار ہوں، مومن ہوں اور نیک کام کرتے ہوں۔" (سورۂ مائدہ: آیت ۹۲) حضرت عمرؓ نے حد جاری کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ جب یہ خبر امام علیؑ کو ملی تو انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا: آپ نے قدامہ کو کیوں چھوڑ دیا جبکہ اس نے شراب پی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ آیت میں تصریح ہے کہ مومنین پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں جو وہ کھائیں، اگر وہ پرہیزگار ہوں اور نیک عمل کریں۔ اس کے جواب میں امام نے فرمایا: جو پرہیزگار اور نیک کردار ہیں وہ کبھی کسی حرام چیز کو حلال نہیں ٹھہراتے۔ لہٰذا قدامہ کو واپس بلا کر توبہ کرایئے۔ اگر توبہ کرلے تو اس پر حد جاری کیجئے۔ اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کردیجئے کیونکہ وہ دین سے خارج ہوگیا۔ جب امام علیؑ نے حضرت عمرؓ کو اس گناہ کی حد سے آگاہ کیا تو قدامہ کو اسی کوڑے لگائے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق قدامہ کی سزا چالیس کوڑے ہوتے۔[1]

ایک دفعہ ایک حاملہ عورت نے زنا کا ارتکاب کیا۔ حضرت عمرؓ نے اسے سنگسار کیے

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی از ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ ص ۳۷

جانے کا حکم دیدیا۔ امام علیؑ نے ان سے کہا: ذرا ٹھہرو۔ آپ کو اس عورت پر تو اختیار ہے لیکن اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس پر آپ کا کوئی اختیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔'' (سورۂ انعام: آیت ۱۶۴)
اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: لَا عِشْتُ لِمُعْضِلَةٍ لَا یَكُوْنُ لَهَا اَبُو الْحَسَنِ جب انہوں نے امام علیؑ سے اس بارے میں مشورہ کیا تو امام نے فرمایا: وضع حمل تک انتظار کیا جائے۔ جب بچہ پیدا ہوجائے تو کسی کو بچے کا نگراں اور سرپرست مقرر کرنے کے بعد اس عورت پر حد جاری کی جائے۔[1]

ایک دن ایک عورت حضرت عمرؓ کے سامنے لائی گئی جس نے زنا کا اقرار کرلیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے سنگسار کئے جانے کا حکم دیا۔ اس پر امام علیؑ نے یہ کہہ کر اس کے لئے مہلت طلب کی کہ ممکن ہے اس کے پاس کوئی ایسا عذر ہو جس کی وجہ سے حد اس پر سے اٹھ جائے۔ امام نے اس عورت سے پوچھا کہ تو نے زنا کیوں کیا؟

اس عورت نے جواب دیا: میں ایک شخص کے ساتھ تھی۔ اس کے اونٹ پر جو سامان تھا اس میں پانی اور دودھ تھا لیکن میرے اونٹ کے ساتھ کچھ نہیں تھا۔ مجھے پیاس لگی تو میں نے اس سے پانی مانگا۔ اس نے کہا کہ میں جب دوں گا جب تو اپنے آپ کو میرے حوالے کردے۔ میں نے ایسا کرنے سے انکار کیا لیکن جب پیاس کی شدت ہوئی اور میں نے سمجھا کہ اب تو میں مرجاؤں گی تو میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیا۔ اس نے بھی مجھے پانی پلادیا۔

اس پر امام علیؑ نے فرمایا: اللہ اکبر! پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ''پھر جو شخص بے قرار ہوجائے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا تو بے شک اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔'' (سورۂ نحل: آیت ۱۱۵)[2]

۱۔ کتاب الارشاد، النص والاجتہاد بحوالہ مستدرک حاکم

۲۔ النص والاجتہاد بحوالہ الطرق الحکیمۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ از ابن القیم

ایک اور عورت حضرت عمرؓ کے سامنے لائی گئی جس نے اپنے جرم کا بار بار اقرار کیا اور جو کچھ اس نے کیا تھا اس پر زور دیتی رہی۔ امام علیؑ وہاں موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اس عورت کو معلوم نہیں تھا کہ جو کام اس نے کیا ہے وہ حرام ہے اس لئے اس پر حد جاری نہیں ہوسکتی کیونکہ حدیث میں ہے کہ ''شبہ کی بنا پر حد ساقط ہوجاتی ہے۔''[۱]

حضرت سعید بن میسب سے روایت ہے کہ ایک شخص شام کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام ابن جبیری تھا۔ اس نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اس کی بیوی کے ساتھ زنا کررہا ہے۔ اس نے ''غیرت کے نام'' پر دونوں کو قتل کردیا۔ معاویہ کے لئے اس قضیے کا فیصلہ کرنا مشکل ہوا۔ معاویہ نے ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ یہ مسئلہ علیؑ سے دریافت کرو۔ ابوموسیٰ نے امام علیؑ سے پوچھا تو امام نے کہا کہ یہ میرے علاقے کا معاملہ نہیں۔ مجھے بتلاؤ کہاں کا قصہ ہے۔ ابوموسیٰ نے کہا کہ معاویہ نے مجھے لکھا ہے کہ میں آپ سے اس بارے میں پوچھوں۔ امام نے جواب دیا: اگر وہ شخص چار گواہ پیش نہ کرتا تو میں ابوالحسنؑ اس پر قذف (تہمت زنا) کی حد جاری کردیتا۔[۲]

حضرت عمرؓ نے فتویٰ دیا کہ اگر حاملہ عورت کا شوہر فوت ہوجائے تو اس کی عدت وضع حمل کے ساتھ پوری ہوجائے گی۔ امام علیؑ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: یہاں عدت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو وضع حمل اور دوسرے شوہر کی موت کے بعد پورے چار مہینے اور دس دن[۳] اس لئے اس آیت کے عموم پر عمل کرنا مناسب ہے کہ ''جو لوگ تم میں سے مرجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو روکے رکھیں چار مہینے اور دس دن۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۴)

۱۔ النص والاجتہاد بحوالہ الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ از ابن القیم

۲۔ موطأ امام مالک ص ۲۱۲

۳۔ تاریخ التشریع الاسلامی، النص والاجتہاد بحوالہ تفسیر کشاف از علامہ زمخشری

تین طلاقیں اگر اکٹھی دی جائیں تو امام علیؑ ان کو ایک ہی طلاق سمجھتے تھے مگر حضرت عمرؓ انہیں تین طلاقیں شمار کرتے تھے اور عورت کو اس مرد کے لئے اس وقت تک حرام قرار دیتے تھے جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرلے۔ گو حضرت عمرؓ یہ تسلیم کرتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق قرار دیا تھا، اس کے باوجود انہوں نے اس صورت میں تین طلاقوں کے نافذ ہونے کا حکم دیا اور دلیل یہ پیش کی کہ جب مرد نے خود اپنے آپ کو تین طلاقوں کا پابند کرلیا تو اسے ان کا نتیجہ قبول کرنے پر مجبور کیا جانا ضروری ہے۔[1]

یعلی بن امیہ حضرت عمرؓ کی طرف سے یمن کے حاکم تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو خط لکھا کہ ایک عورت نے اپنے آشنا کی مدد سے اپنے شوہر کو قتل کردیا ہے۔ اب ایک سے قصاص لیا جائے گا یا دونوں سے؟ حضرت عمرؓ اس کا جواب نہ دے سکے۔ چنانچہ حسب دستور اس نئے مسئلے میں بھی امام علیؑ سے مشورہ کیا گیا۔ امام نے فرمایا: اگر کوئی آدمی مل کر ایک ذبح کی ہوئی بھیڑ چوری کریں اور ان میں سے ہر ایک اس کا کچھ حصہ اٹھا کر لے جائے تو سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے یا نہیں؟

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: میں تو سب کے ہاتھ کاٹوں گا۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا کہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔

حضرت عمرؓ نے خط کے جواب میں یعلی بن امیہ کو لکھا کہ دونوں کو قتل کردو۔ اگر اس قتل میں تمام اہل صنعا شریک ہوتے تو سب کو قتل کردیا جاتا۔[2]

شہید ثانی کہتے ہیں کہ اگر کئی آدمی مل کر ایک شخص کو قتل کردیں تو وہ سب اس کے قصاص میں قتل کیے جائیں گے۔ علمائے اہل سنت میں سے بھی بیشتر کی یہی رائے ہے۔ مذہب صحابہ یہ ہے کہ اگر صاحب خون دیت لینا چاہے تو دیت سب قاتلوں

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی، النص والاجتہاد بحوالہ تفسیر کشاف از علامہ زمخشری

۲۔ تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۷۶، النص والاجتہاد ص ۲۱۱ بحوالہ فجر الاسلام

سے حصہ رسدی وصول کی جائے گی اور اگر وہ قصاص کا خواہاں ہو تو اسے حق ہے کہ سب کو قتل کردے۔ اس حکم کا ثبوت بہت سی روایات سے ملتا ہے۔ منجملہ ان کے ایک روایت فضیل بن یسار کی ہے جو کہتے ہیں: میں نے امام محمد باقرؑ سے پوچھا کہ اگر دس آدمی ایک شخص کو قتل کردیں تو کیا حکم ہے؟ امام نے فرمایا: اگر صاحبان خون چاہیں تو سب کو قصاص میں قتل کردیں اور نو آدمیوں کی دیت ادا کریں۔ یہ دیت ان دس آدمیوں کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے گی۔[1]

امام علیؑ نے حکم دیا تھا کہ شرابی کے اسّی کوڑے لگائے جائیں۔ موطأ امام مالک میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے شرابی کی سزا کے بارے میں امام علیؑ سے مشورہ کیا تو امام نے فرمایا کہ میری رائے میں شرابی کی سزا اسّی کوڑے ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہی حکم جاری کردیا۔

تاریخ الفقہ الاسلامی میں ہے: حضرت عمرؓ نے امام علی ابن ابی طالبؑ کی دلیل کو تسلیم کرلیا اور شرابی کی سزا اسّی کوڑے مقرر کردی۔ چنانچہ یہی سزا شرعی حکم کی حیثیت سے اب تک باقی ہے۔ چونکہ اس زمانے میں صحابہ کرام نے یہ حکم تسلیم کرلیا تھا اس لئے یہ ہمیشہ کے لئے شرعی حکم ہوگیا۔[2]

شہید ثانی کی المسالک میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے امام علیؑ سے شرابی کی سزا کے بارے میں پوچھا۔ امام نے فرمایا: اسّی کوڑے مارے جائیں۔ جب شرابی شراب پی لیتا ہے تو وہ مدہوش ہو جاتا ہے اور جب مدہوش ہو جاتا ہے تو اول فول بکنے لگتا ہے اور جب اول فول بکتا ہے تو جھوٹ بھی بولتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسّی کوڑے ہی مارے۔ اہلسنت بھی اکثر اسی پر عمل کرتے ہیں مگر کچھ لوگ اس کے قائل

۱۔ مسالک الاحکام از شہید ثانی

۲۔ الروض النظیر میں ہے کہ اس متفقہ فیصلے کے برخلاف جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوا تھا حضرت عثمانؓ کی خلافت میں شرابی کو چالیس کوڑے مارے جاتے تھے۔

ہیں کہ شرابی کی حد چالیس کوڑے ہیں۔ شیعوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سزا اسّی کوڑے ہے۔

تاریخ الفقہ الاسلامی میں ایک قصہ بیان کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:
حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ کو بھائی کی موجودگی میں دادا کی میراث کے بارے میں کچھ شبہ پیدا ہوا۔ انہوں نے امام علیؑ اور زید بن ثابتؓ سے مشورہ کیا۔ امام علیؑ نے فیصلہ دیا کہ اس حالت میں دادا، بھائیوں کے ساتھ میراث میں شریک ہے۔ تعجب اور شک کو دور کرنے کے لئے امام علیؑ نے یہ مثال پیش کی کہ فرض کرو کہ کسی ندی سے ایک شاخ نکلتی ہے۔ اس کے بعد آگے چل کر دو شاخیں اور جدا ہوتی ہیں۔ اب اگر درمیانی شاخ کا پانی واپس لوٹے تو دوسری دو شاخوں میں پانی نہیں جائے گا۔ زید بن ثابتؓ مطلب سمجھ گئے کہ بھائی کی موجودگی میں دادا کا حصہ ساقط نہیں ہوگا۔ انہوں نے امام علیؑ کی رائے سے اتفاق کرلیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی امام کی رائے قبول کرلی اور دادا اور بھائی کو ایک درجے میں قرار دیدیا۔ مسلمان عموماً اسی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ شافعی، حنبلی اور مالکی مذاہب نے بھی اسی رائے کو قبول کیا ہے لیکن حنفی مذہب میں دادا کو بمنزلہ باپ کے قرار دیا گیا ہے اور بھائیوں کو محروم الارث سمجھا گیا ہے۔ یہ رائے حضرت ابوبکرؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام کی رائے کے مطابق ہے۔

ایک روز حضرت عمرؓ منبر پر افسوس کر رہے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین مسئلوں کو واضح کیے بغیر مسلمانوں سے جدا ہوگئے۔ وہ تین مسائل یہ ہیں:
(۱) کلالہ کی میراث (۲) دادا کی میراث (۳) سود کہاں کہاں صادق آتا ہے۔
فقہاء نے کئی ایسے مسائل بیان کیے ہیں جن میں حضرت عمرؓ کی رائے اہلبیتؑ اور ان کے متبعین کی رائے کے خلاف ہے۔ مثلاً گم شدہ اونٹ اور ان دوسرے جانوروں کا مسئلہ جن پر درندوں کے حملے کا خوف ہو۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ ایسے جانوروں کو پکڑ کر اس وقت تک حفاظت سے رکھنا واجب ہے جب تک ان کا مالک نہ مل

جائے لیکن اہلبیتؑ کے نزدیک ایسے کھوئے ہوئے جانوروں کا پکڑنا جائز نہیں۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر یہ جانور ایسی جگہ پر ہوں جہاں پانی اور چارہ موجود ہو تو ان کے تلف ہو جانے اور ان کے متعلق جو دوسرے احکام ہیں ان کا ذمہ دار وہ شخص ہوگا جو اُن کو پکڑے گا۔ اہلبیتؑ کی یہ رائے اس حدیث کے مطابق ہے جس میں رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کے لُقطہ کے بارے میں پوچھنے پر فرمایا تھا کہ "کھوئے ہوئے اونٹ کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ اس کا چارہ پانی اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جب تک اس کا مالک اسے ڈھونڈ نہ لے وہ خود اپنا چارہ پانی تلاش کرلیتا ہے۔[1]

شاید دوسری احادیث جو بیان کی جاتی ہیں وہ اس صورت سے متعلق ہیں جب کھوئے ہوئے جانور کے مرجانے کا اندیشہ ہو یا جب وہ کسی ایسی جگہ پر ہو جہاں چارہ پانی نہ مل سکتا ہو۔ اس صورت میں شیعوں میں بھی جانور کی حفاظت لازمی ہے۔

اسی طرح اہل سنت کہتے ہیں کہ کاریگر، دستکار، رنگ ریز وغیرہ اس چیز کا ذمہ دار اور ضامن ہے جو اس کے قبضے میں ہے (یعنی اگر وہ چیز جو اس کو بنانے، مرمت کرنے، رنگنے وغیرہ کے لئے دی گئی ہے تلف ہوجائے یا اسے نقصان پہنچے تو کاریگر کو معاوضہ دینا پڑے گا)۔ بیہقی نے متعدد روایات نقل کی ہیں جن سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو چیز کاریگر کے قبضے میں ہے اگر ضائع ہوجائے تو کاریگر کو معاوضہ دینا ہوگا۔ بیہقی کہتے ہیں کہ اس شرط کے بغیر معاملہ درست نہیں۔[2]

بیہقی نے امام جعفر صادقؑ سے، انہوں نے اپنے والد سے، انہوں نے امام علیؑ سے روایت کی ہے کہ رنگ ریز اور دستکار ضامن ہیں۔ اس ضمن میں اہلبیتؑ کا مذہب یہ ہے کہ جو شے کاریگر کے پاس ہے وہ امانت غیر مضمونہ ہے۔ کاریگر کے ذمہ اس کا معاوضہ نہیں سوائے اس صورت کے کہ وہ خود کاریگر کی اپنی کوتاہی یا زیادتی سے تلف

۲،۱ تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۸۶

ہوجائے۔ اگر کسی اور وجہ سے تلف ہو تو کاریگر ذمہ دار نہیں۔ ہاں اگر کاریگر کے اپنے ہاتھ سے تلف ہو تو پھر چاہے اس نے قصداً تلف کیا ہو یا وہ شے اتفاقاً تلف ہوگئی ہو کاریگر دونوں صورتوں میں ذمہ دار ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اجرت پر کسی دوسرے کے مال میں کچھ کام کرے اور وہ مال جاتا رہے تو اجیر اس نص کی بناء پر کہ امانت دار ضامن نہیں ہے، معاوضہ دینے کا پابند نہیں ہوگا۔ لیکن اگر اجیر کی کسی غلطی یا اس کے کام کرنے کے نتیجے میں مال ضائع ہوجائے چاہے ایسا قصداً ہو یا بغیر قصد کے تو پھر وہ عام قاعدہ جاری ہوگا کہ جو شخص کسی دوسرے کا مال تلف کردے تو وہ نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔[1]

نقصان کے معاوضے کا جو حکم امام علیؑ سے منسوب کیا گیا ہے ممکن ہے وہ اس صورت میں ہو جب نقصان کی وجہ کاریگر یا رنگ ریز کی اپنی غلطی، غفلت یا لاپروائی ہو اس کی تائید اس قول امام سے ہوتی ہے کہ ''اس کے بغیر لوگوں کا کام نہیں چل سکتا۔'' اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اجیر کو نقصان کی تلافی کا حکم بطور سزا ہے تاکہ جو چیز اس کے قبضے میں ہے وہ اس کی حفاظت کی پوری کوشش کرے اور اس بارے میں کوئی کوتاہی یا غفلت نہ کرے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حکم اس وقت سے مخصوص ہو جب اجیر وہ کام کر رہا ہے جس کے لئے اسے مقرر کیا گیا ہے اور اس کے کام کے دوران میں وہ چیز ضائع ہوجائے۔

ایک اور اختلاف اس شخص کے بارے میں ہے جو کسی عورت کو اس کی عدت کے دوران اپنے نکاح میں لے آئے اور اس سے صحبت کرے۔ ایسا شخص اس عورت سے صرف اس وقت دوبارہ نکاح کرسکتا ہے جب وہ اس سے جدا ہونے کے بعد اپنی پہلی عدت پوری کرے اور ایک اور عدت بھی اس مرد سے جدائی کی پوری کرے۔ ابراہیم نخعی نے امام علیؑ سے یہ روایت بیان کی ہے لیکن حضرت عمرؓ اس کے قائل تھے

۱۔ وسیلۃ النجات کتاب الاجرۃ از سید ابوالحسن

کہ وہ عورت ہمیشہ کے لئے اس مرد پر حرام ہوگئی۔[1] اہلبیتؑ کی رائے اس مسئلے میں یہ ہے کہ اگر اسے یہ معلوم تھا کہ اس عورت کی عدت پوری نہیں ہوئی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ عدت کے دوران میں نکاح جائز نہیں ہے، جب تو وہ عورت ہرگز اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی چاہے اس نے اس کے ساتھ صحبت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن اگر وہ ان دونوں باتوں یا ان میں سے کسی ایک بات سے واقف نہیں تھا اور اس نے نکاح کرلیا لیکن عورت سے صحبت نہیں کی تو یہ نکاح باطل ہے اور عورت کی عدت پوری ہونے کے بعد اسے دوبارہ نکاح کرنا ہوگا لیکن اگر اس نے صحبت کرلی تو وہ عورت اس پر حرام ہوگئی۔ اب اس سے نکاح نہیں کرسکتا۔

اس سلسلے میں ائمہ سے صحیح اخبار مروی ہیں جن میں اس حکم کی تصریح ہے:

زرارہ اور داؤد بن سرحان روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوعبداللہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: اَلَّذِیْ یَتَزَوَّجُ الْمَرْاَۃَ فِیْ عِدَّتِہَا وَھُوَ یَعْلَمُ لَا تَحِلُّ لَہٗ اَبَدًا اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی عورت سے اس کی عدت کے دوران میں نکاح کرے تو وہ عورت اس کے لئے کبھی حلال نہیں ہوگی۔

محمد بن مسلم امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

"اگر کوئی شخص کسی عورت سے اس کی عدت کے دوران میں نکاح کرلے تو ان دونوں میں علیحدگی کرادی جائے گی۔ اگر مرد نے عورت کے ساتھ صحبت کی ہو تو اس کو ہمبستری کی وجہ سے مہر بھی دینا ہوگا لیکن علیحدگی اس صورت میں بھی ہوگی۔ نیز کسی حالت میں بھی یہ عورت اس مرد کے لئے حلال نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر اس نے صحبت نہیں کی تو مہر ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔

لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ یہ حکم کہ "عدت پوری ہونے کے بعد اس سے نکاح کرلے" اگر امام علیؑ سے صحیح منسوب کیا گیا ہے تو یہ صرف اس صورت کے لئے ہے

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی ص۹۰

کہ مرد کو یہ نہ معلوم ہو کہ عدت میں نکاح حرام ہے یا یہ نہ معلوم ہو کہ عورت عدت میں ہے اور وہ اس سے نکاح کر لے مگر اس نے مقاربت نہ کی ہو۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ یہ رائے امام علیؑ نے ایک خاص واقعے کے سلسلے میں ظاہر کی تھی۔ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک عورت تھی جس کا نام طلیحہ اسدیہ تھا۔ وہ رشید ثقفی کی بیوی تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر عدت ختم ہونے سے پہلے کسی اور سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو اور اس کے نئے شوہر کو سزا دی اور دونوں میں علیحدگی کرادی۔[1]

اس قصے میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ ہمبستری ہوئی تھی یا نہیں اور نہ اس کا ذکر ہے کہ اس مسئلے کا حکم ان دونوں کو معلوم تھا یا نہیں چونکہ اس طرح کے مسائل کی عموماً ضرورت نہیں پڑتی اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں کہ یہ حکم ان کو معلوم نہ ہو۔ خصوصاً اس بات کے پیش نظر کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی اسلامی احکام اور تعلیمات سے واقفیت کی ابھی ابتداء ہی ہوئی تھی۔

بہر حال امام علیؑ نے جو حکم اور فتویٰ دیا ہو وہ اس کو بہتر سمجھتے تھے اور کوئی مسلمان نہ ان کے حکم کی مخالفت کر سکتا تھا اور نہ اس کے بارے میں شک کر سکتا تھا۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ امام علیؑ کو رسول اکرمؐ سے کس قدر قرب حاصل رہا تھا۔ رسول اکرمؐ امام علیؑ کو اپنے تمام اصحاب پر فوقیت دیتے تھے۔ امام علیؑ کیا سفر میں اور کیا حضر میں سوائے غزوۂ تبوک کے کبھی رسول اکرمؐ سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ اسی غزوے میں رسول اکرمؐ نے ان سے فرمایا تھا:

"کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تمہارا مقام میرے نزدیک وہی ہے جو حضرت ہارونؑ کا حضرت موسیٰؑ سے تھا مگر یہ کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں۔" یہ روایت حدیث کی اکثر کتابوں میں موجود ہے جن میں صحیح بخاری اور صحیح ترمذی بھی شامل ہیں۔

۱۔ تنویر الحوالک علی موطا مالک جزء ثانی ص ۷۰

تمام محدثین نے اپنی کتابوں میں امام علیؑ سے احادیث روایت کی ہیں اور آپ کی فقہی آراء نقل کی ہیں۔ ہمارے لئے ان تمام روایات کا استقصاء ممکن نہیں لیکن جو شخص بھی اسلامی روایات اور آثار و احوال صحابہ کی تحقیق کرے گا وہ یہ محسوس کرے گا کہ رسول اکرمؐ کے بعد امام علیؑ سب سے بڑے فقیہ اور کتاب و سنت کے سب سے بڑے عالم تھے۔

ڈاکٹر یوسف اپنی کتاب تاریخ فقہ اسلامی میں امام علیؑ کا بعض دوسرے صحابہ جیسے حضرت عمرؓ، حضرت ابن عمرؓ، ابوموسیٰ اشعری وغیرہ[1] کے ساتھ فقہاء میں شمار کرتے ہیں۔ گو ڈاکٹر صاحب اپنے مباحث میں آزاد روی اور غیر جانبداری کے مدعی ہیں اور اپنے خیال میں گزشتہ حکمرانوں کی خواہشات اور سیاست کے آثار سے بہت دور ہیں لیکن بعض جگہ وہ گزشتہ سیاست سے متاثر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے امام علیؑ کا شمار حضرت عمرؓ، ان کے فرزند اور ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ کیا ہے حالانکہ حضرت عمرؓ نے خود بارہا کہا تھا "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہوگیا ہوتا" یا یہ کہ "مجھے زندگی میں کوئی ایسی مشکل پیش نہ آئے جس کو حل کرنے کیلئے ابوالحسنؑ نہ ہوں۔" وہ صحابہ میں سے کسی کو بھی اس درجے فقیہ نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی کسی ایسی مجلس میں فتویٰ دے جہاں امام علیؑ موجود ہوں۔

جب بعض مسلمانوں نے یہ تجویز پیش کی حضرت عمرؓ اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو اپنا جانشین نامزد کردیں تو حضرت عمرؓ نے کہا:

"میں کیسے کسی ایسے شخص کا مخلوق کی رہنمائی کے لئے انتخاب کرسکتا ہوں جو یہ بھی اچھی طرح نہیں جانتا کہ بیوی کو طلاق کیسے دی جاتی ہے۔"[2]

کیا کسی ایسے شخص کے لئے جو آزادانہ بحث کا مدعی ہو اور یہ کہتا ہو کہ وہ پرانی

۱۔ تنویر الحوالک علیٰ موطا مالک جزء ثانی ص ۴۰

۲۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۳۸، شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۶۴

باتوں سے متاثر نہیں ہے اور اسے کوئی تعصب نہیں، یہ درست ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو فقاہت میں امام علیؑ کے برابر شمار کرے جو خود اپنے باپ کی شہادت کے مطابق بیوی کو طلاق دینا بھی نہ جانتا ہو۔ طبقات ابن سعد میں حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں ہے کہ وہ احادیث کی روایت خوب کرتے ہیں لیکن سمجھتے خوب نہیں۔

بہرحال امام علیؑ کے فیصلوں اور فتوؤں کے بارے میں اس مختصر بحث سے ہمارا مقصد یہ بتانا تھا کہ اسلامی فقہ میں مکتب تشیع کا کردار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ہی سے نمایاں رہا ہے۔ اس اہم کام میں امام علیؑ کے پیروکاروں نے بھی بھرپور حصہ لیا ہے۔ وہ احادیث کی روایت اور احکام کی اشاعت کے ذریعے سے اسلامی ورثے کی حفاظت میں پوری طرح شریک رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے رسول اکرمؐ کے آزاد کردہ غلام ابورافع نے رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد امام علیؑ کی ہمراہی میں جنگوں میں شرکت کی۔ ان کے دو بیٹے عبداللہ اور علی، امام علیؑ کے زمانۂ خلافت میں ان کے کاتب تھے۔ ابورافع نے کتاب السنن والاحکام اور کتاب القضایا کے نام سے دو کتابیں لکھی تھیں۔ شیعوں میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے احادیث جمع کیں اور احکام مدوّن کئے۔ وہ لوگوں کو حلال وحرام سمجھاتے اور فتویٰ دیتے تھے۔

بزرگان شیعہ میں ایک اور بزرگ فخر صحابہ حضرت سلمان فارسیؓ تھے۔ انہیں رسول اکرمؐ سے ایسا قرب حاصل تھا اور ان کا ایمان ایسا کامل تھا کہ حضورؐ نے ان کے بارے میں فرمایا: سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ" سلمانؓ ہم اہلبیت میں سے ہیں۔" رسول اکرمؐ نے حضرت سلمانؓ کو فارسی کے بجائے محمدی کا لقب عطا کیا۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت سلمانؓ ہمیشہ امام علیؑ کے ساتھ رہے اور ان سے علم حاصل کیا۔ فضیل بن یسار امام باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"لوگ کہتے ہیں کہ علی (علیہ السلام) نے سلمانؓ کے بارے میں فرمایا کہ

انہوں نے اولین و آخرین کا علم حاصل کیا ہے۔ تم نے بھی یہ بات سنی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ امام نے فرمایا: تمہیں اس کا مطلب معلوم ہے؟ میں نے کہا کہ بنی اسرائیل کا علم اور رسول اکرمؐ کا علم مراد ہے۔ امام نے فرمایا: نہیں۔ یہ بات نہیں بلکہ رسول اکرمؐ کا علم اور علیؑ کا علم، رسول اکرمؐ کا حکم اور علیؑ کا حکم مراد ہے۔"[1]

حضرت ابودرداءؓ عبادت میں اپنے اوپر بہت سختی کرتے تھے۔ حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا: تمہارے جسم کا بھی تم پر کچھ حق ہے اور تمہارے خاندان کا بھی۔ اس لئے ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن افطار کرو۔ نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔ اپنے جسم کا بھی حق ادا کرو۔ جب حضرت سلمانؓ کی یہ بات رسول اکرمؐ نے سنی تو آپ نے فرمایا: "سلمانؓ علم سے لبریز ہوگئے ہیں۔"[2]

امام علیؑ فرماتے ہیں: "سلمان ہم اہلبیتؑ میں سے ہیں اور ان کا تعلق ہم سے ہے۔ وہ تمہارے لئے لقمان حکیم کی مانند ہیں کیونکہ انہوں نے اولین و آخرین کا علم حاصل کیا ہے اور اولین و آخرین کی کتاب پڑھی ہے۔ وہ علم کا بحر بیکراں ہیں۔"[3]

فضل بن شاذان ان کے بارے میں کہتے ہیں:

"مسلمانوں میں سے کوئی شخص حضرت سلمان فارسیؓ سے بڑھ کر فقیہ نہیں ہوا۔"[4]

حضرت عمرؓ نے حضرت سلمانؓ کو مدائن کا والی مقرر کیا تھا۔ والی کے فرائض فقط انتظامی اور سیاسی امور تک محدود نہیں تھے بلکہ دینی تعلیم اور فتویٰ دینا بھی والی کے فرائض میں شامل تھا۔ خصوصاً اس وقت جب والی حضرت سلمانؓ جیسا کوئی شخص ہو جن کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ سلمانؓ علم سے لبریز ہوگئے ہیں۔

صحابہ کرام کے دور میں ایک اور شیعہ فقیہ، حدیث کے عالم اور گنجینۂ علم حضرت عمار بن یاسرؓ ہیں۔ وہ ایمان، اخلاص اور اتباع رسولؐ میں اس درجے بڑھے ہوئے تھے کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عَمَّارٌ مَّعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَمَّارٍ يَدُوْرُ مَعَهُ كَيْفَمَا دَارَ "عمارؓ حق کے ساتھ

---

[1] و [4] رجال کشی ص ۱۱ [2] و [3] طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۸۵

ہیں اور حق عمارؓ کے ساتھ۔ جہاں عمارؓ جاتے ہیں وہاں حق ان کے ساتھ جاتا ہے۔"

ایک مشہور حدیث کے مطابق جو فریقین کی کتابوں میں آئی ہے رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: عمارؓ کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔[1] حضرت عمارؓ کو اس پیشگوئی

---

[1] مصباح اللغات مرتبہ عبد الحفیظ بلیاوی مطبوعہ تاج آفسٹ پریس اردو بازار دہلی ۱۹۶۹ء میں بغی کے ذیل میں لکھا ہے کہ فِئَةٌ بَاغِيَةٌ سے مراد ہے "امام عادل کی اطاعت سے نکلنے والی جماعت۔" المعجم الوسیط مطبوعہ مصر ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۶۵ پر لکھا ہے "اَلْبَاغِيْ: اَلظَّالِمُ الْمُسْتَعْلِيْ، اَلْخَارِجُ عَلَى الْقَانُوْنِ۔ جمع: بُغَاةٌ۔ وَفِئَةٌ بَاغِيَةٌ. وَفِي الْحَدِيْثِ "وَيْلَ عَمَارٍ تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ" مگر یہ بات باعث حیرت ہے کہ عیسائی ماہر لغت لوئیس معلوف کی المنجد سے جو دار الاشاعت کراچی نے عربی اردو میں نظر ثانی کے بعد ۱۹۷۵ء میں چھاپی ہے فِئَةٌ بَاغِيَةٌ کا لفظ ہی نکال دیا گیا ہے کیونکہ امام علیؑ کے پرچم تلے لڑنے والے "امام عادل" کے پرچم تلے اور معاویہ کے ساتھ لڑنے والے "امام ظالم" کے پرچم تلے لڑ رہے تھے۔ امام علی رضاؑ نے مامون کے دربار میں وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۴) سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ امامت کا عہدہ قیامت تک ظالموں پر حرام ہے۔ ظالم اماموں کے لئے قرآن کہتا ہے وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ (سورۂ قصص: آیت ۴۱) صحیح بخاری ج ۲، ص ۷۹ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی میں ہے کہ تعمیر مسجد کے وقت حضرت عمارؓ کے سر سے غبار صاف کرتے ہوئے رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا وَیْحَ عَمَّارٍ تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِیَةُ عَمَّارٌ یَدْعُوْهُمْ اِلَی اللّٰهِ وَیَدْعُوْنَهٗ اِلَی النَّارِ یعنی افسوس عمارؓ کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔ عمارؓ انہیں اللہ کی طرف بلا رہے ہوں گے لیکن وہ ان کو جہنم کی طرف بلا رہے ہوں گے۔ خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۷۷ پر ہے کہ "سب سے پہلا سر جو زمانہ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمار بن یاسرؓ کا سر تھا۔ امام حنبل نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ لکھا ہے اور ابن سعد نے بھی طبقات میں اسے نقل کیا ہے کہ جنگ صفین میں حضرت عمارؓ کا سر کاٹ کر حضرت معاویہ کے پاس لایا گیا اور دو آدمی اس پر جھگڑ رہے تھے، ہر ایک کہتا تھا کہ عمارؓ کو میں نے قتل کیا ہے۔" ان حقائق کے باوجود ہمارے سنی بھائی کہتے ہیں کہ "یہ سب میاں کے جلوے ہیں۔" بالفاظ دیگر وہ یہ کہتے ہیں کہ حق کو بھی مانو، ناحق کو بھی مانو۔ علیؑ کو بھی رضی اللہ کہو، معاویہ کو بھی رضی اللہ کہو کیونکہ ہمیں کسی صحابی پر تنقید کرنے کا حق نہیں ہے حالانکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک مسلمان دین دار ہو مگر دین شناس نہ ہو۔

کے صحیح ہونے کا یقین تھا اور وہ اس وقت کے منتظر تھے۔ یہاں تک کہ جنگ صفین کا واقعہ پیش آیا اور وہ اس جنگ میں معاویہ کے حامیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کوفہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ لوگ اپنے سب کاموں میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان دنوں حاکموں اور والیوں کے فرائض کا ایک بڑا حصہ دینی احکام سے متعلق تھا کیونکہ یہی حکومت کا قانون تھا اور حاکموں کا فرض تھا کہ دین کے احکام کو لوگوں میں پھیلائیں اور سب کام شریعت کے حکم اور اس کی روح کے مطابق انجام دیں۔

رسول اکرمؐ کی دعوت پر حضرت عمارؓ کا ایمان اور اسلام کے اصولوں پر ان کا یقین اس درجے کامل تھا کہ وہ آنحضرتؐ کے مقربین اور حواریوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ امام علیؑ کے ساتھ رہے یہاں تک کہ جنگ صفین کا واقعہ پیش آیا۔ اس جنگ میں انہوں نے کہا: اگر یہ لوگ ہمیں مارتے ہوئے دریائے بحرین تک لے جائیں جب بھی میں یہی سمجھوں گا کہ ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر۔

جب انہیں موقع ملا اور وہ ایک ایسے علاقے کے حاکم مقرر ہوئے جہاں اسلام "تلوار کے زور سے" پہنچا تھا اور جہاں کے باشندے اسلام کے عقائد و احکام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے تو انہوں نے یہ اپنا فرض سمجھا کہ وہاں کے لوگوں کو حرام و حلال کی تعلیم دیں اور ان کے دل میں اسلام کے اصول کتاب و سنت کے مطابق راسخ کر دیں۔

استاد مصطفیٰ عبدالرزاق لکھتے ہیں: حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عمارؓ، حضرت ابودرداءؓ اور حضرت سلمانؓ رسول اکرمؐ کے عین حیات ہی میں فتویٰ دیتے تھے۔[1]

ایک اور بزرگ صحابی ابی بن کعبؓ اس دور میں فقہائے شیعہ میں سے تھے جیسا کہ سید علی بن صدرالدین مدنی ان کے بارے میں اپنی کتاب الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعہ میں بتاتے ہیں۔

۱۔ تمہید لتاریخ الفلسفہ ص ۱۳۵

سید حسن صدر تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام میں کہتے ہیں: سید علی مدنی نے ان کے شیعہ ہونے اور ان کی اہلبیتؑ سے محبت اور مؤدت پر متعدد دلیلیں پیش کی ہیں۔ ابن شحنہ نے اپنی تاریخ روضۃ المناظر فی اخبار الاوائل والاواخر میں ان کا شمار ان اصحاب میں کیا ہے جنہوں نے امام علیؑ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی۔ ابن شحنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابیؓ مفسرین کے پیشروؤں میں سے تھے۔

شیخ کلینی نے کافی میں امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''ہم کلام مجید کو ابی بن کعبؓ کی قرأت کے مطابق پڑھتے ہیں۔''

شیخ صدوق نے امالی میں اور علامہ حلّی نے خلاصۃ الرجال میں ایسی باتیں بیان کی ہیں جن سے حضرت ابی بن کعبؓ کی عظمت اور ان کا اہلبیتؑ سے اخلاص آشکارا ہوتا ہے۔ سید مرتضٰی نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں محدثین کی وہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت عمرؓ بستر مرگ پر تھے تو امام علیؑ نے ان سے کہا: میں چاہتا ہوں کہ خدا سے اس طرح ملاقات کروں کہ میرے پاس ''اس شخص'' کا صحیفہ ہو۔ شیخ مفید فرماتے ہیں کہ یہاں ''صحیفہ'' سے امام علیؑ کو حق خلافت سے دور رکھنے میں گٹھ جوڑ کرنا مراد ہے۔ اسی بات سے استدلال کرتے ہوئے اہل سنت نے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر بیعت ہو جانے کے بعد ان کے منبر کے نیچے کھڑے ہو کر ابی بن کعبؓ نے مسجد نبوی میں اونچی آواز میں جسے تمام حاضرین سن رہے تھے فرمایا: آگاہ رہو کہ اہل اقتدار ہلاک ہوگئے۔ انہوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ خدا کی قسم میں ان کی پیروی نہیں کروں گا کیونکہ ان کی پیروی کرنا لوگوں میں گمراہی پھیلانا ہے۔[1] کسی نے ان سے پوچھا: اے صحابی رسولؐ یہ اہل اقتدار کون

---

[1] بیعت ابوبکرؓ کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ نے انصاری خواتین کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''... معلوم نہیں لوگوں کو علیؑ کی کیا بات ناپسند ہے کہ انہوں نے ان کی حمایت چھوڑ دی؟ بخدا! لوگ علیؑ کی احکام الٰہی کے بارے میں سختی، ان کی ثابت قدمی اور ان کی شمشیر خارا شگاف کو پسند نہیں کرتے... مگر بخدا انہوں نے خود اپنا نقصان کیا ہے۔ علیؑ کی حکومت میں انہیں ظلم و تشدد سے واسطہ نہ پڑتا۔ وہ تو انہیں علم و دانش اور عدل و انصاف کے چشموں سے سیراب کرتے۔'' اس کے بعد

ہیں ؟ انہوں نے کیا گٹھ جوڑ کیا ہے۔ ابیؓ نے کہا: یہ ایک گروہ ہے جس نے آپس میں طے کیا ہے کہ رسول اللہؐ کے بعد ان کے اہلبیتؑ میں سے کسی کو ان کا وارث نہیں بننے دیں گے اور نہ ہی رسول اللہؐ کے منبر پر بیٹھنے دیں گے۔ خدا کی قسم اگر میں آئندہ جمعہ تک زندہ رہا تو میں ان کے درمیان کھڑے ہو کر لوگوں کو ان کی حکومت کے بارے میں ساری صورتحال بتاؤں گا۔[1]

علامہ سید محسن امین اعیان الشیعہ میں حضرت ابیؓ کا شیعہ قاریوں میں شمار کرتے ہیں اور طبقات ابن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ سرکار رسالت مآبؐ نے فرمایا: اس امت کے قاری ابی بن کعبؓ ہیں نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں قرآن پڑھ کر سناؤں۔[2]

شیخ محمد خضری، حضرت ابی بن کعبؓ کا شمار ان صحابہ کرام میں کرتے ہیں جو صاحب فتویٰ تھے اور صحابہ کے زمانے میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: صدر اسلام میں جو حضرات فتویٰ دیا کرتے تھے ان میں مشہور ترین خلفائے اربعہ، ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ اور ابی بن کعبؓ ہیں۔

ڈاکٹر یوسف لکھتے ہیں: وہ بزرگ فقہائے مدینہ میں سے تھے۔ اکثر تابعین اور

آپ نے یہ پیش گوئی فرمائی کہ "جو کام ان لوگوں نے کیا ہے وہ گابھن اونٹنی کی طرح ہے۔ بچہ ہونے دو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اس وقت دودھ کی بجائے خون اور زہر کا پیالہ دوہو گے۔ اس وقت مجرم نقصان اٹھائیں گے اور آنے والے پچھلوں کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتیں گے۔ اطمینان رکھو فتنہ و فساد میں غرق ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں ابھی سے یہ خوشخبری سنائے دیتی ہوں کہ تمہیں جبر و ستم اور ظلم و تشدد سے واسطہ پڑے گا۔ تمہارا مال لوٹا جائے گا اور تمہیں پکی ہوئی فصل کی طرح کاٹا جائے گا۔"

(شرح نہج البلاغہ ج ۴ بحوالہ اسلام دین حکمت صفحہ ۶۲۸ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی)

مسلمانوں کی خونچکاں تاریخ گواہ ہے کہ سنگینوں کے سائے میں جبر و قہر کی حکومتوں نے عوام کے ساتھ ویسا ہی ظالمانہ سلوک کیا جیسا کہ بنت رسولؐ نے پیش گوئی فرمائی تھی۔

۱۔ العیون المجالس از شیخ مفید ۲۔ اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۱۶

فقہائے سبعہ نے فقہ اور حدیث کی تعلیم ان سے اور خلفائے اربعہ سے حاصل کی۔
ایک اور شیعہ فقیہ ابوسعید خدری ہیں۔ محدث شیخ عباس قمی لکھتے ہیں:
خدریؓ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے امیرالمومنینؑ سے رجوع کیا۔ نوجوان صحابہ میں کوئی ان سے بڑا فقہ کا عالم نہیں تھا۔
محدث قمی، ابن عبدالبر سے نقل کرتے ہیں کہ ابوسعید خدری ان حفاظ میں سے ہیں جن کو احادیث بڑی تعداد میں یاد تھیں۔ وہ سمجھدار عالم اور بزرگ انسان تھے۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بکثرت احادیث نقل کرتے تھے۔ ابن قتیبہ کے مطابق وہ واقعۂ حرہ کے دوران میں اپنے گھر ہی میں رہے۔ اہل شام نے ان کے گھر پر یورش کی تو انہوں نے اپنا نام بتلایا اور یہ بھی کہا کہ میں صحابی ہوں۔ اس کے باوجود شامیوں نے ان کا گھر لوٹ لیا اور ان کی داڑھی اکھاڑی۔
(الکُنٰی والالقاب ص۱۵۳)

شیخ محمد طہٰ نجف کہتے ہیں کہ ابوسعید خدری امور دینی میں بڑے ثابت قدم اور امیرالمومنینؑ کے برگزیدہ اصحاب میں سے تھے۔ (اتقان المقال، ص۱۹۲)
استاد مصطفیٰ عبدالرزاق کہتے ہیں کہ وہ عصر صحابہ میں فتویٰ دیتے تھے اور اوسط درجے کے مفتیوں میں شمار ہوتے تھے۔ (تمھید لتاریخ الفلسفہ ص۱۵۳)
حدیث و رجال کی کتابوں میں ایسے دسیوں بزرگ صحابہ کا ذکر ہے جو خلافت پر امام علیؑ کا حق تسلیم کرتے تھے اور علم کا خزانہ اور اسلامی آثار کے حامل تھے۔ مسلمان حرام وحلال کے مسائل کے بارے میں ان ہی سے رجوع کرتے تھے۔ ان بزرگوں میں حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت حذیفہ یمانیؓ، حضرت ابودرداءؓ اور حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ جیسے صحابہ شامل ہیں۔ موخرالذکر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے تک زندہ تھے۔ انہوں نے امام سے عرض کیا تھا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر سلام بھیجا کرتے تھے۔
(رجال کشی ص ۲۸)

وہ صحابہ جن کا برادران اہل سنت کی حدیث و فقہ کی کتابوں میں زیادہ تذکرہ ہے جیسے ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، معاذ بن جبلؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور دوسرے جوان صحابہ جو حدیث و فقہ میں سربرآوردہ ہوئے جن پر بعد میں آنے والوں نے بھروسہ کیا اور جن کے اقوال اور آراء دور تدوین یعنی دوسری صدی ہجری میں جمع کئے گئے اور قابل اعتماد قرار پائے، یہ سب وہ ہیں جو رسول اکرمؐ کے زمانے میں مقدم الذکر اصحاب سے کم نمایاں تھے۔ ان میں سے بیشتر کو رسول اکرمؐ کی صحبت میں رہنے کا آپ کی زندگی کے صرف آخری چند سالوں میں اتفاق ہوا اور ان میں سے کسی کا بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ تعلق نہیں تھا جو ان شیعہ بزرگوں کا تھا جن کی خصوصیات کا ہم نے اس سے پیشتر تذکرہ کیا ہے۔

اگر احکام اسلامی کے موضوع پر کسی بھی اور شیعہ بزرگ کی کسی تصنیف کا وجود تسلیم نہ کیا جائے جب بھی حدیث، فقہ اور تفسیر کے موضوع پر ابن عباسؓ کی تصانیف کے بارے میں جو روایات آئی ہیں ان سے صحابہ کے زمانے اور تابعین کے ابتدائی دور میں اسلامی علوم کو پھیلانے اور ان کو مدوّن کرنے میں شیعوں کی وسیع کوششوں کا ثبوت فراہم ہوجاتا ہے۔

علامہ مجلسی اپنی اسمائے رجال کی کتاب میں لکھتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ، امام علیؑ کے شاگرد اور ان کے احباب میں سے تھے۔ امیرالمومنینؑ کے ساتھ ان کے اخلاص کا حال کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ گو ابن عباسؓ امام علیؑ کو دوست رکھتے تھے اور خلافت پر ان کے استحقاق کے قائل تھے، خلیفہ دوم کے بھی مقربین میں سے تھے اور کبھی کبھی ان سے خلافت کے بارے میں بحث بھی کیا کرتے تھے۔

ایک دن خلیفہ نے ان سے کہا: خدا کی قسم! تمہارے دوست علی (علیہ السلام) واقعی سب سے زیادہ خلافت کے لائق ہیں مگر ہم دو وجہ سے ان سے ڈرتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کو جو یہ موقع ملا تو انہوں نے فوراً اس سے فائدہ اٹھا کر بغیر

کسی جھجک کے خلیفہ کو اپنی رائے کا قائل کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ خلیفہ اور دوسرے لوگ امام علی علیہ السلام کی جانشینی سے خوف زدہ تھے، ابن عباسؓ نے اپنی سمجھ کے مطابق امام علیؑ کے حق کا دفاع کیا۔ جب ابن عباسؓ نے امام علیؑ کو خلافت سے الگ رکھنے کی وجہ پوچھی تو حضرت عمرؓ نے کہا: ہمیں ان کی کم عمری اور فرزندان عبدالمطلب سے ان کی دوستی کی وجہ سے ان سے اندیشہ تھا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا: قریش کو یہ پسند نہیں کہ نبوت اور خلافت تمہارے گھرانے میں جمع ہو جائیں اور تم ظلم کرنے لگو۔ اس لئے قریش نے تمہیں نظرانداز کردیا اور اپنے میں سے ایک شخص کا انتخاب کرلیا اور درست انتخاب کیا۔

حضرت ابن عباسؓ نے بے محابا جواب دیا: آپ کا یہ کہنا کہ قریش کو پسند نہیں، تو ان لوگوں کے متعلق جو کسی ایسی بات کو ناپسند کریں جو اللہ کو پسند ہو قرآن کہتا ہے: خدا نے جو چیز نازل کی تھی انہوں نے اس کو ناپسند کیا تو خدا نے ان کے اعمال اکارت کردیئے۔ (سورۂ محمد: آیت ۹) رہا آپ کا یہ کہنا کہ ہم نے ظلم کیا تو اگر ہم نے خلافت کے معاملے میں ظلم کیا تو اپنوں کے ساتھ کیا حالانکہ ہم تو وہ لوگ ہیں کہ ہمارا اخلاق، اخلاق رسولؐ ہے اور ان کے بارے میں خدا فرماتا ہے: آپ بلند اخلاق کے حامل ہیں۔ (سورۂ قلم: آیت ۴) اور یہ بھی فرمایا ہے: آپ مومنین کو اپنے دامان رحمت میں لے لیجئے۔ (سورۂ شعراء: آیت ۲۱۵) اور یہ کہنا کہ قریش نے انتخاب کیا تو خدا فرماتا ہے: تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے برگزیدہ کرلیتا ہے اور ان کو اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ (سورۂ قصص: آیت ۶۸)

اے امیر المؤمنین! آپ جانتے ہیں کہ خدا نے اپنے بندوں میں سے کس کا انتخاب کیا ہے۔ اگر قریش بھی اسی نظر سے دیکھتے جس نظر سے خدا نے دیکھا تو قریش درست انتخاب میں کامیاب ہوتے۔[۱]

۱۔ امام علیؑ ج ۱ ص ۲۶۱ از استاد عبد الفتاح۔ ابن ابی الحدید

حضرت عمرؓ اور دوسرے خلفاء کے سامنے اپنی صاف گوئی کے باوجود ابن عباسؓ نے خلفاء کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور وہ بھی ان کا احترام کرتے تھے۔

ابن عباسؓ پہلے شخص تھے جنہوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ وہ یقیناً امام علیؑ کے شاگرد تھے۔ مسلمانوں کی نظر میں وہ ترجمان قرآن اور شیخ المفسرین تھے۔[1]

ابوالخیر طبقات المفسرین میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

وہ حبر الامۃ اور شیخ المفسرین ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ انہیں تفقّہ فی الدین عطا کرے اور انہیں قرآن مجید کی تاویل سکھائے۔ قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ان سے بے شمار روایتیں آئی ہیں۔ کوئی ایسی آیت نہیں جس کی تفسیر میں ابن عباسؓ سے کوئی روایت نہ ہو۔

محدث شیخ عباس قمی الکُنیٰ والالقاب میں لکھتے ہیں: ابن عباسؓ کی تفسیر چھپی ہوئی موجود ہے۔

خطیب بغدادی عطا سے روایت کرتے ہیں کہ عطا نے کہا: میں نے ابن عباسؓ کی مجلس سے زیادہ پروقار اور فائدہ رساں کسی کی مجلس نہیں دیکھی۔ قرآن مجید کے طلباء ان کے پاس آکر بیٹھتے اور ان سے سوالات کرتے رہتے تھے۔ علم نحو کے طالبعلم بھی ان سے پوچھتے تھے۔ شعر اور فقہ کے طالبعلم اور ان کا ذوق رکھنے والے بھی ان کے پاس آکر اپنی مشکلات حل کرتے تھے۔ وہ ان سب کی علمی رہنمائی کرتے تھے۔

سید محسن امین اعیان الشیعہ میں لکھتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ نے قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق نافع ارزق خارجی کے دوسو سوالوں کے جوابات دیئے اور ہر جواب کے ساتھ اشعار سے کوئی نہ کوئی مثال پیش کی۔

ابن ندیم نے الفهرست میں لکھا ہے: تفسیر کی کتابوں میں سے ایک حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر ہے جس کو اس کے مضامین کی وسعت کی بنا پر البحر کہا جاتا ہے۔

۱۔ تأسیس الشیعۃ لعلوم الاسلام

تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کے اقوال سب جگہ پھیل جانے سے وہ صحابہ کرام میں مشہور ہوگئے۔ اسی طرح فقہ میں بھی انہوں نے شہرت پائی۔ اس میدان میں بھی ان کے اقوال خوب مشہور ہوئے۔ ان کی رائے فقہ کا خاص مآخذ بن گئی اور ان کے فتاویٰ مشہور ہوگئے۔

ابن عُیینہ کہتے ہیں: عالم تین ہیں: ابن عباسؓ، شعبیؒ اور سفیان ثوریؒ۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں فقہ و حدیث میں ممتاز ہوا۔ اسلامی مراکز میں علماء اور مفتیوں نے مسجدوں میں اپنے ایک طرح کے مدرسے قائم کرلئے تھے جہاں وہ احادیث بیان کرتے تھے اور فتویٰ دیتے تھے۔ مدینہ کے مدرسے میں کچھ فقہائے صحابہ جمع ہوتے تھے جن کے سرکردہ علی بن ابی طالبؓ تھے۔ جو بزرگ وہاں درس دیتے تھے اور احکام بیان کرتے تھے، حضرت عمرؓ ان سے کہا کرتے تھے کہ ''جب علیؓ مسجد میں موجود ہوں تو کوئی اور فتویٰ نہ دے۔''

مکہ میں جو ہجرت سے پہلے مہبطِ وحی تھا، وہاں کی مسجد میں دسیوں طلباء جمع ہوجاتے تھے۔ ان کے استاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے۔ ان کے مشہور ترین شاگردوں میں عکرمہ، قریش کے آزاد کردہ غلام ابو محمد عطاء بن ابی رباح اور بنی مخزوم کے آزاد کردہ غلام مجاہد بن جبیر ہیں۔

عکرمہؒ نے ابن عباسؓ سے علم حاصل کیا تھا۔ وہ ان سے روایت کرتے تھے اور ان کی زندگی ہی میں فتویٰ دیتے تھے۔ عطاء اہل مکہ کے مفتی اور محدث تھے۔ جب اہل مکہ ابن عباسؓ کے پاس جمع ہوکر دین کے احکام پوچھنے لگے تو انہوں نے کہا کہ اے مکہ والو! میرے پاس کیوں جمع ہوگئے ہو جبکہ تمہارے درمیان عطاء موجود ہیں۔

مجاہد بن جبیر نے بھی تفسیر اور فقہ کی تعلیم ابن عباسؓ سے حاصل کی تھی۔

شیخ خضری کہتے ہیں: ابن عباسؓ مکی تھے۔ ہجرت سے دو سال قبل پیدا ہوئے۔ رسول اکرمؐ نے دعا دی کہ ''اللہ ان کو فقیہ بنائے اور قرآن مجید کی تاویل سکھائے۔

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ قرآن ناطق تھے۔

حضرت ابن عباسؓ کے ایک شاگرد مجاہد بن جبیر کہتے ہیں: میں نے تین بار ابن عباسؓ کو قرآن مجید سنایا اور ہر آیت پر رک کر پوچھا کہ یہ آیت کس بارے میں نازل ہوئی اور اس کی شان نزول کیا ہے۔

جب ہم مشہور فقہاء و محدثین کا تمام مراکز اسلامی میں جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یا تو انہوں نے امام علیؑ سے یا ابن عباسؓ سے تعلیم حاصل کی تھی یا پھر ان کے شاگردوں سے۔ سعید بن مسیتب، عکرمہ، عطاء، مجاہد، مسروق بن اجدع، سعید بن جبیر شعبی، حبیب بن ثابت اور دوسرے اسلامی مراکز کے تابعین جن پر اہل سنت کی فقہ کا دارومدار ہے سب امام علیؑ اور ابن عباسؓ کے شاگرد تھے یا ان کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔ حدیث، فقہ اور تفسیر کی کتابوں سے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ ایک بلند مرتبہ عالم تھے۔ انہوں نے اپنی اسی سال سے زیادہ کی عمر اسلامی تعلیمات کے پھیلانے اور اسلامی احکام کے بیان کرنے میں گزاری تھی۔ اس لئے ان کے تمام آثار کی تلاش ہمارے بس سے باہر ہے۔ ان کے اقوال اور ان کی آراء سے تفسیر اور فقہ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ تمام تابعین اور ان کے شاگردوں کا مآخذ ان ہی کے اقوال رہے ہیں۔ محمد بن موسیٰ بن یعقوب نے حضرت ابن عباسؓ کے فتاویٰ کو جمع کیا تھا، بیس جلدوں میں آئے۔

بہرحال ہم اپنے موضوع یعنی "اسلامی فقہ میں تشیع کا کردار" کی مناسبت سے حضرت ابن عباسؓ کی کچھ فقہی آراء یہاں بیان کرتے ہیں۔ اس مختصر بیان سے یہ واضح ہوجائے گا کہ بعض مسائل میں شیعہ فقہاء اور دوسرے مسلمان فقہاء کے درمیان بیّن اختلاف ہے۔ مثالوں سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ رحلت رسولؐ کے بعد شیعوں نے کتاب وسنت کے سوا کبھی کسی مآخذ پر اعتماد نہیں کیا۔ اور فقہ کی ترقی کے تمام مراحل میں اپنے اجتہاد اور فقہی آراء کی بنیاد احکام کے ان ہی دو سرچشموں پر

رکھی اور ان ہی سے وہ احکام مستنبط کئے جو انسانیت کی خیر وفلاح کے ضامن تھے۔

(۱) وضو مین دونوں پاؤں دھونے کے بجائے جو اہلسنت میں مشہور ہے شیعہ امامیہ کے نزدیک دونوں پاؤں کا مسح واجب ہے۔ اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف صحابہ کے ابتدائی زمانے ہی سے چلا آ رہا ہے۔ امام علیؑ، ابن عباسؓ اور دیگر شیعہ فقہاء مسح ہی کا فتویٰ دیتے تھے۔ اس بارے میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کے وضو کرنے کا طریقہ بیان کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ رسول اکرمؐ دونوں پاؤں کا مسح کیا کرتے تھے۔ ابن عباسؓ کہتے تھے کہ کتاب اللہ میں مسح ہی آیا ہے لیکن لوگوں نے مسح چھوڑ کر پاؤں دھونے شروع کردیے۔ان کا اشارہ سورۂ مائدہ کی ساتویں آیت کی طرف تھا جس میں مسح کا حکم آیا ہے: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لئے آمادہ ہو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لیا کرو اور اپنے سروں اور پاؤں پر ٹخنوں تک مسح کرلیا کرو۔'' (سورۂ مائدہ: آیت ۶)

اس آیت میں اَرْجُلَكُمْ فتحہ سے پڑھا جائے یا کسرہ سے مفہوم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ فتحہ کی صورت میں رُءُوْسِ کے محل پر عطف ہوگا اور کسرہ کی صورت میں رُءُوْسِ کے لفظ پر۔ رُءُوْسِ پر عطف کی دلیل یہ ہے کہ پہلا جملہ جس میں دھونے کا حکم ہے وہ ختم ہو کر واو استناف[1] سے دوسرا جملہ شروع ہوتا ہے جس میں کچھ

۱۔ اس سے قبل ''واو'' کی بحث گزر چکی ہے اور یہاں پھر آئی ہے اس لئے ہم بتاتے چلیں کہ ''واو'' چند معانی کے لئے مستعمل ہے۔ (۱) حرف عطف اور اس کے معنی مطلقاً جمع کے ہیں جیسے جَاءَ زَيْدٌ وَ عَمْرٌو (۲) واو حالیہ جملہ اسمیہ پر جیسے جَاءَ زَيْدٌ وَالشَّمْسُ طَالِعَةٌ جملہ فعلیہ پر جیسے جَاءَ زَيْدٌ وَقَدْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ (۳) واو استناف جیسے لَا تَاْكُلُ السَّمَكَ وَتَشْرَبُ اللَّبَنَ (۴) واو معیت جیسے سِرْتُ وَالْجَبَلَ (۵) واو جو اس مضارع منصوب کے اوپر داخل ہو جو نہی کے جواب میں واقع ہو جیسے لَا تَنْهَ عَنْ خُلُقٍ وَتَاْتِيَ مِثْلَهُ (۶) واو قسم جیسے وَاللّٰهِ الْعَظِيْمِ

اور حکم ہے۔ اب یہ صحیح نہیں کہ دوسرے جملے کے ایک لفظ کا پہلے جملے کے کسی لفظ پر عطف کر دیا جائے جبکہ دوسرے جملے کو واو استئناف جدا کرتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ عبارت بھی واضح ہے اور معنی میں بھی کوئی ابہام نہیں۔

---

(۷) واو رُبَّ جیسے وَلَیْلٍ کَمَوْجِ الْبَحْرِ اَرْخٰی سُدُوْلَہٗ (۸) واو ضمیر جمع مذکر جیسے قَامُوْا (۹) واو علامت جمع مذکر جیسے یَلُوْ مُوْنَنِی قَوْمِیْ (۱۰) واو فصل جیسے عَمْرٌو کا واو حالت رفعی و جری میں تاکہ عُمر سے فرق ہو جائے۔ (۱۱) واو زائدہ بعد الا جیسے مَا مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَلَہٗ طَمَعٌ اَوْ حَسَدٌ (مصباح اللغات ابو الفضل عبدالحفیظ بلیاوی مطبوعہ تاج آفسٹ پریس اردو بازار دہلی ۱۹۲۹ء)

''حجتہ الاسلام رسول جعفریان اپنی کتاب'' تحریف قرآن ؟'' کے صفحہ ۳۳ پر لکھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے آیہ کنز سے واو کو حذف کرنا چاہا لیکن صحابہ نے اعتراض کیا۔ علباء بن احمد سے منقول ہے کہ عثمانؓ جب مصحف کو لکھوا رہے تھے تو انہوں نے چاہا کہ والذین یکنزون سے واو کو حذف کر دیں تو ابی بن کعبؓ نے کہا کہ آپ واو کو ملحق کریں گے یا میں اپنی تلوار سے اپنی گردن کاٹ لوں پس انہوں نے واو کو ملحق کر دیا۔ (تفسیر در منثور ج ۳ ص ۲۲۳ از علامہ جلال الدین سیوطی اور تفسیر المیزان ج ۹ ص ۲۵۶ از علامہ سید محمد حسین طباطبائی)

آج کل ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو نہ تو علوم قرآن پر کامل دسترس رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی مستند عالم دین سے رجوع کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے آپ کو دین اور احکام دین کے معاملے میں روشن فکر جبکہ علمائے دین کو قدامت پسند سمجھتے ہیں۔ اسلام شناسی پر مختلف ٹی وی ٹاک شوز میں کچھ غیر مستند علماء اور دانشور حتی کہ بعض اداکار اور گلوکار جلوہ گر ہوتے ہیں جن کی ''ژرف نگاہی'' دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ عَلَی الْاِسْلَامِ السَّلَامُ۔ مغربی مصنفین یا مستشرقین سے مرعوب ہو کر قرآن مجید کی دل پسند تفسیر کرنے والوں کو یہ حدیث پیغمبرؐ نہیں بھولنی چاہیے: مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْیِہٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ ''جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا۔'' (تفسیر صافی از ملا محسن فیض کاشانی اور بحار الانوار از علامہ مجلسی)

علامہ اقبالؔ سراج الدین پال کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

صیام کے متعلق آپ کا مضمون نہایت عمدہ ہے اور میرے مذہب کے عین مطابق بلکہ آپ کے مضمون کا آخری فقرہ میں نے سب سے پہلے پڑھا، یہ معلوم کرنے کیلئے کہ آیا آپ کو یہ حقیقت معلوم ہے کہ باب افعال کا ایک خاصہ سلب ماخذ ہے، یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں، یطیقون میں تمام بوڑھے، فطری کمزور اور حائضہ عورتیں شامل ہیں۔

اس مثال کو لیجئے کہ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ضَرَبْتُ زَیْدًا وَ عَمْرًوا (میں نے زید اور عمرو کو مارا) وَ اَکْرَمْتُ خَالِدًا وَ بَکْرًا (اور میں نے خالد اور بکر کی عزت کی) اب یہ صحیح نہیں کہ دوسرے جملے کے بکر کو پہلے جملے کے ساتھ جوڑ دیں اور یہ

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں۔کل میں ایک صوفی مفسر قرآن کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا،لکھتے ہیں:"خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ" میں ایام سے مراد تنزلات ہیں یعنی فی ستة تنزلات ہیں۔کم بخت کو یہ معلوم نہیں کہ عربی زبان میں "یوم" کا یہ مفہوم قطعاً نہیں اور نہ ہوسکتا ہے کہ تخلیق بالتنزلات کا مفہوم ہی عربوں کے مذاق اور فطرت کے مخالف ہے۔اس طرح ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیئے ہیں۔(کلیات مکاتیب اقبال جلد اول مرتبہ سید مظفر حسین برنی مطبوعہ ترتیب پبلشرز لاہور)

واضح رہے کہ مکتب خلفاء کے علماء و مفسرین کئی قرآنی آیات میں حقیقت و مجاز میں بالکل فرق نہیں کرتے۔ وہ قرآن میں ید "ہاتھ"، عین "آنکھ"، وجہ "چہرہ" اور ساق "پنڈلی" جیسے الفاظ سے خداوند عالم کے اعضائے بدن ہی مراد لیتے ہیں۔وہ خدا کے لئے عرش و کرسی کو بھی لغوی اور ظاہری معنوں پر ہی محمول کرتے ہیں۔

حقیقت و مجاز کی طرح قرآن مجید میں حذف مضاف کا معاملہ بھی ہے مثلاً برادران یوسفؑ نے مصر سے واپسی پر حضرت یعقوبؑ سے کہا تھا: وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِيْهَا (سورۂ یوسف: ۸۲) یہاں قریہ سے "اہل قریہ" مراد ہیں مگر لفظ "اہل" محذوف ہے۔زرکشی کی البرھان فی علوم القرآن جلد ۳ مطبوعہ مصر ۱۳۷۷ھ کے مطابق قرآن مجید میں تقریباً ایک ہزار مقامات پر حذف مضاف کی مثالیں موجود ہیں۔

یہاں سعودی عرب کے مفتی اعظم مرحوم عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے اس فتویٰ کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس میں انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ آیا زمین گول ہے یا مسطح وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (سورۂ غاشیہ: ۲۰) کے قرآنی ریفرنس سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ زمین مسطح اور ہموار ہے اور جو اس بات کو نہ مانے وہ کافر ہے۔

ترجمہ کریں کہ میں نے زید، عمرو اور بکر کو مارا اور خالد کی عزت کی۔ یوں بھی بغیر کسی معقول وجہ کے نزدیک کے کلمے کو چھوڑ کر دور کے کلمے پر عطف نامناسب ہے۔

(۲) شیعہ امامیہ کا ایک اور مشہور مسئلہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک کسی معینہ مدت کے لئے نکاح جائز ہے۔ اس طرح کے نکاح کو ازدواج مؤقت یا متعہ کہا جاتا ہے۔ اس کی بھی سب شرائط وہی ہیں جو نکاح دائمی کی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس طرح کا نکاح اتنی مدت کے لئے ہوتا ہے جتنی مدت عورت مرد آپس میں طے کرلیں۔

اس طرح کے نکاح کے جائز ہونے یا نہ ہونے میں شیعہ اور دوسرے مسلمانوں میں اختلاف صحابہ کرام کے زمانے میں پیدا ہوا۔ جو لوگ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں ان کا کہنا ہے کہ خلیفہ دوم نے اس کام کی ممانعت کردی تھی۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ رسول اکرمؐ نے مصلحتاً بعض غزوات میں نکاح مؤقت کی اجازت دی تھی اور بعد میں اس سے منع فرما دیا تھا۔ یحییٰ نے مالک سے، انہوں نے شہاب سے، انہوں نے محمد بن علی بن ابی طالبؑ کے بیٹوں عبداللہ اور حسن سے، انہوں نے اپنے والد محمد سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے تھے: میرے والد امام علیؑ نے فرمایا ہے کہ رسول اکرمؐ نے جنگ خیبر کے موقع پر عورتوں کے متعہ اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے کی ممانعت کردی تھی۔

لیکن صحابہ کرام کی ایک جماعت جس میں عبداللہ بن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، سدیؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور امام علی علیہ السلام شامل ہیں، اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اسی طرح کچھ تابعین سے بھی یہی روایت ہے۔

حبیب بن ثابت نے ابونصرہ سے روایت کی ہے کہ ابونصرہ کہتے تھے:

میں نے ابن عباسؓ سے متعہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: کیا تم نے سورۂ نساء (آیت: ۲۴) نہیں پڑھی؟ میں نے کہا: جی ہاں! پڑھی ہے۔ انہوں نے کہا: تو کیا یہ آیت **فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ**

''جن عورتوں سے تم ایک معینہ مدت تک فائدہ حاصل کرو ان کا مہر ادا کر دو'' نہیں پڑھی؟ میں نے کہا: نہیں! اس طرح تو میں نے نہیں پڑھی۔ انہوں نے کہا: بخدا! اللہ نے یہ آیت اسی طرح نازل کی ہے۔ انہوں نے تین بار یہی بات دہرائی۔

تفسیر کی کتابوں میں ابی بن کعبؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، سعید بن جبیرؓ وغیرہ سے یہ آیت اس طرح منقول ہے: **فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰی اَجَلٍ مُسَمًّی فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ**

جہاں ہم نے تشریعی آیات کا ذکر کیا ہے وہاں ہم نے بتایا تھا کہ شیعہ امامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید بغیر کسی کمی زیادتی کے وہی ہے جو ہر جگہ متداول ہے۔ اگر ان احادیث کو صحیح مان لیا جائے تو جو زائد الفاظ بعض آیات میں منقول ہیں انہیں بمنزلہ تفسیر کے سمجھا جائے گا جن کا اضافہ یا تو خود رسول اللہؐ نے کیا ہے یا ان کے زمانے کے مسلمانوں نے۔ بہرحال ابن عباسؓ وغیرہ متعہ کے جواز کے قائل تھے۔

حکم بن عیینہ سے روایت ہے کہ امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

اگر عمرؓ ازدواج مؤقت کی ممانعت نہ کر دیتے تو کوئی بدبخت ہی زنا کرتا۔

کتب حدیث میں حضرت عمرؓ کا یہ قول تو مشہور ہی ہے کہ دو طرح کا متعہ جو زمانہ رسولؐ میں حلال تھا، میں اس سے منع کرتا ہوں۔ جو اُن کا ارتکاب کرے گا میں اسے سزا دوں گا۔

حضرت عمرؓ نے یہ کہا کہ میں نے ممانعت کر دی ہے، یہ نہیں کہا کہ وہ حکم کسی خاص زمانے میں کسی خاص مصلحت سے دیا گیا تھا۔ اگر شارع کسی حکم کو کسی خاص زمانے یا مصلحت سے مقید کر دے تو پھر تو وہ حکم اس مصلحت کے ختم ہو جانے یا وہ خاص زمانہ گزر جانے کے بعد خود بخود غیر مؤثر ہو جائے گا مگر یہاں یہ صورت نہیں۔

اگر شیعوں کے نزدیک یہ بات ثابت ہو جاتی کہ رسول اکرمؐ نے متعہ کی ممانعت کر دی تھی تو ان میں سے کوئی بھی اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا۔ وہ روایت جو

امام علیؑ سے منسوب کی گئی ہے وضعی ہے کیونکہ امام علیؑ خود ان لوگوں میں سے ہیں جو متعہ کے مباح ہونے کے قائل ہیں۔

(۳) شیعہ امامیہ کا ایک مشہور مسئلہ یہ ہے کہ جب عورت بالغ اور خود مختار ہو جائے تو اسے اختیار ہے جس سے چاہے نکاح کرلے۔ چاہے کنواری ہو یا پہلے نکاح کر چکی ہو۔ فقہائے شیعہ میں یہ مسئلہ مشہور ہے اور اس میں کسی کو کچھ شک نہیں البتہ ان کے نزدیک یہ بہتر ہے کہ عورت اس ضمن میں اپنے ولی سے اجازت لے لے۔ ابن عباسؓ کا بھی فتویٰ اسی پر ہے۔ جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنے اوپر بیوہ کا زیادہ حق ہے، کنواری البتہ اجازت لے لے۔[1]

شیعوں کے علاوہ دوسروں کے نزدیک عورت کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر درست نہیں ہے۔ کچھ لوگ باکرہ اور ثیبہ اور خوبصورت اور بدصورت کے درمیان فرق کے قائل ہیں۔[2]

امام مالک کہتے ہیں کہ اگر ولی نے باکرہ کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر بھی کسی سے کردیا تو لازماً وہ اسی کی ہوگئی۔[3]

(۴) ایک اور مشہور مسئلہ تین طلاقوں کا ہے۔ شیعہ امامیہ کے نزدیک اگر تین طلاقیں ایک ہی دفعہ میں ایک ہی مجلس میں دی جائیں تو وہ ایک ہی طلاق شمار ہوں گی۔ کچھ علماء تو ایسی طلاق کو باطل اور غیر مؤثر کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ بھی اس صورت میں ایک ہی طلاق کا حکم دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے: رسول اکرمؐ، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں بھی ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے اس عمل کا نام تین طلاقیں رکھ دیا۔[4]

۱۔ موطأ مالک ص۶۲ کتاب النکاح
۲۔ الانتصار از شیخ مفید ص ۷۵
۳۔ موطأ مالک ص۶۲ کتاب النکاح
۴۔ تاریخ التشریع الاسلامی

عکرمہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے کہا: رکابہ بن یزید نے ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور بعد میں اس بات پر بہت پچھتائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا: تم نے کس طرح طلاق دی تھی؟ انہوں نے کہا: میں نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیدیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: وہ ایک ہی شمار ہوگی۔ اگر چاہو تو رجوع کرلو۔

لیکن اہل سنت کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اس طرح اگر طلاق دی جائے تو تین طلاقیں شمار ہوں گی۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک اگرچہ اس طرح طلاق دینے کو حرام اور خلاف سنت سمجھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک طلاقیں تین ہی شمار ہوں گی۔[1]

(۵) شیعہ امامیہ کا ایک اور مشہور مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ اگر میں بازار جاؤں یا فلاں کام کروں تو میری بیوی پر طلاق یا وہ میری ماں کی پیٹھ کی طرح یا میرا غلام آزاد یا میرا مال صدقہ ہوگا تو یہ قسم نہیں ہوگی۔ نہ اس میں گناہ ہوگا نہ کفارہ دینا لازم ہوگا نہ اس کی وجہ سے طلاق ہوگی نہ یہ ظہار ہوگا اور نہ صدقہ واجب ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ کا بھی فیصلہ یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر کوئی ایسی قسم کھائے اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا لیکن بقیہ فقہاء نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ وہ طلاق، ظہار اور غلام آزاد کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور ان کا فتویٰ یہی ہے۔

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں فلاں گھر میں داخل نہیں ہوں گا۔ پھر کسی مجبوری سے یا بھولے سے داخل ہوگیا تو اس پر نہ کفارہ ہے نہ کچھ اور۔ ان کی دلیل یہ حدیث نبوی ہے: میری امت کو خطا، بھول اور وہ کام جس کے کرنے پر کوئی شخص مجبور ہوجائے اور اضطراری کام معاف ہے۔

دوسری دلیل یہ آیت ہے: لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ فِيۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِهٖ ''جو کام تم غلطی سے کر بیٹھو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔''[2] (سورۂ احزاب: آیت ۵)

[1،2] الانتصار از شیخ مفید

چونکہ شیعہ امامیہ کا عمل ان ہی دو مآخذوں یعنی کتاب و سنت پر ہے اس لئے انہوں نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔

(۶) ایک اور مسئلہ جس میں شیعہ اور دوسروں میں اختلاف ہے تعصیب کے نام سے مشہور ہے۔ مسئلہ اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کی وارث بہن اور چچا یا پھوپھی ہو تو اس صورت میں شیعہ میراث کی تقسیم کے عام قانون پر اعتماد کرتے ہیں جو یہ ہے کہ کس کا مرحوم سے زیادہ قریبی رشتہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "کتاب اللہ کی رو سے بعض رشتہ دار دوسرے بعض رشتہ داروں سے زیادہ مقدم ہیں۔" (سورہٴ انفال: آیت ۷۵) لہٰذا شیعوں کے نزدیک ترکہ بیٹی اور بہن کو ملے گا۔ اگر ان دو کے ساتھ میت کا شوہر یا اس کی بیوی بھی موجود ہو تو اس کا بھی حصہ ہوگا۔ اس کے بعد باقی مال بہنوں یا بیٹیوں کا ہوگا۔ بیٹی کی موجودگی میں بھائی کو اور بہن کی موجودگی میں چچا کو میراث نہیں ملے گی۔ یہ حکم نص قرآنی اور ائمہ علیہم السلام سے مروی متعدد روایات پر مبنی ہے۔

یہی رائے امام علی علیہ السلام، عبداللہ بن عباسؓ، جابر بن عبداللہؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، ابراہیم نخعیؒ اور داؤد اصفہانی کی بھی ہے۔[1]

غیر شیعوں کا خیال یہ ہے کہ میت کی بیٹی کے ساتھ اس کا بھائی یا بھتیجا اور بہن کے ساتھ چچا یا چچازاد بھائی بھی حقدار ہوتا ہے۔ بیٹی کو اس کا مقررہ حصہ ملے گا اور باقی مال میت کے بھائی کا ہوگا۔ یہی صورت بہن کے ساتھ چچا یا چچا کے بیٹے کی ہوگی۔ ان لوگوں کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابن طاؤس نے اپنے باپ طاؤس سے اور طاؤس نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ ابن عباسؓ کہتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جن کو کتاب اللہ کے مطابق حصہ ملتا ہو مال کو ان پر تقسیم کردو اور جو باقی بچے

۱۔ الانتصار از شیخ مفید

وہ قریبی مرد رشتہ داروں کا حق ہے۔ (یعنی روایات میں ہے کہ ان رشتہ داروں کا حق ہے جو زیادہ نزدیک ہوں)۔

علاوہ اس کے کہ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ عبداللہ بن طاؤس اس کا راوی سلیمان بن عبدالملک کا پروردہ ہے۔ خود ابن عباسؓ نے بھی اس کی تکذیب کی ہے۔

جب قاریہ بن مضرب نے مکے میں حضرت ابن عباسؓ سے کہا: اے ابن عباسؓ عراق والے آپ سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں جو آپ کے غلام طاؤس نے ان کو سنائی ہے کہ "وارثوں کو حصہ دینے کے بعد جو کچھ باقی بچے وہ قریبی مرد رشتہ داروں کا حق ہے۔"

ابن عباسؓ نے قاریہ سے پوچھا: کیا تم عراقی ہو؟

قاریہ نے کہا: جی ہاں!

ابن عباسؓ نے کہا: تو میری طرف سے اہل عراق سے کہہ دو کہ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ "تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون سا شخص تم کو نفع پہنچانے کے لحاظ سے تم سے نزدیک تر ہے۔" (سورۂ نساء: آیت ۱۱) اور "کتاب اللہ کی رو سے بعض رشتہ دار دوسرے بعض رشتہ داروں سے مقدم ہیں۔" (سورۂ انفال: آیت ۷۵) سچ تو یہ ہے کہ نہ میں نے ایسا کہا ہے اور نہ طاؤس نے یہ بات میرے حوالے سے کہی ہے۔

قاریہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں طاؤس سے ملا تو انہوں نے کہا: بخدا! میں نے یہ بات حضرت ابن عباسؓ سے نقل نہیں کی۔ یہ تو شیطان نے ان لوگوں کی زبان پر جاری کردی ہے۔[۱]

جو لوگ تعصیب (عصبہ کا میراث میں حق) کے اصول کو مانتے ہیں ان کو یہ بھی

۱۔ جواهر الکلام فی الفقه ، کتاب الفرائض مولفہ شیخ محمد حسن میں ہے کہ حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد رسول اللہؐ نے ان کا سارا مال ان کی بیٹی کو دے دیا تھا۔

چاہئے کہ بیٹیوں اور بہنوں کا حصہ لگانے کے بعد جو کچھ باقی بچے، اس میں مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات قائم کریں۔ مثلاً اگر کوئی شخص بیٹی اور بھائی بہن چھوڑ کر مرے یا بہن اور چچا پھوپھی چھوڑ کر مرے تو اس آیت کے ظاہر کے مطابق بھائی بہن یا چچا پھوپھی کو برابر کا حصہ ملنا چاہئے۔ ''مردوں کا بھی حصہ ہے اس چیز میں جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابتدار چھوڑ جائیں اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس چیز میں جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابتدار چھوڑ جائیں۔ اس میں خواہ ترکہ قلیل ہو یا کثیر۔'' (سورۂ نساء: آیت ۷)

مذکورہ مثال میں بھائی کے ساتھ بہن اور چچا کے ساتھ پھوپھی کا بھی حصہ ہونا چاہئے لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ بیٹی کو حصہ دینے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ بھائی کو ملے گا اور بہن کا اس میں کچھ حصہ نہیں اسی طرح چچا کو ملے گا اور پھوپھی کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ ظاہر آیت کے مطابق تو بقیہ مال میں ان سب کا حصہ ہونا چاہئے۔

مندرجہ بالا دو آیتوں کی بنا پر شیعہ امامیہ صحابہ کرام کے زمانے سے آج تک تعصیب کے بطلان پر یقین رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت تعصیب کے اصول کے خلاف ایک اور دلیل ہے: ''اگر کوئی شخص لاولد مرجائے اور اس کے ایک بہن ہو تو ترکہ کا نصف اس کا ہے۔'' (سورۂ نساء: آیت ۱۲۵)

اس آیت میں تصریح ہے کہ میراث میں بہن کا حصہ صرف اس وقت ہے جب مرحوم کا زیادہ قریبی وارث موجود نہ ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قریب تر وارث کے ہوتے ہوئے بہن کا کوئی حق نہیں۔ لیکن جو لوگ تعصیب کے اصول کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر مرحوم کے فقط بیٹی ہو تو بیٹی کے حصے سے جو زیادہ ہوگا وہ بہن کو ملے گا۔ حدیث نبوی میں اس کی ممانعت ہے: فَمَنْ تَرَکَ بِنْتًا وَاُخْتًا اِنَّ الْمَالَ کُلُّهُ لِلْبِنْتِ '' اگر کوئی بیٹی اور بہن چھوڑے تو اس کا سب مال اس کی بیٹی کا ہے۔'' اس سلسلے میں ائمہ علیہم السلام سے بہت سی صحیح احادیث آئی ہیں۔

(۷) ان مسائل میں سے جن کے بارے میں صحابہ کرام ہی کے زمانے میں شیعوں نے دوسروں سے مختلف موقف اختیار کیا، ایک وہ صورت ہے جس میں وارثوں کے حصے میت کے ترکے سے بڑھ جائیں۔ہم نمونے کے طور پر ایک مثال پیش کرتے ہیں:اگر کوئی مرحومہ شوہر اور دو بیٹیاں چھوڑے تو قرآن مجید کی تصریح کے مطابق تمام ترکہ ان دو بیٹیوں کا (اور ماں باپ کا، اگر ماں باپ بھی ہوں) ہوگا۔ شوہر کا حصہ اس صورت میں زائد ہوجاتا ہے یعنی اس کے لئے مال نہیں بچتا۔ شیعہ ایسی صورتوں میں شوہر، بیوی، ماں اور ماں کے بھائیوں اور بہنوں کو ان کا پورا حصہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد جو مال باقی بچے وہ بیٹوں اور باپ کو ملتا ہے۔ اگر ان وارثوں کو حصہ دینے کے بعد جن کا حصہ قرآن کی رو سے مقرر ہے، کچھ مال باقی بچ جائے تو وہ اس کو ملے گا جس کا حصہ پہلے کم کردیا گیا تھا (یا بالفاظ دیگر اس کو اس کا چھوٹا حصہ دیا گیا تھا)۔ اگر کوئی عورت شوہر اور ایک بیٹی چھوڑتی ہے تو شوہر کو اس کا چھوٹا حصہ یعنی ایک چہارم ملے گا اور جو مال باقی بچے گا وہ سب بیٹی کا ہوگا۔

ان مسائل سے متعلق ایک عام قانون یہ ہے کہ اگر کسی وارث کے دو مختلف حصے مقرر ہیں ایک کم اور ایک زیادہ، تو اسے ان دونوں مقررہ حصوں میں سے ایک ضرور پورا ملے گا۔ لیکن جس وارث کا صرف ایک ہی معین حصہ مقرر ہے یا کوئی حصہ مقرر ہی نہیں ہے تو اس کا حصہ کم وبیش ہوسکتا ہے۔

مندرجہ بالا مسئلہ فقہاء میں ''عول'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سوال حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس وقت پیش آیا تھا جب ایک عورت فوت ہوگئی اور اس نے شوہر اور دو بہنیں اپنے وارث چھوڑے۔ چونکہ ان وارثوں کے حصے متروکہ مال سے زیادہ بنتے تھے اس لئے حضرت عمرؓ کو ترکہ کی تقسیم میں الجھن پیش آئی۔ انہوں نے صحابہ کو جمع کر کے ان سے کہا: اللہ تعالٰی نے شوہر کا حصہ نصف مقرر کیا ہے اور بیٹیوں میں سے ہر ایک کا ایک تہائی۔ اب ہم اگر شوہر کو اس کا پورا حصہ دیں تو بیٹیوں کا حصہ کم پڑجاتا ہے اور اگر دونوں بیٹیوں کو ان کا حصہ دیں تو شوہر کا حصہ باقی نہیں بچتا۔

بہنوں کا حصہ ہے۔ ان میں سے ایک کا حصہ نصف ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو ان کا حصہ دو تہائی ہے۔ اور جب ان وارثوں کا حصہ دیا جائے جو مقدم ہیں تو پھر ان کو باقی ماندہ ترکے کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ ہیں وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے مؤخر کیا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا ہے اور جن کو مؤخر کیا ہے ان سب کو جمع کر کے پہلے ان کو پورا حق دیا جائے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا ہے۔ پھر اگر کچھ بچے تو وہ ان کا حق ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مؤخر کیا ہے۔[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے جدامجد امام علی علیہ السلام سے ایک حدیث روایت کی ہے جس میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ گفتگو بھی شامل ہے۔ ابوبصیر امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ امام نے فرمایا: چار آدمی ایسے ہیں کہ انہیں میراث میں کوئی نقصان نہیں پہنچتا: باپ، ماں، شوہر اور بیوی۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو کتاب و سنت سے اس مسئلے کا حل مشکل معلوم ہوا تو انہوں نے اسے اس صورت پر قیاس کر لیا جس میں مال سب وارثوں پر تقسیم کے لئے ناکافی ہو کہ اس حالت میں سب وارث متروکہ مال میں شریک ہوتے ہیں اور ترکہ اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو کچھ حصہ مل جائے گو اس صورت میں ہر ایک کو اس کے اصل حصے سے کم ملتا ہے۔ وجہ قیاس یا علت مشترک یہ سمجھی گئی کہ دونوں صورتوں میں مال اتنا نہیں ہے کہ سب وارثوں کو پورا حصہ مل سکے۔

زفر بن اوس بصری نے جو حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ نے اس مسئلے میں کتاب اللہ پر اعتماد کیا ہے اور یہی کام جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، امام علی علیہ السلام نے بھی اس سے قبل انجام دیا تھا۔ اس طریقے پر عمل کرنے سے وارثوں میں سے کسی پر

---

۱۰۱ جواھر الکلام فی الفقه ، کتاب الفرائض مولفہ شیخ محمد حسن

اس پر سب نے اتفاق کرلیا کہ شوہر کا حصہ بھی کم کردیا جائے اور دونوں بیٹیوں کا بھی۔ اس وقت سے اکثر فقہاء اور اہل سنت کے مذاہب اربعہ کے ائمہ کا یہی مذہب ہے۔

جب زفر بن اوس بصری نے حضرت ابن عباسؓ سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا: عول کی بنیاد حضرت عمر بن خطابؓ نے ڈالی۔ جب میراث کے سہام کی تقسیم میں انہیں دشواری پیش آئی تو انہوں نے ایک کے حصے کی کمی دوسرے کے حصے سے پوری کردی اور کہا کہ بخدا! میں نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے کس کو مقدم رکھا ہے اور کس کو مؤخر۔ میں نے جو طریقہ تجویز کیا ہے میرے خیال میں مال کی تقسیم کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کے بعد کہا: بخدا! اگر حضرت عمرؓ اس کو مقدم کرتے جس کو خدا نے مقدم کیا تھا اور اس کو مؤخر کرتے جسے خدا نے مؤخر کیا تھا تو کسی کا بھی حق جگہ سے بے جگہ نہ ہوتا اور نہ ''عول'' کی ضرورت پیش آتی۔

زفر بن اوس نے پوچھا: مقدم کون ہے اور مؤخر کون؟

حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا: جس کا حصہ کسی دوسرے وارث کے حصے کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا اس کو اللہ تعالیٰ نے مقدم ٹھہرایا ہے اور جس کا حصہ ایسا ہے کہ اگر وارث کو وہ حصہ نہ ملے تو اسے باقی ترکہ ملتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے مؤخر قرار دیا ہے۔ جو وارث مقدم ہیں ان میں شوہر ہے کہ اس کا حصہ ترکے کا نصف ہے۔ اگر ایسی صورت ہو کہ اسے نصف نہ ملے تو پھر اس کا حصہ ایک چوتھائی ہے لیکن کسی حالت میں بھی اس کا حصہ اس سے کم نہیں ہوتا۔ بیوی کا حصہ ایک چوتھائی ہے لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ اسے ایک چوتھائی نہ مل سکے تو اس کو آٹھواں حصہ ملے گا اس سے کم نہیں ہوگا۔ ماں کا حصہ ایک تہائی ہے۔ اگر اسے ایک تہائی نہ ملے تو چھٹا حصہ لے گا اور اس سے کم نہیں ہوگا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے مؤخر کیا ہے وہ بیٹیوں اور

ظلم نہیں ہوتا۔ اور جس صورت میں بیٹیوں اور بہنوں کو کم ملتا ہے اس کی تلافی اس صورت سے ہو جاتی ہے جس میں مال سہام سے زیادہ ہو اور ان کو زیادہ مل جائے۔

جو شخص ابن عباسؓ کی فقہی آراء کا ان کتابوں میں مطالعہ کرے گا جو علمائے فقہ و حدیث نے دوسری صدی کے اواخر میں لکھی ہیں، وہ اس نتیجے پر ضرور پہنچے گا کہ ابن عباسؓ اپنے فتاویٰ میں صرف قرآن و سنت پر ہی اعتماد کرتے تھے اور جب کسی مسئلے کے بارے میں انہیں کوئی آیت یا حدیث بصورت نص نہیں ملتی تھی تو وہ اپنے فہم کے مطابق قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے اجتہاد اور فکر سے کام لیتے تھے۔

یہ ہمارے امکان میں نہیں کہ ہم یہاں ان تمام شیعہ فقہاء و محدثین کا تعارف کرائیں جو صحابہ کے دور اول میں گزرے ہیں۔ یہ دور رسول اکرمؐ کی وفات سے شروع ہو کر معاویہ بن ہند کی حکومت کے آغاز تک پر محیط ہے اور اس میں خلفائے ثلاثہ اور امام علی علیہ السلام کی خلافت کا زمانہ شامل ہے۔ یہ کام بالخصوص اس لئے بھی ممکن نہیں کہ بعض فقہاء و محدثین کا تو تاریخ نے ساتھ دیا اور بعض دوسروں پر تاریخ نے ظلم کیا ہے۔ بلکہ ظلم ان پر کیا ہے جو اُن لوگوں کے مقابلے میں جن کا زمانے نے ساتھ دیا علمی لحاظ سے بہتر تھے۔ رسول اکرمؐ سے ان کے تعلقات زیادہ مضبوط تھے اور وہ حلال و حرام سے زیادہ واقف تھے۔ لہٰذا ہم یہاں شیعہ فقہی آراء کے اسی مختصر سے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ جو مثالیں ہم نے پیش کی ہیں ان سے تشریع احکام میں شیعوں کے موقف اور ان کی کوششوں کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

عصر صحابہ میں شیعوں کے ماخذ احکام

اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ کتاب وسنت کے علاوہ مسلمانوں نے اجماع و قیاس کو بھی احکام کے مآخذ کے طور پر تسلیم کرلیا تھا۔ جہاں تک کتاب وسنت کا تعلق ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے آج تک سب مسلمان فقہی احکام کیلئے ان کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تو کتاب وسنت کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ اس وقت تمام احکام اور ہدایات مسلمانوں تک یا تو قرآنی آیات کے ذریعے سے پہنچتی تھیں یا اس وحی غیر متلو کے ذریعے سے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتی تھی لیکن جو قرآن مجید کا جزو نہیں تھی۔ چنانچہ اس وقت سب لوگوں کے لئے احکام کا معلوم کرنا ایک آسان اور سادہ سی بات تھی۔

ان دنوں مسلمان یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کس صورت میں انہیں کیا کرنا ہے، چاہے ان کاموں کا تعلق عبادات سے ہو یا غیر عبادات سے، قرآنی نصوص اور جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ صحرا اور دیہات کے رہنے والے جو مسلمان ہوگئے تھے، ان کی تعلیم کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخصوص افراد کو بھیجتے رہتے تھے۔ جیسا کہ خود قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے۔ یہ افراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال اور فتاویٰ اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے۔ بعض اوقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ

احکام لکھوا بھی دیتے تھے۔ یہ تحریریں لشکر کے سالاروں، انتظامی حکام اور محصول وصول کرنے والوں کے ذریعے سے مختلف علاقوں اور صحرا اور دیہات تک بھیجی جاتی تھیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو خط یمن، ہمدان اور ہجر ارسال فرمائے ان میں زکوٰۃ اور صدقات کے احکام اور نکاح سے متعلق بعض احکام کا بیان تھا۔ فقہ کے موضوع پر لکھنے والے بعض مصنفین کا دعویٰ ہے کہ جن مسائل کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی، آپ ان کے بارے میں اجتہاد سے کام لیتے تھے۔

ڈاکٹر محمد یوسف کہتے ہیں: "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احکام کے بارے میں اپنی رائے اجتہاد کرنے کے بعد ظاہر فرماتے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ آپ کو صرف اسی رائے پر قائم رکھتا تھا جو صحیح ہوتی تھی۔"[۱]

رحلت رسولؐ کے بعد ایسے واقعات پیش آئے جو آپ کی زندگی میں پیش نہیں آئے تھے۔ لڑائیوں اور ان غیر ملکوں سے جن سے لڑائیاں ہوئیں، رابطے کے نتیجے میں مسلمانوں کی زندگی میں وسعت پیدا ہوئی تو خود بخود فقہ کی ضرورت بڑھ گئی۔ ایسے ایسے نئے مسائل پیش آنے لگے جن سے متعلق احکام قرآن وسنت سے معلوم نہیں کئے جاسکتے تھے۔ اس صورت حال میں اہل سنت نے تو استخراج احکام کے لئے دو نئے ماخذ اجماع و قیاس کی شکل میں قرار دے لئے جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بھی بیان کیا ہے۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے اور دوسروں کی بھی یہی رائے ہے کہ اجماع اور قیاس کی ابتداء عصر صحابہ میں ہی ہوگئی تھی۔

اجماع کا طریقہ یہ تھا کہ کسی مسئلے پر خلیفہ وقت کچھ مسلمانوں سے مشورہ کرتا تھا۔ وہ لوگ اپنی رائے دیتے تھے۔ جس بات پر اتفاق رائے ہو جاتا تھا اسی کے مطابق فتویٰ دیدیا جاتا تھا۔ اس طرح کے اتفاق رائے کا نام اجماع ہوگیا۔[۲]

۱۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۶۵۔۶۶ مطبوعہ نجف

۲۔ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۱۵

یہ ضرور ہے کہ ایسا صرف اسی صورت میں ہوتا تھا کہ جب حاضرین میں سے کسی کو زیر بحث مسئلے کے بارے میں کتاب و سنت کا کوئی صریح حکم معلوم نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کے نام جو خط لکھا تھا اس کے ایک فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل سنت کی نظر میں کتاب و سنت کے بعد اجماع بھی اصول احکام میں سے ایک اصل ہے۔ اس مکتوب کو عامر شعبی نے خود شریح سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مجھے لکھا: ''جب تمہارے سامنے کوئی مسئلہ آئے تو اس کے بارے میں کتاب اللہ کے مطابق حکم دو۔ اگر مسئلہ ایسا ہو کہ جس کے بارے میں نہ کتاب اللہ میں حکم موجود ہو، نہ سنت رسولؐ میں اور نہ کسی اور کا کوئی قول موجود ہو تو خود اجتہاد کرو اور اسی کے مطابق عمل کرو۔''

جس اجماع کا بیج شیخین نے بویا تھا خضری اور ابن خلدون وغیرہ کے قول کے مطابق اس اجماع میں صحابہ کے زمانے کے بعد بہت کچھ تغیر ہوگیا۔ اس سلسلے میں امام مالک اور ان کے پیروکاروں اور مصر کے مشہور فقیہ لیث بن سعد اور ان کے پیروکاروں کے درمیان شدید اختلافات رونما ہوئے۔ اگرچہ دونوں ہی فریق اجماع کو حجت اور احکام کا مخرج تسلیم کرتے ہیں۔ امام مالک اور ان کے پیروکار صرف اہل مدینہ کے اجماع کے قائل ہیں۔ اس کے برعکس دوسروں کی رائے میں اہل مدینہ اور غیر اہل مدینہ میں اس معاملے میں کوئی امتیاز نہیں سب برابر ہیں۔

بہرحال اجماع کے طرفدار جو اسے حجت سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف کو جائز نہیں سمجھتے مندرجہ ذیل دو آیتوں سے استدلال کرتے ہیں:

ا۔ ''اور جو کوئی بعد اس کے کہ اس پر ہدایت کی راہ کھل گئی رسولؐ کی مخالفت کرے گا اور مؤمنوں کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرے گا تو ہم اُسے ایسا کرنے دیں گے جو کچھ وہ کرتا ہے، اور پھر ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔'' (سورۂ نساء: آیت ۱۱۴)

۲۔ ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت قرار دیا تا کہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسولؐ گواہ ہیں تم پر۔'' (سورۂ بقرہ: آیت ۱۴۳)

ابن مسعودؓ کی اس روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو وہ رسول اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ مسلمان کا دل ان میں خیانت نہیں کرتا۔ مسلمان خالص خدا کے لئے عمل کرتا ہے، دوسرے مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رہتا ہے۔'' اسی طرح حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرمؐ لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: ''یاد رکھو! جو شخص جنت میں رہنا چاہے وہ جماعت کے ساتھ رہے کیونکہ اکیلے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔ اگر دو ہوں تو شیطان ان سے دور رہتا ہے۔''

اسی طرح سنی محدث یہ روایت بھی رسول اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں:

''میری امت گمراہی پر متفق نہیں ہوگی۔ خدا کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے۔''

علاوہ ازیں امام مالک اپنی اس رائے کی کہ جس اجماع کی پیروی لازم ہے وہ اہل مدینہ کا اجماع ہے، یہ دلیل دیتے ہیں کہ مدینہ رسول اکرمؐ کی ہجرت کا مقام اور وحی الٰہی کے نزول کی جگہ ہے۔ وہیں اسلام کو استحکام حاصل ہوا اور اسلام کی حکومت قائم ہوئی۔ وہیں شریعت نبوی کو فروغ ہوا۔ مہاجرین و انصار صحابہ رسول اکرمؐ کے گرد جمع ہوئے، مدت تک آپ کی صحبت سے مستفیض ہوئے، انہوں نے قرآن مجید کے اسرار کو سمجھا، اس کا نزول بچشم خود دیکھا، اس کے سرچشمہ سے سیراب ہوئے اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا۔ مدینے کے لوگ رسول اکرمؐ کے حالات، آپ کے فیصلوں، شرعی احکام، فقہ اور اصول فقہ کے مسائل سے بہ نسبت باقی لوگوں کے زیادہ واقف ہیں۔

امام مالک اور ان کے ہم خیال ان مقدمات سے بزعم خویش یہ حتمی نتیجہ نکالتے ہیں کہ جو اہل مدینہ کا طریقہ ہو حق اس سے مختلف نہیں ہوسکتا اور جس بات پر اہل مدینہ کا اجماع ہوجائے وہ ایسی حجت شرعی ہے کہ اس کا انکار کرنا

یا اس کو نظر انداز کرنا جائز نہیں۔

استنباط احکام کا چوتھا اصول جسے اہل سنت کہیں رائے اور کہیں قیاس سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا بیج سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے بویا تھا۔

شیخ خضری لکھتے ہیں: ''صحابہ کرام کے سامنے اکثر ایسے مسائل پیش کئے جاتے تھے جن کے متعلق کتاب و سنت میں کوئی صریح حکم نہیں ہوتا تھا۔ اس حالت میں صحابہ قیاس سے کام لیتے تھے۔'' خضری نے اپنے اس نظریے کی تائید میں اس مکتوب کا اقتباس پیش کیا ہے جس میں حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو لکھا تھا: ''ہر چیز اور ہر واقعے کو اچھی طرح سمجھو اور معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرو۔''

ابن خلدون کی بھی یہی رائے ہے وہ کہتا ہے: ''اجماع اور قیاس صحابہ کرام کے زمانے میں وجود میں آئے اور ان دو کو ملا کر فقہ کے اصول چار ہو گئے۔''

ڈاکٹر محمد یوسف[1] لکھتے ہیں کہ امام ابوبکر سرخسی نے بیان کیا ہے کہ صحابہ، تابعین اور علمائے سلف قیاس کے جواز کے قائل رہے ہیں۔ اس لئے قیاس حجت ہے اور فقہ کے اصول میں سے ایک اصل ہے۔

ڈاکٹر موصوف کا اپنا رجحان یہ ہے کہ قیاس کی بنیاد خود جناب رسول اکرمؐ نے رکھی تھی اور وہ اس وقت کہ جب آپ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا تو اس وقت آپ نے ان سے پوچھا:

جب دو آدمی تمہارے سامنے کوئی تنازعہ فیصلے کے لئے لائیں تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟

حضرت معاذؓ نے جواب دیا: میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

رسول اکرمؐ نے پوچھا: لیکن اگر کتاب الٰہی میں اس مسئلے کے بارے میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو؟

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۲۴۲

معاذؓ نے جواب دیا: پھر میں سنت رسولؐ کے مطابق حکم دوں گا۔
رسول اکرمؐ نے پوچھا: اگر اس بارے میں سنت میں بھی کوئی حکم نہ ہو تو؟
معاذؓ نے جواب دیا: میں خود اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ کروں گا ضرور۔

اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذؓ کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسول کے نمائندے کو اس طریقے پر عمل کی توفیق بخشی جو رسولؐ کو پسند ہے۔

ڈاکٹر صاحب آگے چل کر ابن قیم کی کتاب اعلام الموقعین سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں محرز مدلجی کنانی نے قیاس سے کام لیا تھا اور قیاس ہی کی بناء پر اس نے اس کی تصدیق کی تھی کہ حضرت اسامہؓ اپنے باپ حضرت زید کے واقعی فرزند ہیں۔ رسول اکرمؐ نے اس کی اس بات کو پسند فرمایا اور آپ کا چہرہ شگفتہ ہو گیا تھا۔ اس معاملے میں شبہ اس بناء پر تھا کہ حضرت اسامہؓ کا رنگ سیاہ اور ان کے باپ حضرت زیدؓ کا رنگ گورا تھا۔ لیکن ان دونوں کے پاؤں کی مشابہت ان کے آپس کے تعلق کے لئے کافی سمجھی گئی اور رنگ کے اختلاف کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اسی طرح ابن قیم کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں حد قذف صرف ان لوگوں کے لئے آئی ہے جو پارسا عورتوں پر تہمت لگائیں۔ کلام پاک میں ہے:

''اور جو لوگ تہمت لگائیں پاک دامن عورتوں پر اور پھر چار گواہ نہ لا سکیں تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔'' (سورۂ نور: آیت ۴)

اس کے بعد سے صحابہ کرام نے پاک دامن مردوں پر بھی تہمت لگانے کو پاک دامن عورتوں پر تہمت پر قیاس کر لیا۔

ڈاکٹر محمد یوسف[1] نے یہ دو مثالیں اور بعض دوسری مثالیں ابن قیم سے نقل

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی ص ۲۴۔۲۵

کرنے کے بعد اپنے پسندیدہ مصنف مزنی کا یہ قول نقل کیا ہے:

فقہاء رسول اکرمؐ کے زمانے سے اب تک ہمیشہ فقہی احکام میں قیاس سے کام لیتے رہے ہیں اور فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ جو چیز حق کے مشابہ ہے وہ حق ہے اور جو باطل کے مشابہ ہے وہ باطل ہے۔

ابن حزم نے اپنی کتاب مُلَخَّصُ اِبْطَالِ الْقِيَاسِ وَالرَّأْيِ وَالْاِسْتِحْسَانِ[1] وَالتَّعْلِيْلِ وَالتَّقْلِيْدِ میں قرآن مجید سے کچھ اور ایسی مثالیں دی ہیں جن پر صحابہ وغیرہ نے قیاس پر عمل کیا ہے۔[2] ایک مثال یہ آیت قرآنی ہے:

''ماں باپ کو اُف تک نہ کہو۔'' (سورۂ اسراء: آیت ۲۳)

صحابہ کے مطابق اُف پر قیاس کر کے والدین کو ہر طرح کی تکلیف دینا منع ہے

ایک اور آیت ہے:

''تنگدستی کے خوف سے اپنے بچوں کو قتل مت کرو۔'' (سورۂ اسراء: آیت ۳۱)

تنگدستی کے علاوہ اور چیزوں کو بھی اسی پر قیاس کیا جاتا ہے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں سور کا گوشت حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس پر قیاس کیا گیا کہ سور کی چربی بھی حرام ہے۔ اسی طرح نر سور پر قیاس کر کے کہا گیا کہ سور کی مادہ بھی حرام ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اکرمؐ نے نماز کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو آگے بڑھایا تھا اس پر قیاس کر کے صحابہ کرام نے حضرت ابوبکرؓ کو

۱۔ استحسان کا مطلب یہ ہے کہ ملتی جلتی مثالوں کو پیش نظر رکھے بغیر وہ حکم دیا جائے جو ہمیں حق و انصاف سے زیادہ قریب معلوم ہو اور ہماری عقل اور ہمارے ذوق کے مطابق ہو۔ ایک اور ماخذ استصلاح ہے جس کا مطلب ایک مصلحت کو دوسری مصلحت پر ترجیح دینا ہے۔ ایک اور ماخذ تاؤل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نص کی موجودگی کے باوجود کسی آیت یا معتبر حدیث نبوی کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ بعض خاص صورتوں میں اپنے اجتہاد اور اپنی رائے کو ترجیح دیں۔ بحوالہ سخن ص ۱۳۹ مولفہ استاد شہید مرتضی مطہری

۲۔ مُلَخَّصُ اِبْطَالِ الْقِيَاس تحقیق سعید افغانی ص ۲۵ مطبوعہ مطبعۃ جامعۃ دمشق ۱۹۶۰ء

خلافت کے معاملے میں مقدم سمجھنے پر اجماع کرلیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کر کے منکرین زکوٰۃ کے خلاف قتال کیا۔

ابن حزم اندلسی نے کچھ اور بھی ایسی مثالیں دی ہیں جو قیاس کے طرفدار صحابہ وغیرہ سے منسوب کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس سب مواد کا استقصاء کیا جائے جو صحابہ اور تابعین کے زمانے میں قیاس سے متعلق روایات میں آیا ہے۔

ابن حزم ان لوگوں میں سے ہیں جو احکام وغیرہ میں قیاس پر عمل کرنے کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب و سنت میں سب کچھ موجود ہے اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی مسئلے کے بارے میں کوئی نص نہ ہو۔ اس لئے قیاس وغیرہ کی طرف رجوع کرنا جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔[1] وہ اپنی کتاب کے حاشیے پر لکھتے ہیں کہ امام بخاری کا مذہب بھی یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایسی چیز ہوسکتی ہے کہ اس کی شریعت، فقہ، آداب اور معاشرتی نظام میں ضرورت ہو اور وہ کتاب و سنت میں موجود نہ ہو۔''

بہرحال یہ مسلم ہے اور اس کے بارے میں کسی بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں کہ قیاس کا اصول عصر صحابہ میں پیدا ہوا۔ بعد میں اس اصول نے شہرت حاصل کرلی اور احناف وغیرہ میں اس پر بڑے پیمانے پر عمل ہونے لگا اور یہ بھی احکام کا مآخذ قرار پایا۔ رہی یہ بات کہ قیاس کا وجود رسول اکرمؐ کے زمانے میں بھی تھا تو جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی۔ حضرت معاذؓ والی حدیث جس میں کہا گیا ہے کہ ''جب کتاب و سنت میں کوئی نص موجود نہ ہوگی تو میں اپنی رائے پر عمل کروں گا'' معروف معنوں میں قیاس کے جواز پر دلالت نہیں کرتی بلکہ اس حدیث سے صرف حضرت معاذؓ کی اس کوشش کا اظہار ہوتا ہے کہ نص موجود نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مسئلے کا حل

۱۔ مُلَخَّصُ اِبْطَالِ الْقِیَاس تحقیق سعید افغانی ص ۵ مطبوعہ مطبعۃ جامعۃ دمشق ۱۹۶۰ء

نکالا جائے۔ ایسا کرنا ہر قاضی اور مفتی کا فرض ہے۔ جہاں یہ ضروری ہے کہ قاضی اور مفتی میں احکام تلاش کرنے کی ضروری استعداد موجود ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ قاضی اور مفتی اس کی پوری کوشش کریں کہ لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہونے پائیں اور حرام و حلال معلوم ہو جائے۔

ابن محرز مدلجی کا جو قصہ ابن قیم نے نقل کیا ہے اور جس میں راوی کے بقول رسول اکرمؐ کا چہرہ کھل اٹھا تھا، وہ محض صورت شکل میں مشابہت کی بات ہے۔ اس روایت میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو ابن قیم ایک عام شرعی قاعدہ قرار دیدیں۔ نہ رسول اکرمؐ نے یہ کوئی ایسا اصول وضع کیا ہے جو ہر بچے کے معاملے میں کام میں لایا جاسکے۔ رسول اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا ہے: اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ ''بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو۔ زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے سنگسار کر دیا جائے۔''

اس حکم پر رنگ یا پاؤں میں مشابہت کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے قیاس پر عمل کو رسول اکرمؐ کے زمانے سے منسوب کرنا ایک ایسی بات ہے کہ جس کی تائید نہ صحیح احادیث سے ہوتی ہے اور نہ ان واقعات سے جن سے اس عقیدے کے طرفداروں نے استدلال کیا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام اور تابعین کا اس پر اجماع بھی نہیں ہے کہ قیاس شرعی احکام کا مآخذ ہے۔ امام علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اگر ایسا ہوتا کہ دینی احکام کا مدار قیاس پر ہوتا تو بجائے خف (چرمی موزہ) کے اوپر مسح کرنے کی بجائے اس کے تلوے پر مسح کرنا زیادہ مناسب ہوتا۔''[۱]

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں: ''اگر تم دینی امور میں قیاس پر عمل کرو گے تو بہت سی ایسی چیزوں کو جن کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے حلال کر لو گے اور بہت سی ایسی چیزوں کو جن کو خدا نے حلال کیا ہے حرام قرار دے دو گے۔''[۲]

۱و۲ العدہ فی الاصول، شیخ طوسی

شعبی کہتے ہیں: ”جب تم سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو ایک بات کو دوسری پر قیاس مت کرو کیونکہ اس طرح اکثر حرام حلال ہوجائے گا اور حلال حرام۔ اگر تم روایات کو چھوڑ دوگے اور قیاس کو پکڑ لوگے تو تباہ ہو جاؤ گے۔“[1]

کسی زمانے میں بھی مسلمانوں کا حتیٰ کہ اہل سنت کا بھی اس پر اجماع نہیں ہوا کہ قیاس احکام کا ماخذ ہے۔ ابراہیم نظام اور ان کے معتزلی پیروکاروں[2] داؤد بن علی اصفہانی ظاہری متوفی ٢٧٠ھ، جعفر بن حرب، جعفر بن میشہ، محمد بن عبد اللہ اسکافی[3] وغیرہ نے قیاس پر عمل کرنے کی مخالفت کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے قیاس پر عمل کو غلط ثابت کرنے کیلئے دلائل پیش کئے ہیں اور اس بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ امام شافعی نے الرسالۃ میں منکرین قیاس کے دلائل کو رد کرنے کے بعد لکھا ہے کہ قیاس شرعی احکام کے استنباط کا ایک اطمینان بخش ذریعہ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں فقہ جعفری کے اصول پر بحث کے دوران ہم پھر قیاس کے اصول پر گفتگو کریں گے۔ فی الحال ہمارا مقصد قیاس پر عمل کی تاریخ بیان کرنا اور یہ بتلانا تھا کہ اس کی ابتداء عصر صحابہ میں ہوئی۔ اس وقت سے قیاس کو شامل کر کے اصول احکام کی تعداد چار ہوگئی جو اب تک چلی آرہی ہے۔ احناف نے خاص کر قیاس پر عمل کرنے میں شہرت حاصل کی ہے۔

ہم نے گزشتہ ابواب میں ثابت کیا ہے کہ احکام شریعت اور فقہ میں شیعوں کا حصہ دوسروں سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ بلکہ شیعہ صحابہ نے اس سلسلے میں جو کام انجام دیا ہے اگر ہم اس پر امام علی علیہ السلام کے احکام اور حلال و حرام کے بیان میں کوشش اور خدمات کا اضافہ کریں تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ تشیع ہی وہ قوی ترین بنیاد تھی جس پر صحابہ کے دور میں فقہ کی تعمیر ہوئی۔ ہمیں اس بارے میں کسی جانبداری یا تعصب سے کام لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔

١۔ العدہ فی الاصول، شیخ طوسی

٢و٣۔ تاریخ الفقہ الاسلامی ص ٢٤٧

شیعہ علماء نے جو فتوے دیئے ہیں ان کی مثالوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ابتدائے اسلام سے آخری دور تک شیعوں کے نزدیک فقہ کا سرچشمہ کتاب و سنت ہی رہے ہیں۔ جو کتاب مسلمانوں میں رسول اکرمؐ کے زمانے سے آج تک رائج رہی ہے یہ وہی کتاب ہے جو سرکار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اس میں کسی طرح کی تحریف اور تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ نہ کسی طرف سے اس میں باطل نے راہ پائی۔ یہی کتاب الٰہی مسلمانوں کے نزدیک اسلامی احکام کا پہلا سرچشمہ ہے۔

شرعی احکام کے بارے میں جو آیات ہیں خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو، معاملات سے ہو، فرائض سے ہو یا قانون فوجداری سے ہو، ان آیات کی مجموعی تعداد تقریباً پانچ سو ہے۔ بعض شیعہ بزرگوں نے جن میں الجزائری، مقدادی وغیرہ شامل ہیں، ان آیات کو مختلف فقہی ابواب کے تحت جمع کیا ہے اور ہر ایک کی شان نزول بیان کی ہے۔[1]

ایک بات جس میں کوئی شک نہیں وہ یہ ہے کہ شرعی احکام سے متعلق آیات تمام انسانی ضرورتوں کی تکمیل نہیں کرتیں اور سب پیش آنے والے واقعات پر حاوی نہیں ہیں کیونکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی نئی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں اور زندگی کے مسائل میں توسیع ہوتی رہتی ہے۔ بے شمار نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ قرآنی آیات میں بیشتر اصول اور عام قاعدے بیان کردیئے گئے ہیں لیکن پھر بھی مسائل کی حدود، عام و خاص، اطلاق، تقیید، اجمال و تفصیل وغیرہ کا بیان چھوڑ دیا گیا ہے۔ آیات سے مسائل استنباط کرتے وقت ان سب امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اسی لئے سنت کی طرف رجوع کرنا لازمی ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ

۱۔ کنز العرفان فی فقہ القرآن مؤلفہ مقدادی اور قلائد الدرر فی بیان آیات الاحکام بالاثر مؤلفہ جزائری

ہے کہ سنت کی شدید ضرورت ہے تاکہ جو باتیں قرآن میں مختصر اور مجمل طور پر بیان کی گئی ہیں ان کی وضاحت ہوجائے۔ مشکل مقامات حل ہوجائیں اور یہ صاف ہوجائے کہ کیا واجب ہے اور کیا حرام۔ قرآن مجید اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اور ہم نے آپ پر یہ ذکر اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں سے بیان کردیں جو اُن کے پاس بھیجا گیا ہے تاکہ وہ غور کریں۔'' (سورۂ نحل: آیت ۴۴)

معلوم ہوا کہ سنت سے ہی کتاب کی تکمیل ہوتی ہے اور کتاب وسنت دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ''وہ (رسول اللہؐ) اپنی خواہش نفسانی سے باتیں نہیں بناتے۔ ان کا کلام تو تمام تر وحی ہی ہے۔'' (سورۂ نجم: آیت ۴)

فقہاء اور محدثین کی اصطلاح میں سنت سے مراد وہ کچھ ہے جو معصوم یعنی نبی یا امام سے صادر ہو۔ اس میں معصوم کا ایسا قول، فعل اور تقریر یعنی اجازت اور منظوری شامل ہے جس کا تعلق کسی شرعی حکم کے بیان سے ہو۔ اس بارے میں شیعوں میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس معنی میں سنت احکام کی بنیاد اور احکام کے استنباط کا ایک ذریعہ ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جس طرح کتاب اللہ پر عمل ضروری ہے اسی طرح سنت پر بھی عمل لازمی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ حسب ذیل دو آیتوں کا منشا یہی ہے: ''جو کچھ رسول تمہیں دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں رک جاؤ۔''

(سورۂ حشر: آیت ۷)

''یہ بات نہیں، آپ کے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اس جھگڑے میں جو اُن کے درمیان ہو آپ سے فیصلہ نہ کرائیں اور پھر جو فیصلہ آپ کردیں اس پر اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں اور اس فیصلے کو دل سے تسلیم کرلیں۔'' (سورۂ نساء: آیت ۶۵)

عصر صحابہ میں اور اس کے بعد بھی شیعہ ان ہی دو مآخذوں یعنی کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں۔ قبلاً ہم نے امام علی علیہ السلام اور بعض دوسرے

صحابہ کی جو فقہی آراء پیش کی ہیں ان سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ جن صورتوں میں غیر شیعہ رائے، اجماع اور استحسان کی پناہ لیتے ہیں، شیعہ فقط ان ہی دو مآخذوں کی طرف رجوع کرتے اور ان ہی پر اپنی فقہی آراء کی بنیاد رکھتے ہیں۔ شیعوں کا نقطہ نظر متعہ، پاؤں کے مسح، تعصیب، ایک لفظ سے تین طلاقوں وغیرہ کے بارے میں اور ان کا دوسرے صحابہ سے اختلاف اسی مضمون پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ اختلافات صحابہ کے زمانے سے شروع ہو کر اب تک باقی ہیں۔

رہا اجماع خواہ اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت کسی مسئلے پر متفق ہو جائے جیسا کہ شیخ خضری کہتے ہیں یا اس سے مراد اہل مدینہ کی رائے لی جائے کیونکہ مدینہ ہی میں وحی نازل ہوتی تھی، وہاں کے باشندوں نے عرصۂ دراز تک رسول اکرمؐ کے ساتھ زندگی گزاری تھی اور وہ قرآن مجید کا صحیح مطلب سمجھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے، جیسا کہ مالک اور ان کے متبعین کا خیال ہے، یا اجماع سے اہل مدینہ کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کی رائے مراد لی جائے، جیسا کہ مصری فقیہ لیث بن سعد کا قول ہے، بہرحال ان میں سے کوئی بھی نظریہ شیعوں کے نزدیک قابل قبول نہیں اور وہ اجماع کو حجت نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک فقہاء کی رائے خواہ ان کی تعداد کم ہو یا زیادہ کسی حکم کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ ظنی علم حاصل ہو سکتا ہے اور ظن و گمان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”بے شک گمان حق کو ثابت کرنے میں ذرا بھی کام نہیں دیتا۔“ (سورۂ یونس: آیت ۳۶)

جو آثار و احادیث اجماع کے طرفدار بیان کرتے ہیں نہ ان میں کوئی ایسی بات ہے اور نہ قرآن مجید کی کوئی ایسی آیت ہے جس کو اس بات کی دلیل ٹھہرایا جا سکے کہ کسی چھوٹی یا بڑی جماعت کے قول سے جو ظنی علم حاصل ہو اس پر کسی معاملے میں اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

شیعہ فقہاء و محدثین میں اجماع کی اصطلاح عصر صحابہ کے بعد بلکہ تبع تابعین

اور شیعہ اماموں کے زمانے کے بھی بعد آئی اور اس سے مراد یہ لی گئی کہ کسی حکم پر تمام علماء کا اتفاق ہو بشرطیکہ اس اتفاق میں امام کی رائے بھی شامل ہو۔ اس لحاظ سے اجماع کو بھی احکام کا ایک ماخذ تو تسلیم کرلیا گیا مگر صرف اسی صورت میں جبکہ اجماع کرنے والوں کے ساتھ امام بھی ہو۔ اب چاہے اجماع کنندگان کی جماعت کم ہو یا زیادہ اس سے کوئی بحث نہیں۔ اس طرح کے اجماع کا فائدہ شیعہ فقہاء و محدثین کی نظر میں یہ ہے کہ اس سے امام کی رائے معلوم ہوجاتی ہے۔ جب کسی حکم پر علماء میں اتفاق ہوجائے مگر امام کا کوئی معین قول اس حکم کے بارے میں موجود نہ ہو تو اس اتفاق سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان علماء کی نظر میں اس مسئلے میں امام کی رائے کیا ہے۔ فقہ کی کتابوں میں اس طرح کے اجماع سے متعدد جگہ استدلال کیا گیا ہے۔ شیعہ اجماع پر صرف اسی صورت میں عمل کرتے ہیں جبکہ وہ کاشف سنت ہو۔ اس لحاظ سے اجماع بھی سنت ہی ہے صرف لفظی تعبیر کا فرق ہے۔

بہرحال شیعوں نے اپنی تاریخ کے آغاز سے جو اسلام کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہی چلتی ہے، احکام معلوم کرنے کے لئے کتاب وسنت کے علاوہ کسی دوسرے سرچشمے کی طرف کبھی رجوع نہیں کیا اور نہ اجماع کو کبھی کوئی دلیل سمجھا سوائے اس صورت کے کہ جب اس سے معصوم کی رائے پر روشنی پڑتی ہو۔ معصوم تو ہر زمانے میں موجود ہوتا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اجماع سے امام معصوم کی رائے کا انکشاف کیسے اور کیوں کر ہوتا ہے۔

قیاس جس کے متعلق اہل سنت کا دعویٰ ہے کہ صحابہ کرام کے زمانے ہی سے اصول احکام میں سے ایک اصل اور احکام کا مآخذ ہے اس کی تعریف دوالیبی نے اپنی کتاب اَلْمَدْخَلَ اِلیٰ عِلْمِ اُصُوْلِ الْفِقْه میں یوں کی ہے:

"قیاس کے معنی ہیں شرعی حکم میں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانا جبکہ ان دونوں چیزوں میں کوئی واحد علت مشترک ہو، چاہے یہ علت صراحت کے ساتھ کسی شرعی دلیل میں آئی ہو یا نہ آئی ہو۔"

دوسروں نے قیاس کی یہ تعریف کی ہے:

''قیاس کا مطلب ہے کہ کسی ایسی چیز کے متعلق جس کے بارے میں نص موجود نہیں علت سے مشترک ہونے یا دونوں میں مشابہت موجود ہونے کے سبب ویسا ہی حکم بیان کرنا جیسا کہ دوسری چیز کا ہے جس کے بارے میں نص یا اجماع موجود ہو۔''[1]

قیاس کے معنی کچھ بھی ہوں، شیعہ اسے بدعت سمجھتے ہیں اور احکام وغیرہ میں قیاس پر عمل نہیں کرتے۔ قیاس کا بدعت ہونا ان کے مذہب میں مشہور ہے۔ امام علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اگر دین میں قیاس کی گنجائش ہوتی تو موزے کے تلوے پر مسح بہ نسبت اس کے اوپر والے حصے کے زیادہ موزوں ہوتا۔''

شیعہ فقہاء کے جو فتوے صحابہ کرام کے زمانے کے منقول ہیں ان میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ یہ فقہاء قیاس پر اعتماد کرتے تھے۔ شیعہ ائمہ سے متواتر احادیث آئی ہیں جن میں قیاس پر عمل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے امام ابوحنیفہؒ سے ایک دفعہ کہا:

''خدا سے ڈرو اور اپنی رائے سے قیاس مت کرو۔ کل ہم اور ہمارے مخالفین خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ہم کہیں گے کہ رسول اکرمؐ اور خدا نے یوں کہا۔ تم اور تمہارے ساتھی کہیں گے کہ ہماری رائے یہ تھی اور ہم نے ایسا قیاس کیا۔ پھر خدا ہمارے اور تمہارے ساتھ جو چاہے گا سلوک کرے گا۔''[2]

۱۔ مُلَخَّصُ اِبْطَالِ القِیَاس تحقیق سعید افغانی ص ۵ مطبوعہ مطبعة جامعة دمشق ۱۹۶۰ء

۲۔ امام ابو حنیفہؒ سے پوچھا گیا کہ جب آپ کا فتویٰ قرآن کے خلاف ہوتا ہے تو ہم کیا کریں۔ انہوں نے فرمایا: میرے فتویٰ کو چھوڑ کر قرآن پر عمل کرو۔ پوچھا گیا کہ آپ کا فتویٰ صحابہ کے خلاف ہو تو؟ انہوں نے فرمایا: تم پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب کی باتوں پر عمل کرو مگر ان تین کے سوا (۱) ابوہریرہ (۲) انس بن مالک (۳) سمرۃ بن جندب سفینتہ البحار ص ۲۱۲ از محدث شیخ عباس قمی

ہم اس سے پہلے بیان کرتے آئے ہیں کہ قیاس کو اصول احکام میں سمجھنے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ شارع نے مشابہ مسائل میں ایک ہی طرح کا حکم دیا ہے اور جن مسائل میں مشابہت نہیں ہے ان میں حکم میں بھی تفاوت ہے حالانکہ اگر اسلامی احکام کا جائزہ لیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ کبھی ایسے مسائل میں جن میں باہمی مشابہت ہے مختلف حکم بھی دیئے گئے ہیں اور کبھی ایسے مسائل میں جن میں کوئی مشابہت نہیں ایک ہی حکم دیا گیا ہے۔

البتہ جہاں حکم کے ساتھ اس کی علت بھی بیان کردی گئی ہو ایسی صورت میں جہاں بھی وہ علت پائی جائے وہی حکم جاری ہوگا۔ جیسا کہ مثلاً شراب کی حرمت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اس وجہ سے حرام ہے کہ نشہ کرتی ہے۔ اب شراب کی حرمت کی وجہ اس کا نشہ کرنا ہے خواہ اس کی کوئی منطقی دلیل نہ ہو۔ اس صورت میں جہاں بھی وہ علت پائی جائے گی وہی حکم جاری ہوگا یعنی جو چیز بھی نشہ کرے گی وہ حرام ہوگی کیونکہ حرمت کے حکم کی وجہ یہی علت ہے۔ اور جہاں یہ علت ہوگی وہاں قطعاً وہ حکم بھی ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ''نشہ آور چائے'' ہو تو وہ بھی حرام ہوگی۔ یہ قیاس کی بات نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں چائے بھی ان چیزوں میں شامل ہوگی جن کو حرام کیا گیا ہے۔

باب چہارم

تابعین کے زمانے میں سیاسی صورتحال

ہم نے پچھلے ابواب میں بیان کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد شروع شروع میں اسلامی فقہ کا دارو مدار کتاب وسنت پر تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں دو اور مآخذ اجماع اور قیاس وجود میں آ گئے۔ کتاب وسنت میں کوئی نص موجود نہ ہونے کی صورت میں زیادہ تر مسلمان اجماع سے کام لیتے تھے مگر بعض فقہائے صحابہ قیاس کو کام میں لاتے تھے۔ بعد کے دور میں خصوصاً ائمہ اربعہ[1] کے زمانے میں قیاس کا رواج بڑھ گیا۔

۱۔ ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن نعمان زوطی متولد ۸۰ھ کوفہ — متوفی ۱۵۰ھ بغداد
۲۔ ابوعبداللہ مالک بن انس بن مالک اصبحی متولد ۹۳ھ مدینہ — متوفی ۱۷۹ھ مدینہ
۳۔ محمد بن ادریس بن عباس بن شافع مُطلبی متولد ۱۵۰ھ غزہ — متوفی ۱۹۸ھ مصر
۴۔ احمد بن محمد بن حنبل ذہلی شیبانی مروزی متولد ۱۶۴ھ بغداد — متوفی ۲۴۱ھ بغداد

مقریزی نے خطط میں لکھا ہے کہ ۶۶۵ھ میں سلطان ظاہر بیبرس بند قداری نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے تقلید کو ان چار ائمہ فقہ تک محدود کر دیا۔

اسی طرح مسلمانوں کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو صحاح ستہ بالخصوص بخاری اور مسلم کی تقلید کا پابند کرلیا اور حدیث کے بارے میں ہر قسم کی بحث کا دروازہ بند کر کے اپنے لئے علم کا دروازہ بند کر دیا۔ یہ ایسے ہی ہوا جیسے چار اماموں میں سے کسی ایک کی تقلید پر مجبور کر کے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ امام علیؑ اور عصر صحابہ کے شیعہ فقہاء کتاب و سنت کے سوا اور کسی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ اس بنیاد پر انہوں نے جو فتوے دیئے تھے ہم نے ان کی کچھ مثالیں بھی دی تھیں۔ فقہ اور تدوین احکام و حدیث میں ان کے کارنامے بیان کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ وقت کی سیاست ان کے خلاف ہونے کے باوجود ان کا شمار اس دور کے بڑے فقہاء میں تھا۔ اگر سیاست وقت حائل نہ ہوتی تو کوئی بھی ان کا مقابلہ نہ کرسکتا کیونکہ یہ رسول اکرمؐ سے سب سے زیادہ نزدیک تھے۔ ان کے فضائل میں جو صحیح احادیث آئی ہیں وہ کسی اور کے بارے میں نہیں آئیں۔

اب جبکہ ہم صحابہ کرام کے دور میں تشریع کے تمام پہلوؤں سے بحث کرچکے ہیں تو ضروری ہے کہ اس زمانے کے حالات اور مسائل پر بھی کچھ روشنی ڈالیں۔ اس زمانے کی مجموعی حالت کے بارے میں ہم پہلے بھی اشارے کرچکے ہیں۔ اصل بحث اسلامی فقہ کی ہے جو صحابہ سے تابعین اور تبع تابعین تک پہنچا اور ان ہی کی آراء اور فقہی احکام کی بنیاد پر اس کے اصول و قواعد منضبط ہوئے۔

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مختصر طور پر اس زمانے کی سیاسی صورت حال اور اس حکمت عملی پر نظر ڈالیں جو اموی سلاطین نے برسر اقتدار آنے کے بعد اختیار کی تاکہ ہم ان نتائج کا جائزہ لے سکیں جو اسلام اور اسلامی معاشرے پر بنی امیہ کی اس غلط اور ظالمانہ سیاست سے مرتب ہوئے جو انہوں نے اپنی حکومت اور تخت سلطنت کو باقی رکھنے کے لئے شروع کی تھی۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی حکومت کے اس طریقے پر نظر ڈالی جائے جس کے مسلمان عادی ہوگئے تھے اور جو طریقہ انہوں نے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال میں محسوس کیا تھا اور جو طریقہ آپ کے برحق جانشینوں کا تھا۔

بنی امیہ نے شروع ہی سے سخت گیری، مکر و فریب، دولت لٹانے اور خون بہانے کی سیاست اختیار کی۔ انہوں نے لوگوں کو گمراہ کرنے اور اسلام کی غلط تعبیر

پیش کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو وضعی اور جعلی حدیثیں گھڑنے کے کام پر مامور کیا تاکہ لوگوں کی نظر میں اپنی حکومت کو جائز اور شرعی حکومت ثابت کرسکیں۔ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے اہم ترین مسئلہ تھا کیونکہ خلافت کا خود نبوت سے قریبی تعلق ہے اور یہ نبوت ہی سے اکتساب فیض کرتی ہے تاکہ ہر میدان میں امت کی ضروری اصلاح کا کام انجام دے سکے۔

بنی امیہ ہر جگہ شیعوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں امام علیؑ کا فقہ ایک ایسا گناہ تھا کہ جو کوئی ان مسائل کو بیان کرتا، سزائے موت، قید اور جلاوطنی اس کے انتظار میں رہتی تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ فقہی احکام کے بارے میں امام علیؑ کی رائے بیان کرسکے یا کوئی حدیث نبوی آپ کے یا آپ کے بیٹوں یا آپ کے متبع بزرگ صحابہ کے فضائل میں نقل کرسکے۔ نہ کسی کی یہ مجال تھی کہ ان دنیا طلب لوگوں کے خلاف اٹھ سکے جو بنی امیہ اور ان کے پیروکاروں کی تعریف میں حدیثیں گھڑ رہے تھے۔

ابھی اہلبیتؑ اور باقی ماندہ بزرگ اور صالح صحابہ رسولؐ تاریک مستقبل کا احساس کر ہی رہے تھے کہ عبدالرحمٰن ابن ملجم مرادی خارجی کے ہاتھ سے اسلام پر ایک کاری وار لگا۔ اس ضربت میں خوارج [۱] کے ایک گروہ کا مشورہ شامل تھا اور ایک دوسرے گروہ کی اسے تائید وحمایت حاصل تھی۔

یہ پہلا خونچکاں حادثہ تھا جو ایک خاص صورت میں عراق اور دوسرے اسلامی ممالک کے شیعوں کو پیش آیا۔ اس کی تلخی ہر مسلمان نے جو امویوں کا زرخرید نہیں تھا

۱۔ ڈاکٹر عمرو خلیفہ النامی اپنی کتاب العبادیہ میں لکھتے ہیں کہ خوارج ایک تابعی عبد اللہ بن عباد المرّی التمیمی کی نسبت سے خود کو عبادی مسلم کہتے ہیں۔ خوارج کی ایک قابل ذکر تعداد مشرقی افریقہ میں زنجبار اور شمالی افریقہ میں لیبیا، تیونس اور الجزائر میں آباد ہے۔ یہ سلطنت ادمان کا سرکاری مذہب ہے۔ World Factbook کے مطابق ادمان کی 75% آبادی خوارج پر اور باقی 25% آبادی شیعوں، سنیوں اور ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ شیعوں کے نزدیک خوارج نجس ہیں۔

محسوس کی۔ اس کے بعد ناامیدی، افسوس، خوف اور بنی امیہ کے غلبے کا احساس تمام اسلامی ممالک کے مسلمانوں میں عام ہوگیا۔

اس حادثے کے بعد امیر معاویہ نے بڑی تیزی سے کارروائی شروع کی اور ان تمام شہروں اور علاقوں میں جو اس وقت تک ان کی قلمرو میں نہیں تھے کھلم کھلا اور خفیہ طور پر اپنے آدمی پھیلا دیئے۔

امام علیؑ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے امام حسنؑ سے بیعت کرلی۔ یہ بیعت تمام شہروں، دیہاتوں، صحراؤں اور عرب و غیر عرب قبیلوں میں انجام پائی اور امام حسنؑ نے حکومت کی سب ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ لشکر کے سردار اور کمانڈر مقرر کیے۔ مسلمانوں کے خزانے میں جو مال تھا وہ ہر ایک کو اس کے حصے کے مطابق تقسیم کردیا۔ لشکریوں کی تنخواہیں دگنی کردیں۔

ابھی امام حسنؑ کی خلافت کے تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کے حامیوں (لشکر کے افسروں اور قبائلی سرداروں) نے ان سے کہا کہ صفین کی طرف کوچ کریں اور جو منصوبہ ان کے والد نے اپنی شہادت سے قبل بنایا تھا اور جس پر وہ عمل کرنا چاہتے تھے عملی جامہ پہنائیں۔ امام حسنؑ کے سامنے بھی اس منصوبے پر عمل کرنے کے سوا کوئی صورت نہیں تھی۔ سب لوگوں کی دلچسپی نے انہیں اس منصوبے پر عمل کرنے پر آمادہ کرلیا۔

چنانچہ امام حسنؑ ایک ایسا بھاری لشکر لے کر جس میں ستر ہزار سے کم جنگجو نہیں تھے کوفے سے جنگ کے لئے روانہ ہوگئے۔ امام حسنؑ نے اپنے چچازاد بھائی عبیداللہ بن عباس کو لشکر کے ایک دستے کی کمان دے کر معاویہ سے مقابلے کے لئے بھیجا اور عبیداللہ کو ہدایت کی کہ وہ دریائے فرات عبور کر کے مسکن نامی گاؤں کے نزدیک اپنا کیمپ لگائیں اور وہاں سے معاویہ کو عراق کی سرحد میں داخل ہونے سے روکیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ لڑائی اس وقت تک شروع نہ کریں جب تک معاویہ کے لشکر کی طرف سے پہل نہ ہو۔ امام حسنؑ نے عبیداللہ کے ساتھ اپنے شیعوں میں سے

دو قابل اعتماد اور وفادار افسر بھی بھیجے تا کہ وہ حسب موقع مناسب کارروائی میں مدد دے سکیں۔ امام حسنؑ خود مدائن میں اس غرض سے ٹھہر گئے کہ دشمن سے جنگ کے لئے کافی لشکر اکٹھا کرلیں۔

جب امام حسنؑ کو معاویہ کی چال کا احساس ہوا اور انہوں نے اپنے لشکریوں میں معاویہ کے آدمیوں کی آمد ورفت دیکھی اور انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ لشکر کے کچھ سردار معاویہ کے وعدوں کے فریب میں آکر منحرف ہوگئے ہیں تو انہوں نے معاویہ کی چال کا توڑ کرنے کے لئے اپنے لشکریوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے تقریر کی۔ انہوں نے کہا: ”ایسی دوستی سے جس میں انتشار بھرا ہوا ہو جدائی بہتر ہے۔ میں نے تمہارے لئے ایک بات سوچی ہے جو خود تمہاری رائے سے بہتر ہے۔ لہٰذا میری حکم عدولی مت کرو۔“

اس دور میں ان پر کفر کا الزام لگایا گیا۔ کچھ لوگوں نے ان کا سامان لوٹ لیا اور چادر کھینچ لی۔ جراح بن سنان اسدی نے نیزہ مارا جو امام کی ران پر لگا۔ اب امام کو یقین ہوگیا کہ لشکر ان کا مطیع نہیں ہے۔

معاویہ نے امام کی اس تقریر سے بھی جو انہوں نے اپنے پیروکاروں کے دل کا بھید معلوم کرنے کے لئے کی تھی اسی طرح فائدہ اٹھایا جس طرح امام کے لشکر میں انتشار سے فائدہ اٹھایا تھا۔ کوشش یہ تھی کہ بغیر لڑے چالبازی اور روپے کے زور سے کشمکش کو ختم کر کے کامیابی حاصل کرلی جائے۔ چنانچہ معاویہ نے امام حسنؑ کے لشکر کے کمانڈر عبیداللہ بن عباس کے نام خط بھیجا اور لکھا کہ اگر تم میری اطاعت کرلو تو تمہیں حسن سلوک اور انعام واکرام سے نوازوں گا۔ عبید اللہ ابن عباس نے فوراً یہ بات مان لی اور راتوں رات معاویہ کی اطاعت قبول کرلی۔

اب قیس بن سعد بن عبادہ انصاری نے جو سرحدوں کی حفاظت پر مامور تھے، امام کے لشکر کی کمان سنبھالی۔ انہوں نے اور ان کے لشکریوں نے بڑی پامردی سے جنگ کی۔ جب تمام وسائل کی فراوانی کے باوجود ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے میں

معاویہ کو مایوسی ہوئی تو معاویہ نے کچھ لوگوں کو امام حسنؑ کے پاس صلح کی شرائط سے متعلق بات چیت کے لئے بھیجا۔

امام حسنؑ عراقیوں کی کم ہمتی محسوس کر چکے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے لشکر کے سردار اور کمانڈر معاویہ سے مل گئے ہیں اور انہوں نے معاویہ کو یقین دلایا ہے کہ وہ امام کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس لئے کچھ گفتگو کے بعد انہوں نے صلح پر اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔[1]

امام حسنؑ کو حالات کا پورا علم تھا۔ انہیں سب خبریں مل رہی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے لشکر والوں سے نہ کسی نیکی کی توقع کی جا سکتی ہے اور نہ وہ کسی برائی سے باز رہیں گے۔ ماضی میں ان ہی لوگوں نے ان کے والد کو طرح طرح سے پریشان کیا تھا۔ انہوں نے بارہا اپنے والد علی علیہ السلام کو کوفہ کے منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ ''کاش! میں قتل ہو جاؤں یا مجھے موت آ جائے تاکہ میں ان لوگوں سے چھٹکارا پا سکوں۔''

جو شخص امام حسنؑ کی ششماہی خلافت کا جائزہ لے گا اور اس دوران میں امام کو جو مشکلات پیش آئیں ان کا مطالعہ کرے گا وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ معاویہ سے صلح ناگزیر ہو گئی تھی۔ بعض مستشرقین جنہوں نے اسلامی تاریخ کے اس حساس دور کی مشکلات اور ان قبائلی تعصبات کو سمجھا ہے جن کا امام حسنؑ کو سامنا تھا وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عمومی مصلحت اور عقل کا تقاضا وہی تھا جو امام نے کیا۔[2]

The Spirit of Islam[3] کے مصنف سید امیر علی نے بھی اپنی مشہور کتاب A Short History of the Saracens (مختصر تاریخ عرب) میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور یہی نظریہ قبول کیا ہے۔ لیکن اکثر مستشرقین امام حسنؑ اور معاویہ

۱۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید

۲۔ روبلڈسن کی کتاب کا عربی ترجمہ عقیدۃ الشیعہ فی ایران والعراق دیکھئے

۳۔ روح اسلام مؤلفہ سید امیر علی مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

کے درمیان کشمکش کو دو سیاستدانوں کی جنگ سمجھتے ہیں جس میں اپنے سیاسی اور شخصی مقاصد کے حصول کے لئے ہر ممکن طریقہ استعمال کیا جاتا ہے اور ہر طرح کے مکرو فریب کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے وہ امام حسنؑ پر کم ہمتی کا الزام لگاتے ہیں اور ان کو اپنے والد امام علی علیہ السلام کا صحیح جانشین تصور نہیں کرتے۔ بروکلمین(Brockelmann) سائمن اوکلے (Simon Ockley) سائکس(Sykes) اور ولہوزن (Wellhausen) کا یہی خیال ہے۔[1]

ان لوگوں کی غلط فہمی یہ ہے کہ یہ امام حسنؑ کو معاویہ کا مدمقابل اس لحاظ سے سمجھتے ہیں کہ دونوں کا مقصد اقتدار حاصل کرنا اور جس طرح بھی ہوسکے اپنی حکومت کو مستحکم کرنا تھا۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ امام حسن علیہ السلام تو خلافت کو احقاق حق، مظلوموں کی دادرسی اور عدل و سلامتی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ قرآن مجید اور اسلام کا خلافت کا یہی تصور ہے۔ اسی لئے کوئی امام خلافت کے حصول کے لئے حیلہ گری، دروغ گوئی اور فریب کاری کو روا نہیں رکھ سکتا۔ امام علی علیہ السلام اور ان کے فرزندوں کے زاویۂ نگاہ سے خلیفہ کو حامی قرآن، نگہبان شریعت اور لوگوں کے حقوق اور ان کی جان و مال کا محافظ ہونا چاہئے تھا۔ مگر امیر معاویہ کا نقطۂ نگاہ کچھ اور تھا۔

Sir Percy Sykes امام علی علیہ السلام کے امانت و شرافت پر اصرار کو عیب قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ دو خصلتیں سیاست کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔[2]

اہل عراق کا برتاؤ امام حسن علیہ السلام کے ساتھ اس قدر خراب ہوگیا تھا کہ ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا کہ خلافت معاویہ کے سپرد کر کے ایسے معاہدے پر دستخط کردیں جس میں ایسی شرائط شامل ہوں جن سے ان کا، ان کے خاندان کا اور ان کے والد کے پیروکاروں کا حق محفوظ ہوجائے۔

معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کے پاس ایک کورا کاغذ اپنی مہر لگا کر بھیج دیا اور کہا کہ آپ جو شرائط بھی لکھ دیں وہ سب منظور ہیں۔ امام حسن علیہ السلام نے شرط

۱و۲۔ العراق فی ظل العهد الأموی ص۴۷

کی کہ معاویہ کے بعد خلافت ان کی ہوگی۔ کوفہ کے بیت المال میں جو کچھ موجود ہے وہ ان کا ہوگا۔ اہواز کا سالانہ خراج بھی انہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کے والد امام علیؑ کو منبروں پر برا بھلا نہیں کہا جائے گا۔ یہ بھی شرط تھی کہ ہر سال دس لاکھ درہم ان کے بھائی امام حسینؑ کو ادا کئے جائیں گے اور بخشش میں بنی ہاشم کو بنی امیہ پر ترجیح دی جائے گی۔ اہل عراق کو امان دی جائے گی اور ان کی لغزشیں معاف کردی جائیں گی۔[1]

اس صلح سے معاویہ کی سیاسی آرزوئیں پوری ہوگئیں اور انہیں وہ چیز مل گئی جس کا وہ مدت سے خواب دیکھ رہے تھے۔ معاویہ کو مسلمانوں کے تمام امور پر تسلط حاصل ہوگیا۔ کوفہ میں داخل ہونے سے پہلے معاویہ نے نخیلہ کی فوجی چھاؤنی پر پڑاؤ کیا۔ اس چھاؤنی پر فوجیں تازہ دم ہوکر اگلے محاذوں کے لئے روانہ ہوتی تھیں کیونکہ یہ ایک دوراہے پر واقع تھی۔ یہاں معاویہ نے نماز جمعہ ادا کی اور اہل عراق سے اور اپنی شامی فوج سے خطاب کیا۔ اور اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا جو اہل عراق، علویوں اور ان کے شیعوں کے خلاف تھا۔ اپنے خطاب میں معاویہ نے عراق کے لئے نیا سیاسی منظر نامہ پیش کیا۔ اعمش بیان کرتے ہیں کہ معاویہ نے نخیلہ میں ہمارے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی اور نماز کے بعد خطاب کرتے ہوئے کہا:

"بخدا میں تمہارے ساتھ نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، حج کرنے اور زکوٰۃ دینے کے لئے نہیں لڑ رہا تھا کیونکہ یہ سب تو تم بجا لاتے ہو۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تو تم پر حکومت کرنے کے لئے لڑ رہا تھا اور یہ اختیار خدا نے مجھے دیا ہے جسے تم لوگ پسند نہیں کرتے۔ جان لو کہ جو بھی شرائط میں نے حسنؑ بن علیؑ کے ساتھ معاہدہ صلح میں مان لی تھیں اُن کو میں اپنے قدموں تلے روندتا ہوں۔ میں ان میں سے کسی بھی شرط کو پورا کرنے کا پابند نہیں ہوں۔"[2]

۱۔ العراق فی ظل العهد الاموی ص۴۷ بحوالہ طبری، ابن قتیبہ اور ابو الفدا وغیرہ

۲۔ شرح نهج البلاغه ج ۴ ص ۱۶

اب اہل عراق کو خاص طور پر اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہیں معلوم ہوا کہ امام علیؑ کی نافرمانی کا انہیں کیا پھل ملا۔ جب امام علیؑ انہیں جہاد کی دعوت دے رہے تھے تو اس وقت انہوں نے بات نہ مانی۔ اب انہیں یاد آیا کہ امام علیؑ کہا کرتے تھے کہ "تم نے میرا دل خون کردیا۔"

امام علیؑ دعا کیا کرتے تھے کہ انہیں ان عراقیوں کے ہاتھ سے نجات مل جائے۔ اب عراقیوں کو احساس ہوا کہ واقعی وہ معاویہ کے پنجے میں پھنس گئے ہیں۔[1]

کچھ ہی دن پہلے کے امام علیؑ کے کہے ہوئے یہ الفاظ ابھی ان کے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت جب آپ اپنے جوتے مرمت کر رہے تھے، آپ نے ابن عباسؓ سے فرمایا تھا: "اے ابن عباس! اگر میں حق کو قائم نہ کروں اور باطل کو نہ مٹاؤں تو پھر اس تمہاری خلافت کی ان جوتوں کے برابر بھی وقعت نہیں۔"

امام علیؑ خلافت کو اس نگاہ سے دیکھتے تھے کہ اگر ساری دنیا بھی ان کے زیر فرمان ہو لیکن وہ حق و انصاف پھیلانے کا ذریعہ نہ بن سکے تو اس کی وقعت دو کوڑی کی بھی نہیں۔

اور جب امام علیؑ سریر آرائے خلافت ہوئے اور دنیا ان کے قبضہ قدرت میں آگئی تو تب بھی انہوں نے حکومت کو بوسیدہ جوتوں کے برابر ہی قرار دیا مگر یہ کہ حکومت کے ذریعے حق و انصاف کو قائم کیا جائے اور مظلوم کو ظالم سے اس کا حق دلایا جائے۔ اس کے برعکس ہند کا بیٹا دنیا پر ریجھ گیا تھا۔ (انا اول الملوک[2] کہنے والے) معاویہ نے دنیا کو اپنا تابع فرمان بنانے اور اپنے پرکھوں کی بڑائی جتانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر مسلمانوں کا خون بہانے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ بے شک معاویہ نے نخیلہ میں دیئے گئے اپنے بیان پر عمل

۱۔ العراق فی ظل العهد الأموی

۲۔ الاستیعاب ج ۱ ص ۲۵۴ ۔ البدایه والنهایه ج ۱۸ ص ۱۳۵

درآمد شروع کیا۔ شیعوں کو قتل کرنے قید کرنے اور جلاوطن کرنے کے سلسلہ میں اس نے اپنے تمام گورنروں کو لکھا کہ اس شخص کے جان و مال کی کوئی ضمانت نہ دی جائے جو ابو تراب (ع) اور اہلبیت (ع) کے فضائل میں کوئی چیز بیان کرے۔

اس کے بعد منبروں پر خطیب چیخنے لگے۔ محبوب رسولؐ امام علیؑ اور ان کے محترم خاندان پر منبروں سے سب و شتم کی بدعت شروع ہوگئی۔ اس دوران میں اہل کوفہ پر بڑی سختی کی گئی۔ چونکہ شیعیان علیؑ بہ نسبت اور شہروں کے کوفے میں زیادہ تھے۔ معاویہ نے زیاد بن سمیہ کو کوفہ کا حاکم مقرر کردیا اور بصرہ بھی اس کی ماتحتی میں دیدیا۔ زیاد نے شیعوں کی تلاش میں کوئی گلی کوچہ نہ چھوڑا۔ جہاں بھی کوئی شیعہ ملتا یا تو اس کو قتل کردیا جاتا یا اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جاتے[1] یا اس کو کسی کھجور کی شاخ پر پھانسی دیدی جاتی یا پھر شہر بدر کردیا جاتا یہاں تک کہ عراق میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ شیعیان علیؑ میں سے ہے۔ اس کے بعد دوسرے علاقوں میں بھی شیعوں کا پیچھا کیا گیا اور زیاد نے وہاں کے سب حاکموں کو لکھا کہ شیعیان علیؑ میں سے کسی کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ ساتھ ہی حکام کو یہ ہدایت بھی جاری کی گئی کہ حضرت عثمانؓ کے طرفداروں سے اچھا سلوک کیا جائے اور جن مجالس میں حضرت عثمانؓ کے فضائل بیان کیے جائیں ان میں یہ حکام خود شرکت کریں اور فضائل بیان کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کریں اور جو فضائل بیان کیے جائیں

۱۔ جب زیاد بن سُمیہ کوفہ کا حاکم تھا تو اس نے رُشید ہجریؓ کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے۔ جب رُشید کو ان کے گھر لے جایا گیا اور لوگ انہیں دیکھنے آئے اور رونے لگے تو انہوں نے کہا:

رونا دھونا چھوڑ دو اور لکھنے کا سامان لے آؤ تاکہ جو کچھ میں نے اپنے مولا (امیر المومنینؑ) سے سنا ہے وہ تمہارے لئے بیان کردوں (اور تم لکھ لو)۔ لوگ بھی ان کی بات مان گئے۔ جب یہ خبر زیاد تک پہنچی تو اس ظالم نے حکم دیا کہ رُشید ہجریؓ کی زبان بھی کاٹ دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (رجال کشی صفحہ ۷۵۔ بحار الانوار جلد ۹ صفحہ ۶۳۲ مطبوعہ کمپانی)

وہ لکھ لیں۔ ان احکام پر عمل کیا گیا۔ فضائل و مناقب عثمانؓ کے بیان کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی اور ایسی روایتیں بکثرت بیان کی جانے لگیں۔

اس کے بعد معاویہ نے اپنے کارگزاروں کو لکھا:

''حضرت عثمانؓ کے بارے میں تو احادیث سب لوگوں کو معلوم ہوگئی ہیں اور سب علاقوں میں پھیل گئی ہیں۔ اب لوگوں سے کہو کہ صحابہ اور خلفائے سابقین کی برتری کی احادیث بیان کریں۔ ہر اس روایت کے مقابلے میں جو ابوتراب (ع) کے بارے میں ہو ویسی ہی صحابہ کے بارے میں نقل کرو۔ اس سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ اور ابوتراب (ع) اور ان کے پیروکاروں کا رد ہوگا۔ فضائل صحابہ شیعوں پر مناقب وفضائل عثمانؓ سے بھی زیادہ گراں ہیں۔'' جو کچھ معاویہ چاہتا تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ کارخانہ حدیث سازی کے کارکنوں نے اس کی خواہش کو پورا کرنے میں دیر نہ لگائی اور اس کی فضیلت میں رسول اکرمؐ سے منسوب کرکے بہت ساری حدیثیں گھڑ ڈالیں۔ اس دور کے لوگوں نے اور آنے والی نسلوں نے ان حدیثوں کو صحیح حدیث سمجھ کر قبول کیا اور اپنے بچوں اور جوانوں کو یہ حدیثیں حفظ کرائیں۔

اس کے بعد معاویہ نے سب اسلامی ممالک میں اپنے کارگزاروں کو لکھا:

''جس شخص پر بھی شبہ ہو کہ علی (ع) اور ان کے خاندان کا پیرو ہے اس کا وظیفہ بند کردیا جائے اور اس کا گھر اجاڑ دیا جائے۔''

اس حکم پر عراق، خصوصاً کوفہ میں زیادہ سختی کی گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ حالات ناقابل برداشت ہوگئے۔ خصوصاً امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شہادت کے بعد۔

معاویہ کے بعد تمام اموی حکمرانوں نے اس کی یہ سیرت وسنت جاری رکھی۔ کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اپنے شیعہ عقیدے کا برملا اظہار کرے یا حسنؑ، حسینؑ کا نام بھی لے۔ راوی جب امام علیؑ کی کوئی روایت بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ ''ابوزینب (ع) نے ہم سے یہ بیان کیا۔'' عبدالملک بن قریب ایک دن جس راستے

سے حجاج [1] گزر رہا تھا وہاں کھڑا ہوگیا اور حجاج کو روک کر اس سے کہا: اے امیر! میرے خاندان نے مجھے عاق کردیا ہے اور میرا نام علی رکھ چھوڑا ہے۔ میں امیر کی نظر کرم کا محتاج ہوں۔حجاج نے قہقہہ لگا کر کہا: تم نے بڑا دلچسپ بہانہ بنایا۔ کاش! یہی بات ہوتی۔ اس کے بعد اس کے وظیفے کی رقم بڑھادی۔ [2]

زیاد نے متعدد شیعہ فقہاء، محدثین اور قاریوں کو قتل کرادیا جن میں حجر بن عدی عمرو بن حمق خزاعی، جویریہ بن مسہر وغیرہ شامل تھے۔ جب اس نے سعید بن سرح کو قتل کرنا چاہا تو سعید نے امام حسن علیہ السلام کے پاس پناہ لے لی۔ زیاد نے اس کا گھر ڈھا دیا،اس کے سامان پر قبضہ کرلیا اور اس کے بھائی اور بیوی کو قید کردیا۔ امام حسن علیہ السلام نے زیاد کو خط لکھا:

امابعد! تو ایک مسلمان کی جان کے درپے ہے۔ اس کا حق بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسروں کا اور اس سے بھی دشمنی ایسی ہی ہے جیسی دوسروں سے۔ تو نے اس کا گھر ڈھا دیا۔ اس کے مال و اسباب پر قبضہ کرلیا اور اس کی بیوی کو قید کردیا۔ جیسے ہی تجھے میرا یہ خط ملے اس کا مکان دوبارہ بنوادے۔ اس کا سامان اور بیوی واپس کردے۔ اس نے مجھ سے سفارش کی درخواست کی ہے اور میں نے اسے پناہ دیدی ہے۔

۱۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ "اگر دنیا کی تمام قومیں خباثت کا مقابلہ کریں اور اپنے اپنے سارے خبیث لے آئیں تو ہم تنہا حجاج کو پیش کرکے ان پر بازی لے جاسکتے ہیں۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو وہ سردار منافقین کہتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ "اگر ابن مسعودؓ مجھے مل جاتے تو میں ان کے خون سے زمین کی پیاس بجھاتا۔" اس نے اعلان کیا تھا کہ "ابن مسعودؓ کی قرأت میں کوئی شخص قرآن پڑھے گا تو میں اس کی گردن مار دوں گا اور مصحف میں سے اس قرأت کو اگر سور کی ہڈی سے بھی چھیلنا پڑے تو چھیل دوں گا۔" اس نے حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ جیسے بزرگوں کو گالیاں دیں اور ان کی گردنوں پر مہریں لگائیں۔

(مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خلافت و ملوکیت ص ۱۸۶ مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور)

۲۔ شرح نہج البلاغہ ج ۳ ص ۱۶

زیاد نے جواب میں لکھا:

منجانب زیاد بن ابی سفیان بنام حسن بن فاطمہ۔ امابعد! تمہارا خط ملا۔ تم نے یہ خط اپنے نام سے شروع کیا ہے حالانکہ تم سائل ہو۔ میں حاکم ہوں اور تم رعیت۔ تم مجھے اس طرح حکم دیتے ہو جیسے کوئی حاکم اپنی رعایا کو حکم دیتا ہے۔ تم نے ایک فاسق کو پناہ دی ہے اور پھر مجھے خط لکھا ہے۔ اس نے تم سے غلط کام کرایا اور تم نے خوشی سے کردیا۔ خدا کی قسم تم اسے میرے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکتے چاہے وہ تمہاری کھال اور گوشت کے بیچ میں ہی کیوں نہ گھس جائے۔ بہترین گوشت جو میں کھانا پسند کروں گا وہ تمہارا گوشت ہوگا۔ لہٰذا اسے اس کے ہمسائے کے سپرد کردو جو اس کو رکھنے کے لئے تم سے زیادہ موزوں ہے۔ یہ سمجھ لو کہ اگر میں اس کا گناہ معاف کردوں گا تو یہ تمہاری سفارش کی وجہ سے نہیں ہوگا اور اگر میں اس کو قتل کروں گا تو یہ تمہارے فاسق (نعوذ باللہ) باپ کی دوستی کی وجہ سے ہوگا۔[1]

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں: ”معاویہ کے تین افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک اس کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کرلینا درآنحالیکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے اس کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا حالانکہ نبی اکرمؐ کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں اور تیسرے اس کا حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنا۔ وائے ہو اس پر حجر اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں۔

بنی امیہ پوری قوت سے اہلبیتؑ اور ہر اس شخص کے درپے آزار رہتے تھے جس پر اہلبیتؑ سے محبت یا ان کی پیروی کا شبہ ہو۔ جب تک مسلمانوں میں امام علی علیہ السلام کا نام نیکی سے لیا جاتا تھا اور لوگ اپنے بچوں کا نام حسنؑ اور حسینؑ رکھتے

۱۔ شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۷۲

جو مومنوں کے دلوں میں روشن تھا بجھا نہ سکے۔ان کی یہ آرزو تو پوری نہ ہوئی البتہ انہوں نے اہلبیت علیہم السلام اور ان کے دوستوں کو خلافت اور امت کے انتظامی امور سے دور ضرور رکھا۔

بہر حال امام حسن علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہ جس نے بھی کوفیوں پر بھروسا کیا ناکام ہی رہا، اسلام کے وسیع تر مفاد میں خلافت پر اپنے حق سے دستبردار ہوگئے اور ایک ایسا معاہدہ کرلیا جس کے مطابق معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کے پیروکاروں اور عام مسلمانوں کے حقوق اور ان کی عزت کی حفاظت کا وعدہ کیا۔ گو جو لوگ معاویہ کی طبیعت سے واقف تھے انہیں یقین نہیں تھا کہ یہ وعدہ پورا بھی ہوگا۔

امام حسن علیہ السلام مجبور تھے کہ کوفہ چھوڑ کر اپنے خاندان کے ساتھ اسلام کے پہلے دارالحکومت کو ہجرت کر جائیں اور وہاں باقی ماندہ صحابہ کرام کے درمیان زندگی بسر کریں۔ صحابہ کرام نے ان کے اور ان کے بھائی امام حسین علیہ السلام کے بارے میں یہ سنا ہوا تھا: هٰذَانِ اِمَامَانِ ، قَامَا اَوْ قَعَدَا ''یہ دونوں امام ہیں خواہ قیام کریں یا نہ کریں۔'' اور یہ بھی کہ هُمَا سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ ''یہ دونوں (بھائی) اہل جنت کے سردار ہیں۔''

علم کے جویا اور باقی ماندہ صحابہ کرام ان کے گرد جمع ہوگئے اور ان سے اصول و فروع اسلام سیکھنے لگے۔ امام حسن علیہ السلام نے ایک کتاب فقہ میں تالیف کی۔ چنانچہ سیوطی نے تدریب الراوی میں ایک بات ایسی لکھی ہے جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ سیوطی لکھتے ہیں:

متقدمین میں صحابہ و تابعین میں علم کی کتابت اور تدوین کے بارے میں سخت اختلاف رہا ہے۔ زیادہ تر لوگ اس کو پسند نہیں کرتے تھے مگر ایک

تھے بنی امیہ کی تلوار اسی طرح کھنچی رہتی تھی۔(آج کل کی اصطلاح میں ریاستی دہشت گردی کے) اس ماحول میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فقہ اور دوسرے مضامین میں شیعوں کی آواز کمزور رہی۔جس فرقے کی زندگی ظلم وستم اور گھٹن کے ماحول میں اجیرن بنا دی گئی ہو اس کے لئے یہ قدرتی بات ہے۔اگر شیعیت مضبوط اور محکم عقیدے کی بنیادوں پر استوار نہ ہوتی تو اسی طرح مٹ جاتی جیسے اور بہت سے مذاہب اور فرقے مٹ گئے۔ تاریخ کے طویل دور میں بہت سے فرقے محض اس لئے نابود ہوگئے کہ وقت کی سیاست ان کے خلاف تھی حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی حکام کی اس سختی اور ظلم کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو شیعوں کو بنی امیہ کے زمانے سے زمانۂ حال تک کے طویل دور میں کرنا پڑا تھا۔

بنی امیہ کا پہلا سیاسی ہدف علویوں ،شیعوں اور ان کے آثار کو اپنی پوری قوت کے ساتھ مٹانا تھا۔سب سے زیادہ انہیں اسی کی فکر لگی رہتی تھی اور ان کی زیادہ تر کوشش کا یہی مقصد تھا کیونکہ انہیں ان ہی لوگوں سے خطرہ تھا کہ کہیں یہ ان کی حکومت اور اقتدار کے لئے خطرناک ثابت نہ ہوں۔

اموی حکمرانوں کے طرزعمل سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔ہشام بن عبدالملک نے اپنے ایک خط میں جو اس نے اپنے عراق کے گورنر یوسف بن عمر کو لکھا تھا شیعوں اور شیعہ ائمہ کے خلاف امویوں کے برے ارادوں سے پردہ اٹھایا ہے۔اس نے لکھا تھا:امابعد!تمہیں اہل کوفہ کا حال معلوم ہے۔ وہ اہلبیتؑ کے چاہنے والے ہیں اور ان سے خصوصیت رکھتے ہیں۔ان کی اطاعت کو اپنے اوپر واجب سمجھتے ہیں۔دینی مسائل ان ہی سے پوچھتے ہیں اور جو اہلبیتؑ کہتے ہیں اسی پر عمل کرتے ہیں۔اہلبیتؑ نے ان کا راستہ اوروں سے اس طرح الگ کردیا ہے کہ ان کا میرے خلاف اٹھ کھڑے ہونا آسان ہوگیا ہے[۱] لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اموی اس شعلہ حق کو

۱۔ العراق فی ظل العھد الاموی از ڈاکٹر علی خرطبولی ص ۲۰۹

جماعت اس کو جائز سمجھتی تھی۔[1] اس جماعت میں علی (علیہ السلام) اور ان کے فرزند حسن (علیہ السلام) شامل تھے۔

جب فرزدق شاعر فریضہ حج ادا کرنے جا رہا تھا تو راستے میں اس کی ملاقات امام حسین علیہ السلام سے ہوئی جو عراق کی طرف جا رہے تھے۔ وہ کہتا ہے:

میں نے نذر اور اعمال حج کے بارے میں کچھ مسائل امام سے پوچھے۔ امام نے مجھے ان کا جواب دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ ان ثقہ اور پاک ترین افراد میں سے تھے جن سے لوگ اپنے مسائل کے بارے میں رجوع کرتے تھے۔ مدینہ کے اکثر باشندوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ رسول اکرمؐ اپنی زندگی میں ان دونوں کو اپنے کندھوں پر بٹھاتے اور ان کو اپنی زبان مبارک چساتے تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ رسول اکرمؐ ان دونوں سے فرمایا کرتے تھے نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُكُمَا وَنِعْمَ الرَّاكِبَانِ اَنْتُمَا ''تمہارا اونٹ کتنا اچھا ہے اور تم کتنے اچھے سوار ہو۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد امام علیؑ نے ان دونوں کی سرپرستی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ امام علیؑ کی سرپرستی میں انہوں نے تقریباً چالیس سال گزارے۔ زندگی بھر ان دونوں کا طور طریقہ نہایت عمدہ رہا۔ ان کا طریقہ وہی تھا جو

---

[1] عبید اللہ بن حر جعفی شاید پہلے شخص تھے جو امام حسینؑ کی قبر مطہر کی زیارت کے لئے گئے اور جنہوں نے امام مظلومؑ کا مرثیہ کہا۔ ادھر اسیران کربلا کا قافلہ کوفہ سے شام روانہ ہوا اُدھر عبید اللہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ کوفہ سے کربلا روانہ ہوئے۔ بعد میں وہ مختار ثقفی کے ساتھ خون حسینؑ کا بدلہ لینے کے لئے نکلے اور آخر دم تک حکومت وقت کی مخالفت میں سرگرم رہے۔ صاحب رجال نجاشی نے ان کا شمار سلف صالحین میں کیا ہے اور لکھا ہے: ''انہوں نے ایک کتاب میں امیر المومنینؑ کے خطبات جمع کئے تھے۔'' (علی اکبر غفاری: مقدمہ بر تاریخ عاشورا صفحہ ۴۶)
تاریخ عاشورا کے مؤلف ڈاکٹر ابراہیم آیتی صفحہ ۲۷۵ پر لکھتے ہیں: شیخ طوسی نے مصباح المتهجد میں لکھا ہے کہ ۲۰ صفر وہ دن ہے کہ جب جابر بن عبد اللہ انصاریؓ مدینہ سے امام حسینؑ کی قبر مطہر کی زیارت کے لئے کربلا آئے، وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے قبر امام کی زیارت کی۔

اُن کے اب و جد کا تھا۔انہوں نے اپنی زندگی میں پے در پے راہ خدا میں کئی جہاد دیکھے تھے جن کا مقصد انسانیت کی ترقی اور ظلم و جور کے ناخداؤں کے خلاف انقلاب تھا۔ ان دونوں نے ان لوگوں کی مخالفت کی تھی جو دوسروں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرتے تھے۔تشدد اور ظلم سے کام لیتے تھے اور اپنے سیاسی مخالفوں کو قتل اور جلاوطنی کی دھمکی دیتے تھے مگر کوئی دھمکی ان دونوں کو ان کے راستے سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ وہ اسلامی معاشرے میں بغیر کسی گھبراہٹ اور خوف کے اپنے طریقے پر ڈٹے رہے۔ جب امام حسینؑ سے مسلمانوں نے بار بار درخواست کی کہ آپ انہیں یزید کی حکومت اور اس کے ستم پیشہ حکام کے ظلم سے نجات دلائیں تو ایسی صورتحال ہوگئی کہ امام حسینؑ کے لئے گریز کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ عراقی برابر اصرار کر رہے تھے اور ان کی طرف سے ہزاروں خط آچکے تھے۔آخر امام حسینؑ نے ان کی درخواست منظور کرلی اور عراق کی طرف روانہ ہوگئے لیکن اس سے پہلے کہ کوفہ پہنچیں اچانک انہیں عراقیوں کے مکر و فریب اور دھوکے کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ان کے لئے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اپنے نانا کے شہر واپس چلے جائیں یا عرب کی کسی دوسری سرزمین میں پناہ لے لیں۔ امام حسینؑ کے سامنے اب دو ہی راستے تھے۔ یا تو یزید اور اس کے آدمیوں کی اطاعت قبول کرلیں یا پھر اپنے دوستوں اور فرزندوں کی اس مختصر سی جماعت کے ساتھ ان سے لڑیں۔اطاعت قبول کرنے کا مطلب تھا یزید کی بیعت کرنا۔ یزید کی خلافت کے روز اول ہی سے امام اس بارے میں اپنی رائے کا اعلان کرچکے تھے۔ اپنی اس رائے کا اظہار انہوں نے اس وقت بھی کیا تھا جب مدینے کے حاکم نے رات کے وقت انہیں بیعت کیلئے طلب کیا تھا اور پھر دوسرے موقعوں پر بھی انہوں نے یہی بات دہرائی تھی۔ یہ بات طے تھی کہ آج بھی وہ بیعت کی تجویز کو اسی طرح رد کردیں گے جس طرح انہوں نے کل کیا تھا۔اب جو ہو سو ہو۔ اگر حق و انسانیت کی راہ میں موت آجائے تو کوئی بات نہیں۔لہٰذا انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے عزت کی موت قبول کرلی۔ امام حسینؑ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: لَا اَرَی الْمَوْتَ اِلَّا

یہ ایک مختصر سی بحث تھی اس سیاسی صورت حال کی جو بنی امیہ کو اقتدار منتقل ہونے کے بعد پیش آئی۔ ہم نے مختصر طور پر یہ بتایا ہے کہ بنی امیہ کا اہلبیتؑ اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ کیا سلوک تھا اور اہلبیتؑ اور ان کے ماننے والوں کو کیسی کیسی تکلیفیں اور ایذائیں برداشت کرنی پڑیں اور کس طرح انہیں ان کے خدائی حق خلافت سے محروم رکھا گیا۔ اب یہ بتانا ضروری ہے کہ باقی ماندہ صحابہ و تابعین میں سے شیعہ حاملان فقہ و حدیث پر اس سیاست کا کیا اثر مرتب ہوا۔

گزشتہ بحث سے یہ ظاہر ہے کہ جو شیعہ اس زمانے میں فتویٰ دیتے تھے یا حدیث روایت کرتے تھے وہ اس بات کی پوری کوشش کرتے تھے کہ ان کا شیعہ ہونا مخفی رہے تاکہ ان کا بھی وہی انجام نہ ہو جو جانے پہچانے شیعوں کا ہوا جیسے حجر بن عدی، سعید بن جبیر، یحییٰ بن ام الطویل اور دسیوں دوسرے۔

کے رسولوں کی آسمانی تعلیم پر عمل نہیں کیا جاتا۔ رسولوں کی بعثت کا ایک مقصد معاشرے میں سماجی انصاف برپا کرنا تھا کیونکہ سماجی انصاف کا تعلق الٰہی جہاں بینی سے ہے۔ ہم زیارت وارثہ میں پڑھتے ہیں کہ امام حسینؑ انبیاء کے وارث تھے۔ امام حسینؑ نے معاویہ کے آخری ایام میں منیٰ میں مختلف علاقوں سے مدعو کئے گئے تقریباً ایک ہزار صحابہ اور تابعین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"خدا سے کئے ہوئے وعدے توڑے جا رہے ہیں مگر تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی حالانکہ تمہارے آباء سے کئے ہوئے وعدوں کی اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو تم بے چین ہو جاتے ہو۔ رسول اللہؐ کی امانت کو کوئی پوچھتا نہیں۔ بستیوں میں اندھے، گونگے اور اپاہج پڑے پھرتے ہیں جن پر کوئی ترس نہیں کھاتا۔ تم اپنی ذمہ داریوں کی پروا نہیں کرتے اور جو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ ظلم کو نظر انداز کر کے اور ظالموں سے تعاون کر کے اپنے بچاؤ کی فکر کرتے ہو۔ انہی باتوں سے اللہ نے منع کیا ہے اور دوسروں کو بھی منع کرنے کے لئے کہا ہے لیکن تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔" (تحف العقول، حسن بن شعبہ حرانی ۳۶۵ھ)

اس خطبے کے در و بست سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ معاشرے میں سماجی انصاف کے لئے انقلاب لانا چاہتے تھے۔ امام حسینؑ کے نویں فرزند، آل محمدؐ کے "قائم" اور عالم بشریت کے نجات دہندہ "امام مہدیؑ" کے انقلابی منشور کا بنیادی نکتہ بھی دنیا میں سماجی انصاف قائم کرنا اور ظلم و جور کو مٹانا ہے یَمْلَأُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَّ عَدْلًا کَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَّ جَوْرًا۔

سَعَادَةً وَالْحَيَاةَ مَعَ الظَّالِمِيْنَ اِلَّا بَرَمًا وَشَقَاءً" میں موت کو سعادت سمجھتا ہوں۔ میری نگاہ میں ظالموں کے ساتھ زندگی تکلیف دہ بھی ہے اور بدنصیبی بھی۔"

امام حسینؑ نے آنے والوں کو صبر و استقامت، ظلم کے خلاف جہاد اور خدا کی راہ میں جاں نثاری کا درس دیا۔ اب تک کتنے ہی لوگوں نے حق اور عقیدہ کی راہ میں ثابت قدمی اور خلوص اور ظالموں کے ساتھ زندگی کی بے وقعتی کا سبق ان سے سیکھا ہے۔ یہ زندۂ جاوید قصہ تاریخ کی موثر ترین داستان ہے جو لوگوں کو حرکت اور عمل پر ابھارتی اور زندگی کا سلیقہ سکھاتی ہے۔[1]

ا۔ امام حسینؑ اگرچہ فی زمانہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن جونہی ہلال محرم طلوع ہوتا ہے امامؑ کے ان جملوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے: اَلَا تَرَوْنَ اِلَى الْحَقِّ لَا يُعْمَلُ بِهٖ وَاِلَى الْبَاطِلِ لَا يُتَنَاهٰى عَنْهُ لِيَرْغَبَ الْمُؤْمِنُ فِيْ لِقَاءِ اللّٰهِ حَقًّا کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے بچنے کی کوشش نہیں کی جا رہی۔ ان حالات میں مومن کو اللہ سے ملاقات کا خواہاں ہونا چاہئے۔

امام کے یہ جملے پڑھ کر خیال آتا ہے کہ کیا آج کے حالات ۶۰ھ سے مختلف ہیں؟ کیا آج باطل نظام سے بچنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ کیا دنیا سے ظلم اور سماجی ناانصافی کا خاتمہ ہو چکا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں: "اس میں کوئی شک نہیں کہ پیداوار کے بہتر طریقوں نے دنیا کو زیادہ مالدار کر دیا ہے لیکن کس طبقے کو؟ یہ تو خیر ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں اب تک سخت مصیبت و افلاس پھیلا ہوا ہے لیکن انگلستان جیسے دولت مند ملک کا کیا ہے۔ وہاں بھی یہی صورت ہے۔ آخر یہ کیوں؟ یہ ساری دولت کہاں جاتی ہے؟ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دولت روز بروز بڑھ رہی ہے اور غریب اسی طرح غریب ہیں... کوئی دو سو برس گزرے مشہور فرانسیسی مفکر Voltaire نے ان سیاست دانوں اور اسی قسم کے لوگوں کے متعلق خوب کہا تھا کہ" ان لوگوں نے اپنی حکمت عملی سے ایسی تدبیر نکالی ہے کہ جو لوگ محنت کر کے دوسروں کو زندہ رکھتے ہیں وہ خود بھوکے مریں۔" (تاریخ عالم پر ایک نظر صفحہ ۵۹ مطبوعہ تخلیقات لاہور) امریکہ میں بھی عام آدمی کی حالت کچھ قابل رشک نہیں ہے۔ وہاں بھی لوگ بھیک مانگتے ہیں، فٹ پاتھوں پہ سوتے ہیں اور کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ John Kenneth Galbraith نے اپنی کتاب The Affluent Society میں لکھا ہے کہ امریکہ میں اقتصادی ترقی کے باوجود سماجی شعبہ میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے باوجود پہلی دنیا اور تیسری دنیا کے لوگوں کی زندگی میں کتنا فرق ہے؟ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اللہ

اس سے پہلے کہ ہم تابعی فقہائے شیعہ کا ذکر کریں اس دور کا مختصر تذکرہ ضروری ہے جب امام زین العابدینؑ فقہ اور دینیات کی تعلیم و تدریس میں مشغول تھے اکثر فقہائے تابعین نے آپ سے اور آپ سے پہلے تین اماموں ہی سے علم حاصل کیا تھا اور ان سے ہی احادیث روایت کرتے تھے۔آپ نے خانوادۂ رسالت میں پرورش پائی تھی یعنی آپ اس گھر میں پلے بڑھے تھے جس نے راہ خدا میں وہ مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کی تھیں جن کا تصور کرنا بھی انسان کے لئے مشکل ہے۔

لڑکپن کے ابتدائی سالوں میں امام زین العابدینؑ نے مسجد کی محراب میں اپنے جد بزرگوار امام علیؑ کا المیہ دیکھا تھا۔ پھر اپنے چچا امام حسنؑ کا المیہ دیکھا۔ اس کے بعد اپنے پدر گرامی امام حسینؑ کاالمیہ دیکھا۔ جس میں تنہا وہی اپنے بھائیوں میں زندہ بچ سکے۔ اس جانگداز سانحے کا اثر ان پر زندگی بھر رہا یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار سے ملحق ہوئے۔ان تمام مصیبتوں کے باوجود جو پے درپے ان پر پڑیں اور اس تاریک فضا کے باوجود جس میں ان کو اپنے والد کی شہادت اور اہل حرم کی قید کے بعد زندگی گزارنی پڑی وہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی عبادت اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی احکام کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے۔

ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں لکھا ہے:

''علی بن الحسین(ع) ثقہ اور امین تھے۔ ان سے بکثرت احادیث مروی ہیں۔وہ بلند مرتبہ، عالی مقام، پرہیزگار، عابد اور خدا ترس تھے۔''

ابن جوزی نے تذکرۃ الخواص میں لکھا ہے:

''ابن عباس جب علی بن حسین کو دیکھتے تو کہتے مرحبا حبیب ابن حبیب !''

ابونعیم نے اپنے رسالہ میں زہری کے متعلق نقل کیا ہے کہ زہری کہتے تھے:

''میں نے بنی ہاشم میں سے کسی کو علی بن الحسین سے برتر نہیں پایا۔''

ابوحازم امام زین العابدینؑ کے بارے میں کہتے ہیں:

''میں نے ان سے بڑھ کر کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔''

شیخ مفید نے الارشاد میں عبداللہ بن موسیٰ سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میرے والد نے مجھ سے کہا: ''میری والدہ فاطمہ بنت حسین نے مجھے نصیحت کی کہ میں اپنے ماموں علی بن الحسین کے پاس بیٹھا کروں۔ میں جب بھی ان کے پاس بیٹھا کچھ نہ کچھ اچھی بات سیکھ کر ہی اٹھا۔ ان کا خوف خدا دیکھ کر میرے دل میں بھی خدا کا خوف جڑ پکڑ گیا۔ ان کی مجلس سے میں اکثر کوئی علمی بات سیکھ کر ہی اٹھتا تھا۔''

ارشاد ہی میں سعید بن کلثوم سے منقول ہے کہ وہ کہتے تھے:

'' ایک دفعہ میں صادق (آل محمدؐ) جعفرؑ بن محمدؑ کی خدمت میں حاضر تھا۔ وہ امیرالمومنین علی علیہ السلام کا تذکرہ کرنے لگے۔ جیسا کہ مناسب تھا پہلے ان کی کچھ خوبیاں بیان فرمائیں۔ اس کے بعد فرمایا: خدا کی قسم! علی بن ابی طالبؑ نے کبھی کوئی دنیا کی حرام چیز نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ جب بھی کبھی آپ کے سامنے دو ایسے متبادل کام پیش کیے گئے جن میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی تھی تو آپ نے اپنے لئے ان میں سے مشکل کام کا انتخاب کیا۔ جب بھی رسول اکرمؐ پر کوئی مشکل وقت پڑا تو آپ نے علیؑ ہی کو پکارا کیونکہ وہی بھروسہ کے فرد تھے ۔ اس امت میں امام علیؑ کے سوا کوئی شخص رسول اکرمؐ جیسے عمل کرنے کی برداشت نہیں رکھتا۔ وہ اسی طرح عمل کرتے تھے گویا جنت اور جہنم کو دیکھ رہے ہوں۔ وہ جنت کے ثواب کے امیدوار تھے اور جہنم کے عذاب سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے خود اپنے مال سے (یعنی اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے) ہزار غلام اللہ کی رضا کے لئے اور عذاب جہنم سے بچنے کے لئے آزاد کیے۔ جہاں تک میں نے دیکھا امام علیؑ کی اولاد میں سے کوئی بھی لباس، خوراک، علم اور دانائی میں علی بن الحسینؑ سے زیادہ آپ سے مشابہت نہیں رکھتا تھا۔

امام زین العابدینؑ علم اور اہل علم کے اس قدر گرویدہ تھے کہ آپ طالب علم کی

پیشوائی کے لئے آگے بڑھتے ، اس سے معانقہ کرتے اور پھر فرماتے: ''مبارک ہو کہ تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت پر عمل کرتے ہو۔''

امام زین العابدینؑ ایک حبشی غلام کے پاس جا کر بیٹھتے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سب سے بزرگ ہیں۔آپ کیوں اس غلام کے پاس جاتے اور بیٹھتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: علم جہاں بھی ہو اس کے پیچھے جایا جاتا ہے۔

شیخ خضری ان بزرگ تابعین کے تذکرے میں جو فقہ و فتویٰ میں مشہور ہوئے کہتے ہیں: ''علی بن الحسینؑ ہاشمی ، شیعہ امامیہ کے چوتھے امام جو زین العابدین کے لقب سے مشہور ہیں ، اپنے باپ حسینؑ اور اپنے چچا حسنؑ سے نیز حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔''

شیخ خضری نے زہری کا قول نقل کیا ہے۔ وہ کہتے تھے: ''میں نے کسی کو علی بن الحسینؑ سے زیادہ فقہ سے واقف نہیں دیکھا۔''

ابن زہری کہتے ہیں: ''میں نے کسی کو بنی ہاشم میں ان سے بڑھ کر نہیں پایا۔''

ان کے ہم عصر علماء کے اقوال بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ان کی تعریف میں کہا گیا ہے وہ سب نقل کریں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ دکھائیں کہ اس زمانے میں شیعوں سے دشمنی کے باوجود اور اس کے باوجود کہ حکام شیعوں کی مخالفت کو اپنا فرض عین سمجھتے تھے ، امام زین العابدینؑ سے ہی لوگ ان کے زمانے میں دینی احکام کے لئے رجوع کرتے تھے۔

بہت سے تابعین جن میں قاسم بن محمد بن ابی بکر ، سعید بن مسیتب ، ابن جبیر، ابوحمزہ ثمالی، ابوخالد کابلی وغیرہ شامل ہیں، امام سے ہی درس لیتے تھے۔

سید حسن صدر کہتے ہیں: ''قاسم بن محمد ، سعید بن مسیتب اور ابوخالد کابلی ، یہ وہ لوگ تھے جو امام زین العابدینؑ کے قابل اعتماد اصحاب میں سے تھے۔''

امام زین العابدینؑ اپنے والد کے بعد تقریباً چالیس سال زندہ رہے اور یہ پوری مدت بنی امیہ کے دور حکومت میں گزاری۔ خلفائے بنی امیہ اور ان کے ماتحت

حکام جیسے حجاج بن یوسف ثقفی وغیرہ ان پر سخت نگرانی رکھتے تھے۔ ان حکام نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ ان تمام لوگوں کو جو بنی امیہ کے حامی نہیں تھے نیست و نابود کردیں۔ حجاج نے اور دوسرے اموی حاشیہ برداروں نے سب سے پہلے شیعوں ہی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ بنی امیہ آثار اہلبیتؑ کو ختم کرنے اور شیعوں کو مٹانے کے لئے قتل، جلاوطنی اور تشدد کے ہتھکنڈوں[1] کے علاوہ جعلی احادیث سے بھی کام لیتے تھے لیکن اموی حکمرانوں، ان کے جانشینوں اور حاشیہ برداروں کی ساری کوششیں خاک میں مل گئیں، تشیع باقی رہا اور آثار اہلبیتؑ مٹائے نہ مٹ سکے۔" اس پاکیزہ درخت کی طرح جس کی جڑ پائیدار ہے اور جس کی شاخیں آسمان میں ہیں اور جو ہمیشہ اپنے پروردگار کے حکم سے پھل دیتا ہے۔" (سورۂ ابراہیم: آیت ۲۴)

وجہ اس کی یہ تھی کہ شیعہ ائمہ ہر دور میں اپنے جد بزرگوار رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کا کامل نمونہ رہے۔ ان کی زندگی اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ خلوص، حق کی راہ میں جاں سپاری اور باطل کے مقابلے میں ڈٹ جانے سے عبارت رہی۔

جس زمانے میں شیعہ ائمہ سخت نگرانی میں تھے اور شیعوں کو طرح طرح کی اذیتیں اور آزار دیئے جارہے تھے سب بڑے بڑے فقیہ اور مفتی شیعہ تھے لیکن ان کے فقہ وحدیث میں تشیع کا رنگ نمایاں نہیں تھا۔ انہوں نے سیاسی دباؤ کی وجہ سے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ یہ دباؤ تمام اموی حکمرانوں کے دور میں قائم رہا جن کی سیاست کا اصول یہ تھا کہ مذہب اور فقہ کو اپنا اقتدار مضبوط کرنے کیلئے استعمال کیا جائے

۱۔ طبری کی کتاب منتخب ذیل المذیل میں اور ابن سعد کی طبقات جلد ششم میں لکھا ہے کہ عطیہ بن سعد بن جنادہ کے بارے میں حجاج بن یوسف ثقفی نے محمد بن قاسم ثقفی (فاتح سندھ) کو لکھا کہ عطیہ کو حاضر کرکے اس سے کہو کہ علیؑ پر لعنت کرے، اگر وہ انکار کرے تو اس کو چار سو کوڑے لگاؤ اور اس کا سر اور داڑھی مونڈ دو۔ محمد بن قاسم نے عطیہ کو بلوایا اور حجاج کی چٹھی پڑھ کر سنائی۔ عطیہ امیر المومنینؑ کی بدگوئی پر تیار نہیں ہوئے اور انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ناچار عطیہ اس پر تیار ہوئے کہ انہیں حجاج کے حکم کے مطابق چار سو کوڑے لگائے جائیں اور سر اور داڑھی مونڈ دی جائے۔ (تاریخ عاشورا ص ۲۷۷ از ڈاکٹر ابراہیم آیتی مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی)

اب ہم کچھ ایسے شیعہ بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے بنی امیہ کے دور میں فقہ اور اسلامی علوم میں شہرت حاصل کی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اموی دور کی ابتدا سے امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے تک شیعہ بزرگوں کا فقہ، تفسیر اور حدیث کے علوم میں کتنا حصہ رہا ہے۔

ڈاکٹر یوسف نے اپنی کتاب تاریخ الفقہ الاسلامی میں ان صحابہ کرام کا ذکر کیا ہے جنہوں نے فقہ میں شہرت پائی اور ان تابعین کے نام گنوائے ہیں جنہوں نے ان بزرگ صحابہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ خضری نے بھی تاریخ التشریع الاسلامی میں ان میں سے اکثر افراد کا ذکر کیا ہے جن کا ڈاکٹر یوسف نے نام لیا ہے۔ ان میں وہ لوگ شامل ہیں جن کا شیعہ ہونا اور اہلبیتؑ سے محبت رکھنا مسلّم ہے۔

شیعہ فقہاء میں سے اس زمانے میں ایک سعید بن مسیب ہوئے ہیں جن کا شمار مدینے کے فقہائے سبعہ میں ہے۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور ترین فقہاء و محدثین میں سے تھے۔ وہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے پہلے چار سالوں میں سے کسی سال میں پیدا ہوئے۔ ائمہ اہلبیتؑ کے طرفداروں میں سے تھے۔ علی بن الحسینؑ سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔

فضل بن شاذان کہتے ہیں: ''علی بن الحسینؑ کی زندگی کے آخری ایام میں صرف پانچ افراد ان سے قریب تھے۔ یہ سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، محمد بن جبیر بن مطعم، یحیٰی بن ام الطویل اور ابو خالد کابلی تھے۔''[1]

اسحاق بن حریز روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

''سعید بن مسیب پر امام زین العابدین علیہ السلام کو اعتماد تھا۔''

محمد بن ابی نصر بزنطی کہتے ہیں کہ امام علی رضاؑ کی مجلس میں قاسم بن محمد اور سعید بن مسیب کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ دونوں ولایت اہلبیتؑ کے قائل تھے۔''

۱۔ خلاصۃ الرجال علامہ حلی ص ۳۹

بعض روایات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سعید بن مسیب اہلبیتؑ سے بے تعلق تھے۔ چنانچہ وہ امام علی بن الحسینؑ کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔ شیخ محمد طٰہٰ اتقان المقال فی علم الرجال میں وہ روایتیں بیان کرنے کے بعد جن سے ان کے تشیع اور اہلبیتؑ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے لکھتے ہیں:

''ان کے خلاف صرف ایک مرسل روایت جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب امام سجادؑ کا جنازہ لے جایا جا رہا تھا اور سب لوگ اس میں شرکت کے لئے دوڑ رہے تھے تو مسجد میں صرف سعید رہ گئے۔ اشجع کے آزادہ کردہ غلام خشرم ان کے برابر کھڑے تھے۔ انہوں نے سعید سے کہا کہ اے ابومحمد! کیا آپ ایسے نیک بزرگ کی نماز جنازہ نہیں پڑھیں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نیک خاندان کے اس بزرگ کی نماز پڑھنے سے مجھے مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنا زیادہ پسند ہے۔ جیسے یہ ممکن ہے کہ یہ بات کسی کدورت کی وجہ سے کہی گئی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ازروئے تقیہ ایسا کہا ہو اور وہ نہ چاہتے ہوں کہ ان پر تشیع کا الزام عائد ہو۔ حجاج کے زمانے میں نیک لوگوں کو صرف تشیع کے شبہے میں قتل کر دیا جاتا تھا۔ سعید بن جبیر اسی بناء پر قتل کیے گئے تھے۔ اس زمانے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعض اصحاب امام کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے تاکہ وہ شیعہ مشہور نہ ہو جائیں۔

علی بن زید کی روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے امام زین العابدینؑ کی نماز جنازہ کے ترک کرنے کا عذر پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے علی بن الحسینؑ سے سنا ہے کہ مسجد میں اس وقت جب وہاں کوئی نہ ہو دو رکعت نماز پڑھنے کا ثواب ایسا ہے کہ خدا کے سوا کوئی اس کا حساب نہیں لگا سکتا۔ اور مسجد صرف اسی وقت خالی ہوئی تھی جب امام زین العابدینؑ کا جنازہ لے جا رہے تھے۔''

بہرحال امام زین العابدینؑ کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کرنے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سعید بن مسیب امامت اور تشیع سے منحرف ہو گئے تھے۔ خاص طور پر ایسی

حالت میں جبکہ ان کا تشیع مشہور ہے اور بکثرت احادیث سے ان کی اہلبیتؑ سے محبت ثابت ہے۔

امام زین العابدینؑ نے ان کے بارے میں کہا ہے: وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم اور سب سے زیادہ سمجھدار شخص تھے۔

شیخ محمد طٰہٰ نجف کی اتقان المقال صفحہ ۱۹۱ کے مطابق ''وہ ثابت قدم علماء میں سے تھے۔ سب بڑے بڑے فقہاء کا اتفاق ہے کہ ان کی مرسل روایات صحیح ترین مرسلات ہیں۔ تابعین میں ان سے دانا کوئی نہیں تھا۔''

حافظ ذہبی کہتے ہیں: ''وہ بزرگ اور مشاہیر تابعین میں سے ہیں۔ وہ یگانہ روزگار بلند پایہ فقیہ اور علم و عمل دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔''

ڈاکٹر محمد یوسف ان کے بارے میں لکھتے ہیں: '' ان کا علم وسیع اور ان کی شخصیت قابل قدر تھی۔ وہ دین پر ثابت قدم اور حق گو تھے۔ فقہ ان کی رگ رگ میں رچ بس گیا تھا۔''

اس کے بعد لکھتے ہیں: '' متعدد طریقوں سے نقل ہوا ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلوں سے سب سے زیادہ واقف تھے۔ جیسا کہ ان کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ بزرگ تابعی اور بزرگان عالم میں سے تھے۔ تابعین میں ان سے بڑا عالم کوئی نہیں تھا۔''

شیخ محمد خضری کہتے ہیں: ''انہوں نے بڑے بڑے صحابہ سے حدیث سنی تھی۔ قتادہ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''میں نے سعید بن مسیب سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔'' حسن بصری کو جب کوئی مشکل پیش آتی تھی تو سعید بن مسیب کو خط لکھ کر پوچھتے تھے۔''

ڈاکٹر یوسف نے اپنی کتاب کے دوسرے حصوں میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''سعید حدیث کے اولین بزرگوں میں سے تھے اور سرکردہ تابعی علماء میں سے تھے۔ ان کا شمار فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''وہ ان بزرگ قدماء میں سے ہیں جو حدیث، فقہ، عبادت اور زہد وتقویٰ کے جامع تھے۔''

چونکہ انہوں نے عبدالملک کے بیٹوں ولید اور سلیمان کی ولی عہد کی حیثیت سے بیعت کرنے سے انکار کردیا تھا اس لئے خلیفہ نے انہیں تلوار دکھا کر تنبیہ کی۔ ان کو پچاس کوڑے لگائے گئے اور مدینے کے بازاروں میں گھمایا گیا۔ لوگوں کو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے منع کردیا گیا۔

سعید نے اپنی بیٹی عبدالملک کے ولی عہد ولید کو دینے سے انکار کردیا تھا اور اپنے دوستوں اور مریدوں میں سے ایک غریب آدمی ابووداعہ کو اپنا داماد بنالیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: اگر اپنے دل کی آواز کو نظرانداز کر کے ظالموں کے دوستوں پر نگاہ رکھو گے تو تمہارے اعمال بے کار ہوجائیں گے۔

مرزا محمد[۱] اور دوسرے مصنفین رجال نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے تشیع اور اہلبیت سے ان کی محبت کی تائید ہوتی ہے۔ یہ مصنفین ان کو اپنے زمانے میں فقہ اور حدیث کا سب سے بڑا عالم قرار دیتے ہیں۔

اس زمانے کے ایک اور شیعہ فقیہ قاسم بن محمد بن ابی بکر تھے۔ سید حسن صدر[۲] لکھتے ہیں کہ وہ فقہائے مدینہ میں سے تھے۔

ابوایوب سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ طبقہ سوم کے فقہاء میں میں نے کسی کو ان سے بڑھ کر نہیں پایا۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ قاسم امام جعفر صادق علیہ السلام کے نانا تھے کیونکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی والدہ ام فروہ ان کی بیٹی تھیں۔ قاسم کا امام زین العابدین علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح ہوا تھا۔ امام رضا علیہ السلام کی مجلس میں قاسم اور سعید بن مسیّب کا ذکر آیا تو امام نے فرمایا:

''یہ دونوں اس بات کے قائل تھے (یعنی ولایت اہلبیتؑ کے)۔''

کافی میں یحییٰ بن حریز سے منقول ہے کہ وہ کہتے تھے: ''ابوعبداللہ امام صادق

۱۔ منهج المقال في أحوال الرجال ۲۔ تاسیس الشیعہ، نقل از ابن حجر

علیہ السلام نے فرمایا: سعید بن مسیّب، قاسم بن محمد بن ابی بکر اور ابو خالد کابلی، امام علی بن الحسین علیہ السلام کے معتمد علیہ تھے۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ سعید اور قاسم، امام زین العابدینؑ کے دوست تھے۔

شیخ محمد طٰہٰ نجف کہتے ہیں: "قاسم بزرگان تابعین اور فقہائے شیعہ میں سے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین آدمی تھے۔" [۱]

اہلبیتؑ کی بہت سی روایات قاسم کے تشیّع اور ان کے اہلبیتؑ کے معتمد علیہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور یہ بھی کہ وہ امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں تھے۔

شیخ محمد خضری ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "وہ فقہائے مدینہ میں سے تھے اور اسلامی فقہ وفتویٰ کے مراجع میں سے تھے۔"

یحییٰ بن سعید سے منقول ہے: "ہم نے مدینے میں کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جسے ان پر ترجیح دی جاسکے۔"

منقول ہے کہ ابوالزناد کہتے ہیں: "میں کسی فقیہ کو قاسم سے بڑا عالم اور سنت نبوی کا واقف نہیں سمجھتا۔"

ابن عیینہ سے منقول ہے: "قاسم اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔" [۲]

ابن سعد، اپنی طبقات میں قاسم کے بارے میں کہتے ہیں:

"وہ عالم، فقیہ، ثقہ اور متقی تھے۔ انہوں نے بکثرت احادیث روایت کی ہیں۔"

عمر بن عبدالعزیز ان کے بارے میں کہتے ہیں: "اگر مجھے خلافت پر اختیار ہوتا تو میں اعیمش تمیم یعنی قاسم بن محمد کو خلیفہ بنا دیتا۔"

ڈاکٹر محمد یوسف ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "وہ فقہ اور علم کے امام، ثقہ اور متقی تھے۔ انہوں نے بزرگان مدینہ علی (علیہ السلام)، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ سے علم حاصل کیا تھا۔" [۳]

۱۔ اتقان المقال، از ابن خلکان ۲۔ تاریخ التشریع الاسلامی

۳۔ تاریخ الفقہ الاسلامی عن ذھبی ج ۱ ص ۲۹۱

یعقوبی، قاسم بن محمد کو چار اموی حکمرانوں ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز اور یزید بن عبدالملک کی خلافت کے دور کا بڑا فقیہ کہتے ہیں۔

فقہائے شیعہ میں سے ایک اور جو فتویٰ دیتے تھے اور احادیث روایت کرتے تھے، علقمہ بن قیس ہیں۔ انہوں نے چار شیعہ ائمہ کا زمانہ پایا اور ان سے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ جنگ صفین میں امیرالمومنینؑ کی ہمراہی میں لڑتے ہوئے ان کا ایک پاؤں زخمی ہوگیا تھا اور ان کے بھائی ابی بن قیس شہید ہوئے تھے۔

کشی اپنی کتاب اخبار الرجال میں لکھتے ہیں: ''علقمہ بن قیس اپنے مذہب کے عالم، فقیہ اور کتاب اللہ کے قاری تھے۔ وہ شرعی احکام سے واقف تھے۔ ان کے بھائی حرث بھی فقیہ تھے۔''

شہرستانی نے الملل والنحل میں ان کا شمار شیعہ رجال میں کیا ہے۔

علامہ شرف الدین المراجعات میں لکھتے ہیں: ''وہ محدثین کے امام ہیں۔ ابواسحاق جوزجانی نے ان کا ذکر کیا ہے۔''

علامہ شرف الدین اور بعض دوسرے شیعہ محدثین لکھتے ہیں: ''اہل کوفہ میں ایک جماعت تھی جن کے مذہب کو لوگ اُن کے تشیع کے سبب اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس جماعت کے افراد کوفہ میں حدیث کے ممتاز عالم تھے۔''

اس کے بعد علامہ کہتے ہیں: ''یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ علقمہ شیعہ تھے ان کی عدالت اور ان کا مرتبہ اہل سنت کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ اصحاب صحاح ستہ وغیرہ نے ان کی روایت قبول کی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ان کی روایات حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو درداءؓ اور حضرت عائشہؓ سے ہیں اور صرف صحیح مسلم میں حضرت عثمانؓ اور حضرت ابومسعودؓ سے۔ صحیحین میں ان سے ان کے بھتیجے ابراہیم نخعی روایت کرتے ہیں اور صحیح مسلم میں عبدالرحمٰن بن زید، ابراہیم بن زید اور سبیعی۔

محدث قمی نے بھی الکنیٰ والالقاب میں ان کے بارے میں یہی کچھ کہا ہے۔

شیخ محمد خضری علقمہ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''وہ ان فقہائے کوفہ میں سے

تھے جنہوں نے اسلامی فقہ کو وسعت دی۔ وہ عراقی فقیہ تھے۔ رسول اکرمؐ کے زمانۂ حیات میں پیدا ہوئے اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور امام علیؑ احادیث سنیں۔ فقہ کی تعلیم حضرت ابن مسعودؓ سے لی اور ان کے بہترین دوست بن گئے۔ حضرت ابن مسعودؓ ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ "مجھے کوئی ایسی بات معلوم نہیں جو علقمہ نے مجھ سے نہ سیکھ لی ہو۔"

شیخ محمد خضری آگے چل کر لکھتے ہیں: "قاموس بن ابی ظبیان کہتے تھے کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ صحابہ کرام کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس کیوں جاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے بعض صحابہ کو دیکھا ہے کہ وہ بھی علقمہ سے پوچھتے اور ان سے فتویٰ لیتے تھے۔"

شیخ محمد خضری نے تاریخ التشریع الاسلامی میں ذہبی سے نقل کیا ہے: "علقمہ فقیہ اور بلند مرتبہ عالم تھے۔ قرآن مجید بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ ان کی روایات قابل اطمینان تھیں۔ وہ نیک اور متقی آدمی تھے۔"

ڈاکٹر محمد یوسف لکھتے ہیں: "کوفہ کے مکتب فقہ سے جو لوگ نکلے ان میں علقمہ سب سے بڑھ کر تھے۔ اس فقہی مکتب کے استاد اور سرپرست حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔ علقمہ عراق کے فقیہ اور حضرت ابن مسعودؓ کے بہت ہی خاص آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔"[1]

مرزا محمد نے ان کو اپنی کتاب منہج المقال میں بزرگ تابعی، عابد و زاہد، فقیہ کہا ہے اور قاریان قرآن میں ان کا شمار کیا ہے۔ تمام صاحبان رجال نے ان کے تفقہ اور زہد و تقویٰ کی تعریف کی ہے اور ان کا شمار امام علیؑ کے اصحاب میں کیا ہے۔

بزرگ فقہائے تابعین میں سے ایک اور سعید بن جبیر ہیں۔ ہشام بن سالم امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ امام نے فرمایا:

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی میں ذہبی ج ۱ ص ۴۵، خزرجی ص ۲۲۹ اور ابن العماد ص ۸۰ سے نقل کیا گیا ہے۔

''سعید بن جبیر علی بن الحسین علیہ السلام کے پیروکار تھے اور ان کی امامت پر یقین رکھتے تھے۔ وہ امام سجاد علیہ السلام کی تعریف کیا کرتے تھے۔ حجاج نے ان کو فقط شیعہ ہونے کے جرم میں مروا دیا۔ وہ تشیع میں بڑے پختہ تھے۔''

فضل بن شاذان کہتے ہیں: ''ان کے ابتدائی دور میں علی بن الحسین (ع) کے ساتھ پانچ آدمیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ ان پانچ میں ایک سعید بن جبیر تھے۔''

کشی اپنی کتاب اخبار الرجال میں لکھتے ہیں: ''جب سعید بن جبیر حجاج کے پاس پہنچے تو حجاج نے ان سے کہا: تو سعید بن جبیر نہیں تو شقی بن کسیر ہے۔

سعید نے کہا: میری ماں میرا نام بہتر جانتی تھی۔ اس نے میرا نام سعید بن جبیر ہی رکھا تھا۔

حجاج نے پوچھا: تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ وہ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؟

سعید کہا: جب میں جنت میں جاؤں گا تو دیکھوں گا وہاں کون کون ہے۔

حجاج نے پوچھا: تو خلفاء کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

سعید نے کہا: میں ان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

حجاج نے پوچھا: تو ان میں سے کس کو زیادہ پسند کرتا ہے؟

سعید نے کہا: جس سے خدا راضی ہو۔

حجاج نے پوچھا: خدا کس سے زیادہ راضی ہے؟

سعید نے کہا: اس کا حال میرا رب جانتا ہے۔ وہی دلوں کے بھید سے آگاہ ہے

حجاج نے پوچھا: کیا تو میری بات کو سچ نہیں سمجھتا؟

سعید نے کہا: نہیں! میں جھوٹ سمجھتا ہوں۔

ابن حجر نے تقریب سے روایت کی ہے:

''سعید بن جبیر کوفی ثقہ تھے، ان کا حافظہ اچھا تھا، وہ تیسرے دور کے فقہاء

میں سے ہیں۔ حجاج نے سخت تکلیف دیکر انہیں بے قصور قتل کرادیا۔''

ڈاکٹر محمد یوسف نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کوفہ کے بزرگ فقہاء میں سے تھے اور نکتہ سنج تھے۔

میمون بن مہران نے ان کے مرنے کے بعد کہا: ''سعید بن جبیر اس حال میں دنیا سے گئے کہ روئے زمین پر کوئی ایسا نہیں جسے ان کے علم کی ضرورت نہ ہو۔ سعید نے حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے فقہائے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا۔''

تاریخ التشریع الاسلامی میں شیخ محمد خضری انہیں سرکردہ فقہائے کوفہ میں شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ''جب اہل کوفہ حج کے لئے مکہ گئے تو انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے دینی مسائل پوچھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ کیا تمہارے ساتھ سعید بن جبیر نہیں ہیں۔''

یعقوبی نے اپنی تاریخ میں ان کا شمار ان فقہاء میں کیا ہے جو ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک کے دور حکومت میں فتویٰ دیتے تھے۔

سعید تشیع اور اہلبیتؑ سے محبت کے لئے مشہور تھے۔ اسمائے رجال کے مؤلفین اور محدثین میں سے کسی کو ان کے شیعہ ہونے میں شک نہیں۔

فقہائے تابعین میں سے ایک اور حبیب بن ثابت اسدی ہیں۔ علامہ شرف الدین المراجعات میں لکھتے ہیں: '' ابن قتیبہ نے معارف میں اور شہرستانی نے الملل والنحل میں انہیں شیعہ کہا ہے۔ ذہبی نے بھی ان کا ذکر کیا ہے اور ان کے نام پر ایسا نشان لگایا ہے جو اس کی علامت ہے کہ ان کی روایات سے صحاح ستہ میں استدلال کیا گیا ہے۔ دولابی نے محض ان کے تشیع کی بناء پر انہیں ضعیف کہا ہے۔ بخاری و مسلم میں ان کی روایتیں سعید بن جبیر اور ابو وائل کے واسطے سے آئی ہیں۔''

تاریخ الفقہ الاسلامی میں ہے: ''وہ ان فقہاء میں سے ہیں جن کا تعلق کوفہ کے مکتب فکر سے ہے۔ وہ فقیہ تھے۔ حافظہ اچھا تھا اور بات کو صحیح یاد رکھتے تھے۔''

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ وغیرہ سے روایت کرتے تھے۔
سفیان ثوری اور ابوبکر بن عباس وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ ان کے اور حماد بن ابی سفیان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ دو کوفہ کے مانے ہوئے فقیہ تھے۔

منہج المقال میں بھی انہیں کوفہ کا فقیہ کہا گیا ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی جس سے ان کا شیعہ ہونا ثابت ہوتا ہو لیکن ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ ابن قتیبہ، شہرستانی اور دولابی نے ان کا شمار تابعی فقہائے شیعہ میں کیا ہے۔ (المراجعات میں بھی اسی بات کو کافی سمجھا گیا ہے)۔

فقہاء میں سے ایک اور جو تشیع اور حب علی کے لئے مشہور ہیں حارث بن عبداللہ ہمدانی ہیں۔ ذہبی نے ان کو شیعہ کہا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں اور عمرو بن مرہ اور شعبی ان سے روایت کرتے ہیں۔

ابن داؤد ان کے بارے میں کہتے ہیں: ''وہ فقہ کے سب سے بڑے عالم اور فرائض کے ماہر تھے۔''

ابن حجر کہتے ہیں: ''وہ علی (علیہ السلام) کے اصحاب میں سے تھے۔''

شعبی نے حرث اعور کو دروغ گو کہا ہے کیونکہ وہ حضرت ابوبکر، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو امام علی (علیہ السلام) سے افضل نہیں سمجھتے تھے لیکن ان سب لوگوں نے جنہوں نے ان کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جیسے ترمذی، ابن عبدالبر وغیرہ۔ انہوں نے دروغ گوئی کے الزام کو غلط بتایا ہے اور کہا ہے: '' ان کا کوئی جھوٹ ظاہر نہیں ہوا ہے۔ ہاں جو بات معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ محبان علی (علیہ السلام) میں سے تھے اور امام علی علیہ السلام کی دوسروں پر فضیلت کے قائل تھے۔''[1]

محدث شیخ عباس قمی کہتے ہیں: ''حرث اعور بن عبداللہ امام علیؑ کے پرانے اصحاب میں سے تھے۔ وہ فقہ، سنت، فرائض اور حساب سے واقف تھے۔ وہ حساب

۱۔ منہج المقال فی أحوال الرجال، مرزا محمد

کے سب سے بڑے عالم تھے۔ شعبی نے فرائض اور حساب انہیں سے سیکھے۔"[1]

علامہ شرف الدین فرماتے ہیں: "وہ حدیث کے شیعہ راوی اور بزرگ تابعی علماء میں سے تھے۔ فقہ اور فرائض میں اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے۔[2] ابن سیرین کہتے ہیں کہ وہ علم کا خزانہ تھے۔ ابن سیرین کی حضرت ابن مسعودؓ کے چار ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ حرث پانچویں تھے مگر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ حرث ان میں سب سے بہتر اور سب سے نیک تھے۔ اور خدا نے شعبی پر ان ثابت قدم اور ثقہ لوگوں کو مسلط کر دیا جن کو وہ جھٹلایا کرتا تھا اور جن کی توہین کرتا تھا ان ہی لوگوں میں سے ایک ابراہیم نخعی ہیں۔ ان کے بارے میں شیخ محمد طہ نے لکھا ہے کہ وہ حضرت امیر المومنینؑ کے خاص دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے۔"[3]

شیعہ فقہاء میں سے ایک اور بزرگ سلیمان بن مہران اسدی کوفی تھے جو اعمش کے نام سے مشہور تھے۔ کچھ بزرگان اہل سنت نے ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ انہیں ثقہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ شیعہ تھے اور فقہ کے عالم تھے۔ اعمش متعدد بزرگ تابعین سے ملے تھے۔ سفیان ثوری، حفص بن غیاث وغیرہ تابعین نے ان سے روایت کی ہے۔

ان کے مزاج میں ظرافت تھی۔ ایک دن ان شاگردوں سے جو حدیث سننے ان کے پاس آئے تھے مخاطب ہو کر کہا: "اگر میرے گھر میں ایک شخص ایسا نہ ہوتا جس سے میں تم سے بھی زیادہ ناراض ہوں تو میں تمہارے پاس ہرگز نہ آتا۔ ان کا اشارہ اپنی بیوی کی طرف تھا۔"

وہ اپنے زمانے میں کوفہ کے محدث تھے۔ ان سے چار ہزار حدیثیں مروی

۱۔ الکنیٰ والالقاب نقل از ذیل المذیّل، طبری

۲۔ المراجعات نقل از المعارف، ابن قتیبہ اور میزان الاعتدال، ذہبی

۳۔ اتقان المقال نقل از خلاصۃ الرجال، علامہ حلی اور نہج المقال از استر آبادی

ہیں۔ ان کے زمانے میں کوئی ان سے زیادہ حدیثیں بیان نہیں کرتا تھا۔ ان کے متعلق لوگ کہتے ہیں: ''کوفہ میں کوئی ان سے بہتر کتاب اللہ کا عالم نہیں تھا، نہ کوئی ان سے بڑھ کر فصیح اللسان اور حاضر جواب تھا۔''

عیسیٰ بن یونس ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اگرچہ اعمش بہت غریب آدمی تھے مگر میں نے کسی کے سامنے حکام اور دولت مندوں کو اس طرح عاجزی سے پیش آتے نہیں دیکھا جیسا ان کے سامنے۔'' ان کا نام اعمش (چوندھا) اس لئے پڑ گیا تھا کیونکہ انہیں کم بجھائی دیتا تھا اور ہر وقت ان کی آنکھوں سے پانی بہتا رہتا تھا۔[1]

علامہ شرف الدین نے حدیث اور اسمائے رجال کی کتابوں کی بنیاد پر انہیں شیعہ اور ثقہ کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ہشام بن عبدالملک نے کسی کو ایک کاغذ دے کر ان کے پاس بھیجا کہ اس کاغذ پر حضرت عثمانؓ کے مناقب اور امام علی علیہ السلام کے معائب لکھ دیں۔ اعمش نے وہ کاغذ لے کر ایک بھیڑ کے منہ میں دیدیا اور کہا کہ یہ ہے اس کا جواب۔ فرستادہ نے ان سے کہا کہ اگر میں خط کا جواب نہیں لے جاؤں گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ میں مارا جاؤں۔ مجلس میں جو اور لوگ موجود تھے ان سے بھی اس نے سفارش کرائی۔ جب سب نے اصرار کیا تو اعمش نے وہ کاغذ لے کر اس پر لکھ دیا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امابعد! اگر حضرت عثمانؓ میں ساری دنیا کی خوبیاں بھی ہوں تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں اور اگر علیؑ میں دنیا بھر کے عیب ہوں تو تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ لہٰذا تم پر وہ ہے جس میں تمہاری بھلائی ہے اور تمہیں فائدہ پہنچے۔''[2]

اس کے بعد المراجعات میں لکھا ہے کہ اُن کی احادیث کو صحاح ستہ وغیرہ کے مؤلفین نے مستند مانا ہے اور ایسے لوگوں نے ان سے روایت کی ہے جیسے سفیان

۱۔ الکنیٰ والالقاب، محدث قمی نقل از اتقان المقال، ابن خلکان و تاریخ بغداد، خطیب بغدادی

۲۔ المراجعات نقل از ابن خلکان، ابن قتیبہ، وفیات الاعیان۔ ذہبی، الملل والنحل۔ شہرستانی

ثوری، ابن عیینہ اور حفص بن غیاث وغیرہ۔

شہید ثانی کہتے ہیں: ''ہمارے ان دوستوں نے جنہوں نے اسمائے رجال پر کتابیں لکھی ہیں ان کو بھلا دیا۔ وہ آزاد منش آدمی تھے، اپنے عقائد پر پختہ اور صاحب علم وفضل۔ اہل سنت نے اپنی کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے اور گو انہیں شیعہ تسلیم کیا ہے، ان کی تعریف کی ہے۔ رحمہ اللہ[1]

اس دور کے ایک اور شیعہ فقیہ اور مرجع اہل اسلام ابو الاسود دؤلی تھے۔

سید حسن صدر نے جاحظ کا قول نقل کیا ہے: ''ابو الاسود دؤلی جیسے لوگ خال خال ہی ہوتے ہیں۔ ان میں ایجاد کا مادہ بہت تھا اور ہر میدان میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ وہ تابعی ہیں اور ان کا شمار فقہاء، محدثین، شعراء اور اشراف میں ہوتا ہے۔''

محاضرات میں راغب کا قول نقل کیا گیا ہے: ''وہ بڑے فہمیدہ اور عاقل تھے۔ حدیث میں ثقہ تھے۔ شیعہ تھے۔ حاضر جواب تھے۔''

ابوالفرج اصفہانی کہتے ہیں: ''ابو الاسود دؤلی کا شمار بزرگ تابعین میں ہے۔ انہوں نے امام علی علیہ السلام کی رہنمائی سے علم نحو کی بنیاد رکھی۔''[2]

علامہ شرف الدین المراجعات میں فرماتے ہیں: ''صاحبان صحاح ستہ نے ان کی حدیث کو مستند سمجھا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ان کی روایتیں حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ سے آئی ہیں۔ صحاح کی بعض دوسری کتابوں میں ان دو کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی روایتیں ہیں۔ متعدد لوگوں نے ابو الاسود دؤلی سے روایت کی ہے اور یہ احادیث صحیحین میں موجود ہیں۔''

محدث شیخ عباس قمی الکنیٰ والالقاب میں لکھتے ہیں: ''ابو الاسود دؤلی کی دلجوئی کے خیال سے اور انہیں امام علیؑ سے برگشتہ کرنے کی نیت سے معاویہ نے ہمہ اقسام

۱۔ منهج المقال فی أحوال الرجال، مرزا محمد

۲۔ تأسيس الشيعة لعلوم الاسلام، حسن صدر

مٹھائی انہیں تحفے کے طور پر بھیجی۔ ان کی چھوٹی بیٹی نے اس میں سے ایک لقمہ اپنے منہ میں رکھ لیا۔ ابو الاسود نے کہا: یہ زہر ہے جو معاویہ نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے کہ ہمیں اس ترکیب سے امیرالمومنینؑ سے برگشتہ کر دے۔ ان کی بیٹی نے اسی وقت وہ لقمہ تھوک دیا اور کہا کہ خدا اس کا منہ کالا کرے۔ اور پھر کچھ ایسا کیا کہ قے ہوگئی۔"

ابو الاسود دؤلی نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی:

"بیٹا! جب اللہ تعالیٰ تمہیں فراخی عطا کرے تو تم بھی اپنا ہاتھ کشادہ رکھو لیکن جب تنگی ہو تو تم بھی کفایت شعاری اختیار کرو۔ علم کے برابر کوئی عزت نہیں۔ بادشاہ لوگوں پر حکومت کرتے ہیں اور عالم بادشاہوں پر حکومت کرتے ہیں۔"

ایک اور شیعہ فقیہ اور حدیث کے راوی عامر بن وائلہ بن عبداللہ بن عمر لیثی ہیں۔ ابن قتیبہ نے معارف میں ان کا شمار شیعہ راویان حدیث میں کیا ہے۔ ابن عبدالبر اپنی کتاب الاستیعاب کے باب الکنیٰ میں لکھتے ہیں:

"جب امام علی علیہ السلام کوفہ میں تھے تو یہ وہاں آئے اور پھر امام ہی کے ساتھ رہے یہاں تک کہ آپ شہید ہوگئے۔ اس کے بعد عامر مکہ واپس چلے گئے۔ عامر بن وائلہ عالم، دانا، شاعر اور حاضر جواب تھے۔"

جب معاویہ مکہ آئے تو انہوں نے ان سے پوچھا: تمہارے دوست ابوالحسن (علیہ السلام) کے ساتھ تمہارا کس طرح کا تعلق ہے؟

عامر بن وائلہ نے جواب دیا: جیسا مادر موسیٰ کا حضرت موسیٰؑ سے تھا۔

معاویہ نے پوچھا: تم بھی ان میں شامل تھے جنہوں نے عثمانؓ کا محاصرہ کیا تھا؟

عامر بن وائلہ نے جواب دیا: نہیں! البتہ میں اس وقت مدینے میں موجود تھا۔

معاویہ نے پوچھا: تم نے ان کی مدد کیوں نہیں کی؟

عامر بن وائلہ نے جواب دیا: جس وجہ سے تم نے ان کی مدد نہیں کی۔ تم انتظار کرتے اور وقت ضائع کرتے رہے حالانکہ تمہارے ساتھ شامی تھے جو سب تمہاری بات مانتے تھے۔

معاویہ نے پوچھا: تم نہیں دیکھتے کہ میں نے تو ان کے خون کے بدلے کا مطالبہ کیا ہے۔

عامر بن وائلہ نے جواب دیا: تمہاری وہ مثال ہے جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے

لَاَلفَیَنَّکَ بَعدَ المَوتِ تَندُبُنِیَ   وَفِی حَیَاتِیَ مَا زَوَّدتَنِی زَادِیَ

''میں دیکھتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تو ہر وقت میرے لئے روتا رہتا ہے لیکن میرے جیتے جی تو نے کبھی مجھے توشہ نہ دیا۔''

المراجعات میں لکھا ہے: ''زہری، حریری، عبدالملک بن ابجر، قتادہ، ولید بن جمیع، منصور بن حیات، قاسم بن ابی بردہ، عمر بن دینار، عکرمہ بن خالد وغیرہ نے ابو الاسود دؤلی سے روایت کی ہے اور ان راویوں کی حدیثیں صحیح مسلم میں موجود ہیں۔ ابو الاسود دؤلی نے نماز اور دلائل النبوۃ کے بارے میں معاذ بن جبلؓ سے اور قدر کے بارے میں عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے۔ ابو الاسود دؤلی، امام علی علیہ السلام، حضرت حذیفہ بن اسید، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ سے بھی روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ جو شخص مسلم کی احادیث اور ان کی اسناد اور راویوں کا مطالعہ کرے گا اسے معلوم ہو جائے گا۔''

فقہائے شیعہ میں سے ایک اور طاؤس بن کیسان خولانی یمانی ہیں۔

المراجعات میں ہے: اہلسنت قطعی طور پر ان کا شمار شیعہ راویان حدیث میں کرتے ہیں۔ شہرستانی نے اور المعارف میں ابن قتیبہ نے انہیں شیعہ راوی کہا ہے۔ اصحاب صحاح ستہ وغیرہ نے انہیں مستند سمجھا ہے اور ان کی حدیثیں نقل کی ہیں۔ وہ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔''

صحیح بخاری میں ان کی حدیثیں مجاہد، عمر بن دینار اور ان کے بیٹے عبداللہ وغیرہ کے واسطے سے آئی ہیں۔

سید محسن امین کہتے ہیں کہ طاؤس یمانی ابن عباسؓ کے شاگرد اور تابعی ہیں۔

ابن خشبہ کہتے ہیں کہ وہ قرآن مجید کی تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے۔

ابن قتیبہ نے المعارف میں انہیں شیعہ کہا ہے۔ شیخ طوسی نے اپنی اسمائے رجال کی کتاب میں ان کا امام زین العابدینؑ کے ان اصحاب میں شمار کیا ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔[۱]

شیخ خضری فقہائے یمن کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں: "طاؤس بن کیسان غلام تھے۔ انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہ وغیرہ سے احادیث سنیں تھیں۔ وہ علم وعمل کے جامع تھے۔" ان کے بارے میں عمر بن دینار کہتے ہیں: "میں نے طاؤس کے برابر کسی کو نہیں دیکھا۔" قیس بن سعید کہتے ہیں: "ہم میں طاؤس ایسے ہی تھے جیسے اہل بصرہ میں محمد بن سیرین۔" حافظ ذہبی کہتے ہیں: "طاؤس اہل یمن کی برکت اور وہاں کے بزرگ فقیہ تھے۔ ان کی بڑی شان تھی۔"[۲]

شیخ کاظم ساعدی کہتے ہیں: "ہشام بن حکم نے طاؤس سے کہا: مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔ انہوں نے جواب دیا: میں نے امیرالمومنین علی علیہ السلام سے سنا ہے کہ دوزخ میں تپہ (اونچے ٹیلے) کے برابر سانپ اور خچر کے برابر بچھو ہوں گے۔ جو حکمران اپنے لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کریں گے وہ ان کو کاٹیں گے۔" تنقیح المقال میں لکھا ہے کہ ہشام سے انہوں نے جو کچھ کہا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ تھے کیونکہ وہ امام علی علیہ السلام کے نام کے ساتھ امیرالمومنین کا لقب استعمال کرتے ہیں۔ امام علی علیہ السلام کا اس طرح نام لینا اہل سنت کا طریقہ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے سخت پابند اور نیک آدمی تھے۔ علم حدیث میں مشہور ہے کہ بہترین حسن روایت وہ ہے جس کا راوی شیعہ ہو۔[۳]

۱۔ اعیان الشیعہ، جلد اول سید محسن امین

۲۔ تاریخ الفقہ الاسلامی

۳۔ حیاۃ الامام زین العابدینؑ نقل از الکشکول و تنقیح المقال، مامقانی

فقہائے شیعہ میں سے ایک اور ابراہیم بن یزید نخعی کوفی ہیں۔ ابن قتیبہ نے المعارف میں انہیں شیعہ کہا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مسلمات میں سے ہے۔ بخاری اور مسلم میں جو اُن کی احادیث موجود ہیں وہ انہوں نے اپنی ماں کے چچا علقمہ بن قیس وغیرہ سے روایت کی ہیں۔ صحیحین میں ان سے متعدد راویوں نے روایت کی ہے۔[1]

شیخ خضری کہتے ہیں: "ابراہیم بن یزید نخعی عراق کے فقیہ تھے۔ وہ علقمہ، مسروق، اسود وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ حماد ابوسلمہ مشہور فقیہ ان کے شاگرد تھے۔ ابراہیم بن یزید کا شمار مخلص عالموں میں ہے۔" عبدالملک بن ابی سلیمان کہتے ہیں: "میں نے سعید بن جبیر کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ تم لوگ مجھ سے فتویٰ مانگتے ہو حالانکہ تمہارے پاس ابراہیم نخعی موجود ہیں۔"[2]

ان کے بارے میں ڈاکٹر محمد یوسف کہتے ہیں: "ابراہیم بن یزید نخعی اہل رائے کے امام ہیں۔ وہ حماد بن ابی سلیمان کے استاد تھے جو امام ابوحنیفہ کے استاد ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ابراہیم نخعی کو اہل عراق فقیہ مانتے تھے۔ جن لوگوں سے ان کو تلمذ حاصل ہے ان میں علقمہ بن قیس نخعی شامل ہیں۔ یہ زبردست عالم اس بات کے قائل تھے کہ احکام شریعت عقل کے مطابق ہیں اور یہ احکام جن مصلحتوں پر مبنی ہیں ان کو کتاب و سنت سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ فقیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان مصلحتوں کا کھوج لگائے تاکہ یہ بتاسکے کہ احکام کی بنیاد کیا ہے۔ اس معاملے میں ان کی رائے سعید بن مسیب سے مختلف تھی۔ سعید بن مسیب کی کوشش فلسفہ احکام بیان کرنے کے بجائے نصوص و آثار کی تلاش پر مرکوز تھی۔[3]

محدث قمی بھی ان کے بارے میں یہی فرماتے ہیں۔ وہ اس پر اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ شیخ طوسی نے ان کا شمار امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں کیا ہے۔[4]

۱۔ المراجعات صفحہ ۵۲
۲۔ تاریخ التشریع الاسلامی
۳۔ تاریخ الفقہ الاسلامی
۴۔ الکنیٰ والالقاب صفحہ ۲۰۳

مامقانی بھی ان کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات قابل قبول ہے کہ نخعی شیعہ اور نیک آدمی تھے۔ اور شیخ طوسی نے اپنی اسمائے رجال کی کتاب میں جو یہ لکھا ہے کہ ابراہیم نخعی امیرالمومنینؑ اور ان کے پوتے امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں سے تھے یہ بھی صحیح ہے۔[1]

شیعہ فقہاء میں سے ایک اور اسماعیل بن عبدالرحمٰن ہیں جو سدّی کے نام سے مشہور ہیں۔ محدث شیخ عباس قمی کہتے ہیں: "مجاہد، قتادہ، شعبی اور مقاتل کی طرح وہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق کرتے تھے۔" شیخ طوسی ان کا شمار امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ کے اصحاب میں کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ سدّی راست گو تھے۔ گو ان پر تشیع کا الزام تھا۔ سیوطی نے اتقان المقال میں لکھا ہے: "اسماعیل سدّی کی تفسیر بہترین تفسیر ہے۔" ثوری، شعبہ، یحییٰ بن سعید قطان جیسے ائمہ فقہ و حدیث ان سے روایت بیان کرتے ہیں۔[2]

صاحب المراجعات لکھتے ہیں کہ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں انہیں شیعہ بتلایا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "ثوری، ابوبکر بن عیاش اور اس طبقے کے دوسرے افراد نے کثیر تعداد میں ان سے علم حاصل کیا۔ مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے ان کی حدیث قبول کی ہے۔ احمد بن حنبل نے ان کو ثقہ کہا ہے۔ ابن عدی ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ راست گو ہیں۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو سدّی کا ذکر برائی کے ساتھ کرتا ہو۔ ایک دفعہ سدّی قرآن مجید کی تفسیر بیان کر رہے تھے کہ وہاں سے ابراہیم نخعی گزرے۔ کہنے لگے کہ یہ وہی تفسیر بیان کرتے ہیں جو قوم (مسلمانوں) کی تفسیر ہے۔

۱۔ حیاۃ الامام زین العابدینؑ، شیخ کاظم ساعدی نقل از تنقیح المقال

۲۔ الکنیٰ والالقاب صفحہ ۲۸۰

سید حسن صدر تاسیس الشیعة لعلوم الاسلام میں لکھتے ہیں: "وہ امام سجادؑ کے اصحاب میں سے تھے ۔ ابن قتیبہ نے المعارف میں اور ابن حجر عسقلانی نے تھذیب التھذیب میں ان کے تشیع کی تصریح کی ہے۔"

نجاشی اور ابوجعفر طبرسی نے ان کا شمار شیعہ مؤلفین میں کیا ہے۔ علامہ سید محسن امین نے بھی اعیان الشیعہ جلد اول میں ان کے بارے میں وہی کچھ کہا ہے جو ہم نے دوسرے بزرگوں کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں: "اسماعیل بن ابی خالد کہتے ہیں کہ سدی قرآن مجید کے شعبی سے زیادہ بڑے عالم ہیں۔"

اس دور کے ایک اور شیعہ محدث عمر بن عبداللہ ابواسحاق سبیعی ہیں۔ علامہ شرف الدین المراجعات میں لکھتے ہیں: "ابواسحاق ان قدیم بزرگوں اور محدثوں میں سے ہیں جن کے مذہب کے اصول وفروع ناصبیوں کو اس لئے ناپسند ہیں کہ یہ بزرگ اہلبیت کی روشنی میں چلتے ہیں اور دین کے معاملے میں ان کی پیروی کرتے ہیں۔"

المراجعات[۱] میں ہے کہ جوزجانی نے میزان الاعتدال سے زبید الیامی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "اہل کوفہ میں ایک گروہ ایسا تھا جس کے مذہب کو لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ اس گروہ میں کوفہ کے بڑے بڑے محدثین شامل تھے جیسے ابو اسحاق سبیعی، منصور، زبید، اعمش وغیرہ لیکن ان محدثین کی نقل حدیث میں راست گوئی کی بنا پر لوگ ان کی احادیث قبول کرتے تھے۔" ابواسحاق علم کے دریا اور احکام خداوندی کے پابند تھے۔ اصحاب صحاح ستہ وغیرہ نے ان کی حدیث کو قبول کیا ہے۔ بخاری ومسلم میں جو اُن کی حدیثیں آئی ہیں وہ انہوں نے حضرت براء بن عازبؓ، حضرت زید بن ارقمؓ، حضرت سلیمان بن صردؓ وغیرہ سے روایت کی ہیں۔

محدث شیخ عباس قمی ان کے بارے میں کہتے ہیں: "وہ ایک بزرگ تابعی تھے۔ انہوں نے چالیس سال تک صبح کی نماز اول شب کے وضو سے پڑھی۔ اور ہر

۱۔ یہ کتاب اردو میں مذہب اہلبیتؑ کے نام سے دار الثقافة الاسلامیہ کراچی نے شائع کی ہے

رات ایک قرآن مجید ختم کیا۔ ان کے زمانے میں ان سے زیادہ عبادت گزار اور شیعوں اور سنیوں دونوں کے نزدیک حدیث میں ان سے زیادہ ثقہ کوئی اور نہیں تھا۔ امام زین العابدینؑ ان کو قابل اعتماد سمجھتے تھے۔ انہوں نے امام علیؑ، حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرام کو دیکھا تھا۔ اعمش، ثوری شعبہ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔"[1]

شیخ محمد طٰہٰ نجف ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "وہ بزرگ تابعین میں سے تھے۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کی شب شہادت میں پیدا ہوئے۔ امام زین العابدینؑ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں کوئی ان سے زیادہ عبادت گزار اور شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک حدیث میں ان سے زیادہ ثقہ نہیں تھا۔"[2]

فقہائے شیعہ میں سے ایک اور شریک بن عبداللہ بن سنان نخعی ہیں۔ ابن قتیبہ نے ان کا شمار شیعہ راویوں میں کیا ہے۔ اپنی کتاب المعارف میں لکھا ہے کہ ان کا تشیع مسلمات سے ہے۔ عبداللہ بن ادریس قسم کھاتے تھے کہ شریک شیعہ ہیں۔ جیسا کہ شریک کے حالات کے خاتمے پر میزان میں لکھا ہے۔ میزان میں یہ بھی ہے کہ ابوداؤد رہاوی کہتے تھے کہ میں نے شریک کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "علی (علیہ السلام) خیر البشر ہیں۔" جو شخص ان کی سیرت اور روش کا مطالعہ کرے گا اسے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ محبان اہلبیت میں سے تھے۔ اور انہوں نے محبان اہلبیت سے بکثرت احادیث روایت کی ہیں۔ ان کے فرزند عبدالرحمٰن کہتے ہیں: "میرے والد کے پاس جابر جعفی کے بیان کردہ دس ہزار مسائل اور دس ہزار غرائب تھے۔" عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں: "شریک کوفیوں کی حدیث کے بارے میں سفیان ثوری سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے۔ وہ امام علی علیہ السلام کے دشمنوں کے

۱۔ الکنیٰ والالقاب

۲۔ اتقان المقال نقل از ابن خلکان وغیرہ

دشمن تھے اور انہیں برا کہتے تھے۔ ان کی مجلس میں ایک دفعہ کسی نے معاویہ کی بردباری کی تعریف کی۔ انہوں نے کہا کہ جو حق کو نہ پہچانے اور علی بن ابی طالبؑ سے لڑے اسے بردبار نہیں کہا جاسکتا۔" ذہبی نے ان کو علم کا خزانہ، حافظ اور راست گو کہا ہے۔ شریک نے اسحاق ازرق سے نو ہزار حدیثیں سن کر یاد کیں۔ مسلم اور اصحاب سنن اربعہ[1] نے ان کی حدیث کو قبول کیا ہے۔ محدث شیخ عباس قمی نے بھی ان کی ایسی ہی تعریف بیان کی ہے۔[2]

تاریخ الفقه الاسلامی صفحہ ۱۵۰ پر ان کا ذکر کوفہ کے ان فقہائے تابعین کے ضمن میں آیا ہے جو اپنے زمانے میں مسند افتاء پر متمکن تھے۔

گزشتہ بیان سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ تابعین کے زمانے میں احکام کے بیان حدیث کی روایت اور افتاء میں شیعوں کا کافی حصہ تھا۔ وہ اپنے زمانے میں مسلمانوں کا مرجع رہے ہیں۔ ان کے ہم عصر اور بعد کے فقہاء ومحدثین نے ان سے علم حاصل کیا ہے۔ تشیع کو نیست و نابود کرنے کی نیت سے اس دور کے حکمران عقیدہ اور عمل کے ہر میدان میں ان پر سختی کرتے تھے اور کنٹرول رکھتے تھے۔ یہ حکمران اپنے سیاسی عزائم اور مقاصد کے لئے ہر گروہ سے کام لیتے تھے لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود انہیں مکمل کامیابی نصیب نہیں ہوسکی۔ یہاں وہاں اسلام سے متعلق مختلف علمی اور عملی میدانوں میں شیعہ برابر چمکتے رہے۔ اس دور میں شیعہ فقہاء اپنے فقہی نظریات میں تشیع کا رنگ اس طرح نمایاں نہیں ہونے دیتے تھے جس طرح صحابہ کرام یا امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں نمایاں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حکام کی توجہ ان سے ہٹی رہی اور انہیں موقع مل گیا کہ وہ لوگوں سے مل کر فقہی مسائل کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرسکیں اور اپنی احادیث سنا سکیں۔ اس کی تائید محمد بن عمرو بن عبدالعزیز کشی کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ حجاج نے یحییٰ بن ام طویل کو بلا کر کہا:

"اگر تو علی (علیہ السلام) پر لعنت کرے تو تجھے چھوڑ دیا جائے گا"

۱۔ المراجعات ۲۔ الکنیٰ والالقاب

جب انہوں نے اس سے انکار کیا تو حجاج نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور قتل کر دیا جائے سعید بن مسیب البتہ حجاج کے ہاتھ سے بچ گئے کیونکہ وہ اہل سنت کے عقیدے کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ وہ اصحاب رسولؐ کی آخری نشانی اور اپنے زمانے کے مشہور ترین مفتیوں میں سے تھے۔

رجال کشی میں ہے کہ ابو خالد کابلی نے بھاگ کر مکہ میں پناہ لی۔ ایک اور شیعہ فقیہ عامر بن واثلہ نے عبدالملک کے پاس پناہ لی کیونکہ ان کا وہاں اثر و رسوخ تھا۔

اموی دور میں حکمران طبقے کو سب سے زیادہ تشیع ہی کی فکر رہتی تھی کیونکہ شیعہ مذہب کی بنیاد ہی اس عقیدے پر تھی کہ جو حکومت بھی اسلام کے بنیادی احکام پر عمل نہ کرے اس کے خلاف انقلاب برپا کیا جائے اور اس کے اقتدار کو تسلیم نہ کیا جائے۔[1]

جب مسلمانوں کا ان قوموں سے رابطہ قائم ہوا جن کے خلاف انہوں نے جنگیں لڑی تھیں تو مسلمانوں کی سوچ میں عقلی انداز پیدا ہونے لگا اور عربوں کے خیالات پر غیر قوموں کا اثر پڑا۔ اس دور میں سب اسلامی فرقوں میں شیعہ وہ فرقہ تھا جس کا طرز فکر قرآن مجید اور سنت رسولؐ کے عین مطابق تھا۔

"اختیار" کا شیعہ عقیدہ جس کے مطابق انسان خود اپنی زندگی بناتا اور بگاڑتا ہے اور وہ خود اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، کسی عمل میں وہ مجبور نہیں، ایسا عقیدہ ہے جو حکمران کو اس کے تمام اعمال و افعال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اسی طرح عدل کا عقیدہ ہے جس کے مطابق خدا کا بندوں پر ظلم کرنا محال ہے اور اس لئے گناہگاروں اور غیر گناہگاروں کو ان کے اعمال کا یکساں بدلہ نہیں دیا جاسکتا۔ قرآن مجید میں ہے: "جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھے گا۔" اگر ایسا نہ ہو تو یہ بندوں پر خدا کا ظلم ہوگا۔ یہ دونوں عقیدے

۱۔ رفض کا مطلب رد کرنا ہے۔ چونکہ شیعہ اپنی پوری تاریخ میں اسلام کے بنیادی احکام پر عمل نہ کرنے والی ظالم حکومتوں کے احکامات کو رد کر دیتے تھے اس لئے ان کا نام رافضی پڑ گیا۔ ملوکیت کے حاشیہ بردار آل محمدؐ کے شیعوں کو رافضی کہتے تھے جیسا کہ امام شافعیؒ کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

لَوْ کَانَ رِفْضًا حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ ۔۔۔ فَلْیَشْهَدِ الثَّقَلَانِ اِنِّیْ رَافِضٌ

اسلامی فرقوں میں بحث وتمحیص کا موضوع بن گئے۔"

ان دونوں عقیدوں ۔کے بارے میں شیعوں نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جسے قرآن اور حدیث کی تائید حاصل تھی۔ ان کی رائے میں ہر انسان چاہے وہ حکمراں ہو یا کوئی اور اپنے تمام کاموں اور کارروائیوں کا ذمہ دار تھا۔ غیر شیعوں نے ان دونوں عقیدوں کے بارے میں وہ راستہ اختیار کیا جو حکمرانوں کی ہوا پرستی، ان کے رجحان اور ان کی خواہشات کے مطابق تھا۔ وہ حکمرانوں کو ان کی اپنے سیاسی مخالفین پر تمام ترسختی اور تشدد کے باوجود بے گناہ تصور کرتے تھے۔

جب اموی حکمران اور ان کے حکام لوگوں کے خیالات کو بدلنے اور ان کے عقائد کو خریدنے کی پوری کوشش کررہے تھے، انہوں نے کچھ شیعہ فقہاء اور دانشوروں جیسے یحیٰ بن ام طویل اور سعید بن جبیر وغیرہ کو توقتل کرادیا اور دوسروں کی سخت نگرانی شروع کردی اور ان پرسختی بھی کی تاکہ لوگ حکومت کی اطاعت کریں اور اموی خلافت کو جائز تسلیم کرلیں۔

اس دباؤ کے دور میں بعض افراد حجاج اور دوسرے ظالم گورنروں کے پنجے سے بچ بھی گئے جیسے سعید بن مسیتب اور قاسم بن محمد وغیرہ جو کبھی کبھی اہل سنت کے عقیدے کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ اس ترکیب سے انہوں نے اپنی اس علمی اور فکری زندگی کو باقی رکھا جس کے آثار اس دور کے مسلمانوں کی زندگی میں نمایاں ہوچکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کے شیعہ فقہاء کی اپنی ایک خاص روش تھی جس کا اس سے پہلے اور اس کے بعد کے دور میں کوئی وجود نہ تھا۔ اس سے پچھلے یعنی صحابہ کرام کے دور میں تو ہر صحابی اسی کے مطابق فتویٰ دیتا تھا جو اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا تھا۔ اسی طرح جو حدیث اس نے سنی تھی وہی بیان کرتا تھا۔ اس زمانے میں کسی کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ تمام راویوں اور مفتیوں کے طرز عمل کو کنٹرول کرسکے۔ پھر بھی اس دور میں شیعہ فقہاء کی رائے، جیسا کہ ہم نے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی فقہ میں تشیع کے کردار پر بحث کرتے ہوئے بیان کیا، صرف چند مسائل میں ہی ظاہر ہوسکی۔

لیکن تابعین سے بعد کے دور میں جس کا آغاز امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے آخری ایام سے ہوتا ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی پوری زندگی پر محیط ہے، ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ یہ ممکن ہوگیا کہ شیعہ اصول و فروع اسلام سے متعلق اپنی رائے علانیہ طور پر بیان کرسکیں۔ ان میں اور دوسرے فقہاء اور فلاسفہ میں گفتگو اور بحث و مباحثہ عام ہونے لگا۔ فقہ، کلام، دوسرے موضوعات اور ان شبہات پر جو مفتوحہ علاقوں کے تمدن سے رابطہ قائم ہونے پر مسلمانوں میں پیدا ہوگئے تھے خوب خوب گفتگو اور مباحثے رہتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے حلقہ درس میں ہزاروں طالب علم دور دور سے آکر جمع ہوگئے اور امام کا درس فقہ اور حدیث لاکھوں انسانوں تک پہنچ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ مذہب کو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

بہرحال تابعین اور تبع تابعین کے دور میں شیعہ فقہاء اور محدثین کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی۔ مکہ، مدینہ، کوفہ اور دوسرے بڑے اسلامی شہروں میں فقہ کی تعلیم کا بوجھ ان ہی کے کاندھوں پر تھا۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ تابعین کے زمانے میں تشیع خوب پھیل گیا تھا اور ابان بن تغلب کے حالات میں یہ بیان کرنے کے بعد کہ متعدد بزرگوں نے جن میں ابن حنبل، ابن معین اور ابوحاتم شامل ہیں، ان کی توثیق کی ہے لکھا ہے: "اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک بدعتی ثقہ کیسے ہوسکتا ہے؟ عدالت، ثقاہت اور محکم عقیدہ بدعت کے ساتھ جمع کیسے ہوسکتا ہے؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بدعت صغیرہ ہے جیسے تشیع میں غلو یا تشیع غلو اور انحراف کے بغیر۔ یہ بدعت تابعین اور تبع تابعین میں عام تھی۔ گو وہ دیندار، متقی اور

صادق القول تھے۔ اگر ایسے لوگوں کی حدیث رد کر دی جائے تو احادیث رسولؐ کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس کی قباحت ظاہر ہے۔[1]

جو شخص ان فقہی مجموعوں پر نظر غائر ڈالے گا جو تابعین کے بعد تالیف ہوئے جیسے مؤطا امام مالک جو فقہ میں پہلی کتاب ہے اور ابو جعفر منصور عباسی[2] کی ہدایت پر تالیف کی گئی، وہ یہ دیکھے گا کہ فقہ کے اکثر ابواب میں سعید بن مسیب، قاسم بن محمد اور سعید بن جبیر جیسے شیعہ فقہاء کی رائے پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان کی رائے کو حجت تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ شیعہ فقہاء کی آراء مؤطا امام مالک سے چھانٹ لیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔

اگر ہم غیر شیعہ فقہاء کی زندگی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ تابعین کے دور میں یا اس کے بعد جو لوگ فقیہ مشہور ہوئے انہوں نے فقہ کی تعلیم یا تو علی بن ابی طالب علیہ السلام، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابن میتبؓ وغیرہ سے حاصل کی تھی یا ان موالی اور تابعین سے جو اُن حضرات کے شاگرد تھے۔ خاص طور پر تمام متقدمین اور ان کے بعد آنے والوں نے امام علی علیہ السلام اور ان کے چچازاد بھائی حبر امت ابن عباسؓ سے ہی فیض حاصل کیا تھا۔

۱۔ اعیان الشیعہ، جلد اول سید محسن امین

۲۔ تاریخ الفقہ الاسلامی صفحہ ۱۷۲

تابعین کے دور میں احکام کے مآخذ

تابعین کے دور میں احکام کے مآخذ یا دلائل احکام صحابہ کرام کے زمانے سے مختلف نہیں تھے۔ قرآن و سنت تو ہر دور ہی میں احکام کا سرچشمہ رہے ہیں کیونکہ احکام معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے ان ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد دو اور مآخذ اجماع اور قیاس وجود میں آگئے۔ شیعہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ ان دو مآخذوں سے کام نہیں لیتے تھے سوائے ایسی صورت کے کہ قرآن و سنت سے احکام کا معلوم کرنا ممکن نہ ہو۔

شیخ محمد خضری تاریخ التشریع الاسلامی میں لکھتے ہیں:

''حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کچھ لوگوں کو بلا کر ان سے مشورہ کرتے تھے۔ اگر ان سب کا کسی بات پر اتفاق رائے ہو جاتا تو اس کے مطابق فتویٰ دے دیتے تھے اور اس کو اجماع کہتے تھے۔ لیکن اگر اتفاق رائے نہ ہو پاتا تو مسئلے کے مختلف پہلوؤں اور مصالح پر غور کے بعد جس فقیہ کی جو ذاتی رائے ہوتی وہ اسی کے مطابق فتویٰ دیتا تھا۔ اس طرح قیاس وجود میں آیا جس پر صحابہ کرام اعتماد کرتے تھے۔ اور انہوں نے اس کو دلائل احکام میں سے تسلیم کر لیا تھا۔ کچھ تابعین نے قیاس کے اصول پر عمل کرنے میں شہرت حاصل کر لی تھی اور پھر احناف کے نزدیک تو خاص طور پر یہ احکام معلوم کرنے کا ایک قابل اعتماد ذریعہ قرار پا گیا۔''

قیاس کی ابتداء حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں ابوموسیٰ اشعری کو لکھا: ''ملتی جلتی مثالوں پر غور کرو۔ پھر ایک معاملے کا دوسرے معاملے پر قیاس کرو۔''

رسول اکرمؐ کے زمانے میں قیاس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ کسی صحابی نے حضرت عمرؓ سے پہلے یہ کام کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ جس کسی کام میں بھی مصلحت دیکھتے تھے اسی کو اختیار کرلیتے تھے۔ انہوں نے زکوٰۃ میں سے بھی **مؤلفۃ القلوب** کا حصہ بند کردیا تھا حالانکہ نص قرآنی ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ

''صدقات صرف غریبوں، محتاجوں اور ان کارکنوں کا حق ہے جو اُن صدقات (کی وصولی) پر مقرر ہیں اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے۔ اور صدقات کو صرف کیا جائے گردنوں کو چھڑانے میں اور قرضداروں کا قرضہ ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی امداد میں۔ یہ حقوق خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔'' (سورۂ توبہ: آیت ۶۰)

عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں ان کے پاس آئے اور کہا: اے خلیفہ رسول! ہمارے پاس بنجر زمین ہے جس میں پانی اور گھاس نہیں ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو وہ زمین ہمیں دیدیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے وہ زمین علیحدہ کر کے انہیں دیدی اور عطائے زمین کی سند بھی لکھ دی اور اس پر گواہی کرادی۔ جب یہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو انہوں نے سند کا مضمون سننے کے بعد وہ سند ان سے واپس لے لی اور اسے تھوک سے مٹا کر کہا: جب اسلام کے حامی کم تھے اور اسلام کمزور تھا اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم پر مہربانی کی تھی۔[1] (اب اس کی ضرورت نہیں)۔

۱۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۱۰۸ النص والاجتہاد علامہ سید شرف الدین

جب مسلمانوں نے سرزمین عراق کو بزور شمشیر فتح کیا تو حضرت عمرؓ نے وہاں کی زمین عراقیوں کے لئے چھوڑ دی اور یہ طے کردیا کہ وہ ایک مقررہ حصہ بیت المال کو ادا کیا کریں۔ حضرت عمرؓ کی دلیل یہ تھی کہ یہ زمین فاتح لشکر میں تقسیم کردی گئی تو پھر حکومت کے لئے کوئی ایسا ذریعۂ آمدنی نہیں رہے گا جس سے لشکر، آبادکاری، تعلیم وغیرہ کے اخراجات پورے کئے جاسکیں۔ چنانچہ یہ زمین عراقیوں کی اور ان کی آنے والی نسلوں کی ملکیت بن گئی۔ جب مفتوحہ علاقوں سے آمدنی اور مال غنیمت میں مزید اضافہ ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے حکومت کا ٹیکس بھی انہیں معاف کردیا حالانکہ یہ زمین مال غنیمت میں داخل تھی اور اسلامی قانون کے بموجب غنیمت کا پانچواں حصہ (یعنی خمس[1]) امام کا ہے اور باقی چار حصوں کے مالک وہ لوگ ہیں جنہوں نے متعلقہ علاقہ فتح کیا ہو۔ (ڈاکٹر یوسف کی تاریخ الفقہ الاسلامی اور شیخ خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی میں بھی اس کی تصریح ہے)۔

حضرت عمرؓ نے ازدواج موقت یعنی متعہ کی بھی ممانعت کردی تھی حالانکہ متعہ نکاح کی ان دو قسموں میں سے ایک تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں موجود تھیں۔ اسی طرح ایک ہی وقت میں تین طلاقوں کو جاری کیا حالانکہ وہ خود اعتراف کرتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ایک ہی طلاق قرار دیا تھا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے موقعوں پر انہوں نے اپنی رائے کے مطابق فتویٰ دیا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب وہ مصلحت باقی نہ رہے جس کی بناء پر ابتدا میں کوئی حکم دیا گیا تھا اور کچھ نئی مصلحتیں وجود میں آجائیں تو ان نئی مصلحتوں پر

۱۔ جیسا کہ یہ آیت اس پر نص ہے وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ''اور جان رکھو کہ مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ خدا کا اور اس کے رسولؐ کا اور ان کے قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔'' (سورۂ انفال: آیت ۴۱)

توجہ کرنا اور ان کے مطابق عمل کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس سے نص قرآنی منسوخ نہیں ہوتا۔

استاد خالد محمد خالد کہتے ہیں: حضرت عمرؓ جب کوئی مصلحت دیکھتے تو وہ قرآن و سنت کی مقدس نصوص کو چھوڑ دیتے تھے۔ انہی نصوص میں سے ایک مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبِ کے بارے میں قرآن مجید کا حکم ہے۔ جن کی تالیف قلوب منظور ہو ان کے لئے قرآن نے زکوٰۃ میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے۔ رسول اکرمؐ اور حضرت ابو بکرؓ کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مگر حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں کہا کہ مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبِ کو زکوٰۃ میں سے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ اس طرح رسول اکرمؐ اور حضرت ابو بکرؓ نے اُمّ ولد (وہ کنیز جس سے اولاد ہوئی ہو) کو بیچنے کی اجازت دی تھی مگر حضرت عمرؓ نے اسے حرام قرار دیا تھا۔ اسی طرح سنت اور اجماع کا حکم یہ ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کیا جائے مگر حضرت عمرؓ نے سنت اور اجماع کے اس حکم کے برخلاف حکم جاری کیا۔[1]

درحقیقت اس قسم کے اجتہاد کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن و سنت کا حکم دریافت شدہ مصلحتوں کے ساتھ مقید اور صرف ایک محدود مدت کے لئے ہے حالانکہ اس کے وہ بھی قائل نہیں جو مصالح مرسلہ اور استحسان کو دلائل احکام میں شمار کرتے ہیں کیونکہ استحسان کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک قیاس کو چھوڑ کر اس سے زیادہ قوی قیاس کو اختیار کیا جائے۔[2] اور مصالح مرسلہ جن کو غزالی استصلاح سے تعبیر کرتے ہیں، وہ مصلحتیں ہیں جن کے بارے میں شارع نے کوئی حکم نہ دیا ہو اور ان کو قبول کرنے یا رد کرنے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہ ہو۔[3] جو لوگ مصالح مرسلہ اور استحسان کے

۱۔ الدیمقراطیہ ص ۱۵۰ (The Democracy) استاد خالد محمد خالد

۲۔ ابطال القیاس ص ۵۰، از ابن حزم

۳۔ مقدمہ بر النص والاجتهاد از سید محمد تقی الحکیم نقل از خلاصة التشریع الاسلامی و علم اصول الفقه

قائل ہیں ان کے نزدیک بھی یہ جائز نہیں کہ احکام کے معاملے میں بلا استثنٰی ان پر اعتماد کیا جائے۔ البتہ جس مسئلے کے بارے میں کتاب وسنت میں حکم نہ مل سکے وہاں ان دو اصولوں سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن جہاں کتاب وسنت میں کوئی حکم صراحت کے ساتھ اور بغیر کسی قید وشرط کے موجود ہو وہاں اجتہاد کا جواز ثابت کرنا مشکل ہے

افسوس کی بات یہ ہے کہ کتاب وسنت کی بہت زیادہ عمومی اور مطلق دلیلوں کی موجودگی کے باوجود اس قسم کے اجتہاد سے انہیں بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا البتہ جس اجتہاد کے بغیر چارہ نہیں وہ حوادث واقعہ یعنی نئے پیش آمدہ امور کے بارے میں ہے۔اس کی صورت یہ ہے کہ چونکہ مسائل اور ضرورتیں بے شمار ہیں اس لئے بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی متعلقہ نص کا مطلب معین نہیں ہوتا یعنی اس کے دو یا دو سے زیادہ مطلب ہوسکتے ہیں اور کوئی مطلب بھی شارع کی غرض کے منافی نہیں ہوتا، ایسی صورت میں نص کا مطلب متعین کرنے کے لئے اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن یہ اجتہاد صرف نص کا مقصد سمجھنے اور مختلف معنوں میں سے ایک معنی کے انتخاب کے لئے ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ پوری کوشش کرے کہ نص کا صحیح مفہوم متعین کرے اور نص کے لغوی معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصول فقہ کے قواعد سے استفادہ کر کے ظاہر کلام کے معنی سمجھے۔ اگر کوئی ایسا واقعہ ہو کہ کسی نص کے عموم کا بھی اس پر اطلاق نہ ہوسکتا ہو اور نہ اس کے بارے میں فقہاء کا اجماع موجود ہو تو اس صورت میں مجبوراً فقیہ کو اپنے اجتہاد سے رائے قائم کر کے فتویٰ دینا پڑتا ہے یا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں بھی قواعد عمومی اور اصول شرعی وعقلی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ رائے سے فتویٰ دینے یا فیصلہ کرنے کی یہ وہ صورتیں ہیں جن کی طرف معاذ بن جبلؓ والی حدیث میں ، بشرطیکہ یہ حدیث صحیح ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ کیا ہے، ان کے کام کی تعریف کی ہے اور خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ اس نے فرستادۂ رسول کو توفیق دی ہے کہ جس طرح خدا

اور اس کا رسولؐ چاہتے ہیں وہ اسی طرح کام کرتا ہے۔ اس حدیث سے قیاس اور استحسان کا ثبوت نہیں ملتا۔ گو جو لوگ قیاس اور استحسان کے قائل ہیں وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

بہرحال فقہائے صحابہ کے زمانے میں اجتہاد وجود میں آیا اور اسی کے آثار آیات احکام کی تطبیق، احادیث کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت اور صحابہ کرام کے فتوؤں اور فیصلوں میں ظاہر ہوئے۔ اسی سے نوبت قیاس اور استحسان تک پہنچ گئی جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے جو اس سے پہلے ہم نے صحابہ کرام کے اجتہاد کی دی ہیں۔ لیکن صحابہ کے فتوؤں اور فیصلوں میں قیاس کا عمل اتنا زیادہ نمایاں نہیں تھا جتنا تابعین اور تبع تابعین کے دور میں ہوگیا۔ تابعین کے زمانے میں یہ عمل فقہائے عراق میں بہت عام ہوگیا یہاں تک کہ وہ اہل رائے ہی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ اس کے برخلاف فقہائے حجاز اہل حدیث کہلائے۔ اس صورت حال کا بڑا سبب ایران، روم، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی ایک نئی زندگی کا وجود میں آنا تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ ان علاقوں میں سے ہر ایک کا اپنا ایک خاص تمدن تھا اور ہر علاقے کی کچھ اپنی خصوصیات تھیں۔ اس سادہ اور پرسکون زندگی میں جو رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام اس وقت کی محدود دنیا میں گزارتے تھے اور اس زندگی میں جس کا سامنا فقہاء کو رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام کے دور کے بعد ہوا، زمین آسمان کا فرق تھا۔ اب مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں اسلام دور دور تک پھیل گیا تھا۔ فاتح عربوں کا ان علاقوں کے رسم و رواج اور وہاں کے اقتصادی اور اجتماعی نظام سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اس کا اثر عربوں کی زندگی پر ہی نہیں بلکہ ان کی سوچ پر یہاں تک کہ ان کے قرآن و سنت کے سمجھنے پر بھی پڑا۔ فقہ میں توسیع و ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں تو فقہاء اور محدثین نے بھی اپنی اس کوشش میں اضافہ کردیا کہ کتاب و سنت کے عمومی

قواعد کو ان حوادث اور واقعات سے تطبیق دیں جو اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لئے محسوس ہوئی کہ رسول اکرمؐ سے جو احکام اور فیصلے منقول تھے ان کا تعلق خاص خاص موقعوں سے تھا اور گو کتاب و سنت میں عام قواعد بھی موجود تھے اور رسول اکرمؐ نے بھی بعض حوادث و واقعات سے متعلق کلی قواعد بیان کئے تھے، لیکن اب حالات بدل جانے کے باعث مسلمانوں کو بالکل مختلف صورت حال کا سامنا تھا۔

اس نئی صورت حال کے باعث یہ ضروری ہوگیا تھا کہ علماء اور مفتی حضرات اسلامی نصوص کو تلاش کرنے اور ان کا مفہوم سمجھنے کی کوشش میں اضافہ کریں تاکہ جو کلی اصول کتاب وسنت میں آئے ہیں ان کو ان جزوی واقعات سے تطبیق دے سکیں جو بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ پیش آرہے تھے۔ یہ ضرورت رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ کے دوران میں اور صحابہ کرام کے دور میں محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس مدت میں صورت حال میں کوئی معتدبہ تغیر نہیں ہوا تھا لیکن تابعین کے دور میں کچھ اور صورت پیدا ہوگئی تھی جس کی وجہ سے فقہاء کے رائے اور اجتہاد پر عمل کرنے میں وسعت پیدا ہوئی۔ خصوصاً وہ فقہاء جو حجاز سے باہر تھے اجتہاد سے زیادہ کام لینے لگے اور عراق کے فقہاء تو اہل رائے ہی مشہور ہوگئے۔[1]

ان حالات میں اجتہاد کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جب تک علماء قرآن و سنت کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں اور اس نبیؐ کی سنت پر عمل کریں جو ہوائے نفسانی سے کوئی بات نہیں کہتا تو اسلام اپنی فطرت کے مطابق کسی کو اپنی رائے کے استعمال سے نہیں روکتا۔

بہرحال جس اجتہاد نے فقہائے تابعین میں رواج پایا اور جس نے تابعین کے طریقے کو صحابہ کے طریقے سے جدا کیا وہ بظاہر قرآن وسنت کے راستے سے ہٹ کر

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی صفحہ ۲۸

کوئی چیز نہیں تھی۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ قرآن و سنت کو سمجھ کر ان کے اصولوں کو نئے واقعات پر منطبق کیا جائے۔ چونکہ ان واقعات کا رسول اکرمؐ اور صحابہ کے ابتدائی دور میں بالعموم وجود نہیں تھا لہٰذا تابعین کو بسا اوقات قرآن و سنت کے علاوہ قیاس وغیرہ سے بھی کام لینا پڑا مگر اس کی جو وجہ گولڈ زیہر بیان کرتا ہے وہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ گولڈ زیہر کہتا ہے:

''اسلام نے دنیا کے سامنے کوئی مکمل نظام پیش نہیں کیا۔ قرآن مجید نے صرف تھوڑے سے احکام بیان کئے ہیں۔ اس کے احکام ان تمام غیر متوقع صورتوں پر حاوی نہیں ہوسکتے تھے جو فتوحات کے نتیجے میں پیش آئیں۔ یہ احکام صرف عربوں کے سادہ حالات ہی میں ان کی ضرورتوں کو پورا کرسکتے تھے اور نئے علاقوں کی فتح کے بعد جو صورت حال پیش آئی اس کے لئے کافی نہیں تھے۔''[1]

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی نقل از کتاب العقیدۃ والشریعۃ مولفہ گول ڈزیہر

گول ڈزیہر پر ہی کیا موقوف ہے بہتیرے مستشرقین اسلام اور رسول اسلامؐ کے بارے میں جسارت کرتے رہتے ہیں۔ رومانیہ کے کونسٹین ورجل جارجیف Konstin Virgil Georgiev نے اپنی کتاب کا نام ہی یہ رکھا ہے ''پیغمبر محمد (ص) کو از سر نو شناخت کرنے کی ضرورت ہے۔'' چونکہ یہودی اور عیسائی مستشرقین قرآن مجید کو وحی مُنزّل نہیں سمجھتے اس لئے آئے دن وہ ہرزہ سرائی کرتے رہتے ہیں کہ قرآن پر نظر ثانی کی ضرورت ہے کیونکہ یہ کتاب موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہ اس کتاب کو اور صاحب کتاب کو زمانی اور مکانی سمجھتے ہیں۔ وہ نہ قرآن کی آفاقیت کے قائل ہیں اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالمگیریت (وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ سورۂ سباء: آیت ۲۸) کے معترف ہیں۔ ان کی ان حرکتوں پر ہمیں کوئی تعجب نہیں ہے کیونکہ خدا نے تو پہلے ہی یہ بتا دیا ہے کہ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ "(اے رسولؐ!) تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی یہاں تک کہ تم ان کے مذہب کی پیروی اختیار کرلو"۔ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۰)

گول ڈزیہر اس بحث سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس زمانے میں اجتہاد کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔ اسی بناء پر فقہ میں تغیر ہوا اور وسعت پیدا ہوئی اور عمل بالرائے کا فقہاء میں رواج ہوا۔

یہاں ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم گول ڈزیہر کی رائے پر ذرا تنقیدی نظر ڈالیں اور خاص طور پر یہ دیکھیں کہ اس نے جو یہ کہا ہے کہ "اسلام صرف عرب کی سادہ زندگی کی ہی ضروریات پوری کر سکتا تھا" یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔

جو شخص قرآن مجید کی آیات پر غور کرے گا وہ یہ محسوس کرے گا کہ خواہ ان آیات کا تعلق عبادات سے ہو، معاملات سے ہو، انفرادی حالات سے ہو، فوجداری قوانین سے ہو یا اور کسی معاملے سے ہو، ان میں کسی خاص گروہ یا انسانوں کے کسی خاص طبقے سے خطاب نہیں ہے اور نہ ان میں کسی خاص زمانے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بلکہ ان میں ایسا قانون بیان کیا گیا ہے اور ایسے مسائل کی طرف توجہ کی گئی ہے جن کا تعلق ساری دنیا اور ایک مکمل نظام سے ہے۔ ان آیات میں دین و دنیا میں ربط پیدا کیا گیا ہے۔ دنیا کے دوسرے قانون ساز نظاموں کی طرح اسلام نے بھی ایک مکمل نظام پیش کیا ہے۔ اس کی تفصیل ان لوگوں کے لئے چھوڑ دی گئی ہے جن کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس نظام کو قائم کریں اور اس کو چلائیں۔

اس خدائی نظام میں ایسی صلاحیت موجود ہے کہ اسے ہر جگہ اور ہر زمانے میں نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس نظام کو قائم اور نافذ کرنے والے اس کے احکام اور اسرار کو سمجھنے کی طرف توجہ دیں اور ان کو سمجھنے کا طریقہ دریافت کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ آیا قرآن مجید نے جیسا کہ گول ڈزیہر کا خیال ہے عربوں کی سادہ زندگی کے مناسب احکام بیان کرنے پر قناعت کی ہے یا اس نے متعدد آیات میں اس بات پر زور دیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سارے جہان کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، وہ عربی اور عجمی، گورے اور کالے میں کسی فرق و امتیاز کے قائل نہیں ہیں۔

وہ خدا کے آخری رسولؐ ہیں، ان کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا۔ان کا دین آخری آسمانی شریعت ہے۔اب یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی پیغمبر مبعوث تو ہو سارے عالم کے لئے جیسا کہ خود قرآن مجید کا دعویٰ ہے لیکن اس کی شریعت صرف ایسے قوانین پر مشتمل ہو جن کا تعلق محض عرب بدوؤں کی سادہ اور ابتدائی زندگی سے ہو۔اگر اس کے قانون سب کے لئے نہیں ہیں اور وہ سب انسانوں کے مسائل حل نہیں کرسکتا تو ایسی صورت میں اس کے سارے جہان کی طرف بھیجے جانے کا کیا فائدہ؟

صاف ظاہر ہے کہ اسلامی شریعت کے بارے میں رائے ظاہر کرتے وقت اس یہودی جرمن مستشرق گول ڈزیہر نے تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقائق کو مسخ کرکے پیش کیا ہے اور اسلام کے قوانین کی غلط تصویر کشی کی ہے۔

یہ مصنف استعمار پسندوں کے اشارے پر مسلمانوں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ تمہاری شریعت تمہارے مسائل کے حل کے لئے ناکافی ہے۔اس لئے اگر تم آسودہ اور آرام کی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو دوسرے قوانین کو کام میں لاؤ اور نو آبادیات اور صیہونیت کے سائے میں زندگی گزارو۔یہ کہنے کا مقصد کہ "تمہارا قرآن محض تمہارے پیغمبر(ص) کے زمانے کے پسماندہ عربوں ہی کے مسائل حل کرسکتا ہے" یہ ہے کہ زندگی کے مسائل جو ہر روز بدلتے رہتے ہیں، ان کا ایسا حل دریافت کرنا ضروری ہے جو موجودہ حالات میں انسان کی فلاح و بہبود کی ضمانت دے سکے۔ قرآن مجید کو چھوڑو اور یہ حل کہیں اور ڈھونڈو کیونکہ قرآن مجید اب تمہاری ضرورت پوری نہیں کرسکتا۔

بہرحال تابعین کے دور میں اجتہاد ضروری ہوگیا تھا کیونکہ یہ اس زمانے کے حالات کا تقاضا تھا۔ البتہ اس کی بنیاد بعض اسلامی علاقوں میں پہلے پڑی اور بعض میں بعد میں۔

جن اسباب کے باعث فقہائے صحابہ کے برخلاف فقہائے تابعین میں رائے اور اجتہاد کا رواج پیدا ہوا ہم انہیں مختصر طور پر اس طرح بیان کرسکتے ہیں:

(۱) اسلام کے پھیلنے کے بعد نئے مسائل وجود میں آئے۔ جب اسلام کی روشنی سرزمین عرب سے دور اُن علاقوں میں پہنچی جہاں کے رسم و رواج، طور طریقے اور تمام اقتصادی اور معاشرتی حالات بالکل مختلف تھے اور اس اختلاف کا اثر زندگی کے ہر میدان میں محسوس ہونے لگا تو نئے نئے مسائل وجود میں آتے گئے۔ فتوحات کے نتیجے میں ان علاقوں کے باشندوں کو جن واقعات سے سابقہ پڑا ان میں اور ان واقعات میں جو رسول اکرمؐ کے زمانے میں پیش آتے تھے کوئی مشابہت نہیں تھی۔ ان حالات میں فقہاء کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو نئے حالات کے مطابق احکام سکھائیں اور انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کریں۔ ان مواقع پر فقہاء کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ اسلامی نصوص کو سمجھنے کے لئے اجتہاد سے کام لیں اور نصوص کو ان واقعات اور حوادث کے ساتھ تطبیق دیں جو اُن علاقوں کی خاص صورت حال اور وہاں کی خصوصیات کی بناء پر وجود میں آرہے تھے۔ اس لئے جہاں نص موجود نہیں تھا یا ایسا تھا کہ اس کے مفہوم اور مصداق کے متعلق مکمل اطمینان نہیں ہوسکتا تھا وہاں رائے سے کام لینے کی ضرورت پیش آئی۔

(۲) اس زمانے میں وضعی احادیث کی کثرت ہوگئی۔ بنوامیہ نے وضّاعوں کی ایک جماعت کو اس کا موقع دیا کہ وہ جھوٹی حدیثیں وضع کریں اور اپنے سیاسی عزائم کے تحت ان کو اپنے مقربین میں اس لئے شامل کرلیا تاکہ وہ ہزاروں وضعی احادیث صحیح احادیث کے ساتھ ملا کر پھیلادیں۔ لہٰذا تابعین کے دور میں اس بات کا امکان باقی نہ رہا کہ ہر اس روایت کو جو رسول اکرمؐ سے منسوب کی جائے بے چون و چرا قبول کرلیا جائے۔ چونکہ صحیح اور وضعی احادیث باہم خلط ملط ہوگئی تھیں۔ اس لئے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے فقہاء کے نزدیک بہت سی احادیث مشکوک قرار پائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مشکوک احادیث پر عمل کرنے کے بجائے انہوں نے کہیں اجتہاد اور کہیں رائے پر بھروسا کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ وضعی احادیث کی کثرت اور ان کے صحیح احادیث میں مخلوط ہوجانے کی وجہ سے تابعین کے دور میں بہت سے فقہاء کو بعض ایسی احادیث کو چھوڑ دینا پڑا جن کی صحت پر انہیں اطمینان نہیں تھا۔ جب کسی معاملے میں متعلقہ حدیث پر انہیں اطمینان نہیں ہوتا تھا تو وہ اپنی رائے سے فتویٰ دے دیتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی حدیث ایک فقیہ نے مستند سمجھی لیکن دوسرے فقیہ کو اس کی صحت پر شک ہوا۔ چونکہ فقہائے حجاز دوسروں کی بہ نسبت صحیح احادیث سے زیادہ واقف تھے اس لئے وہ اہل حدیث مشہور ہوگئے جبکہ دوسرے فقہاء اس لئے اہل رائے کہلانے لگے کیونکہ جو احادیث نبوی ان تک پہنچیں وہ ان میں صحیح و غلط میں تمیز کرنے سے قاصر ہونے کی بنا پر اپنی رائے سے زیادہ کام لیتے تھے۔

جو فقہاء اہل رائے کے نام سے مشہور ہوئے ان میں کوفہ کے فقہاء بھی تھے جن میں سب سے مشہور ابراہیم نخعی تھے اور جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بیان کیا ہے شیخ طوسی کی کتاب الرجال کے مطابق وہ امام سجادؑ کے اصحاب میں سے تھے۔

(۳) فاتح عربوں کا دوسری قوموں سے جو اسلام لے آئی تھیں رابطہ اور باہمی آمیزش۔ عرب ادب، فقہ، حدیث اور سب معاملات میں اپنے حافظے پر بھروسا کرتے تھے۔ جبکہ وہ قومیں جن کے علاقے انہوں نے فتح کرلئے تھے سوچنے اور سمجھنے پر زیادہ زور دیتی تھیں۔ مفتوحہ اقوام میں سے جو لوگ اسلام لے آئے تھے ان میں سے کچھ نے فقہ اور حدیث میں امتیازی شان پیدا کرلی۔ یہ افراد موالی کے نام سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے صحابہ اور ان کے شاگردوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ تمام اسلامی مرکزوں میں موالی میں سے کوئی نہ کوئی فقیہ موجود تھا اور لوگ دینی احکام کے لئے زیادہ تر ان ہی سے رجوع کرتے تھے۔ مصطفیٰ عبدالرزاق کہتے ہیں: عبادلہ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ) کے بعد سب علاقوں میں فقہ پر ''موالی'' چھا گئے۔ مکہ کے فقیہ عطاء بن رباح تھے۔

اہل یمن کے فقیہ طاؤس تھے۔ اہل یمامہ کے فقیہ یحییٰ بن کثیر تھے۔ کوفہ کے فقیہ ابراہیم نخعی تھے۔ بصرہ کے فقیہ حسن بصری۔ شام کے مکحول اور خراسان کے عطاء تھے۔ یہ سب موالی تھے۔ سوائے مدینہ کے فقیہ کے جو سعید بن مسیب تھے۔[۱]

جس زمانے میں ان علاقوں نے اسلام کی اطاعت قبول کی تھی اس وقت عربوں میں ناخواندگی عام تھی جبکہ ان علاقوں میں علم تھا اور یہ علاقے متمدن تھے۔ عربوں میں ناخواندگی عام ہونے ہی کی وجہ سے بعض صحابہ کرام جو قرآن مجید پڑھ سکتے تھے قراء کہلانے لگے یعنی یہ وہ لوگ تھے جو ایک ان پڑھ قوم میں پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔

اسلام کی توسیع اور فقہ کے ان عرب اور غیر عرب تابعین کو منتقل ہوجانے کی وجہ سے جو مختلف علاقوں میں منتشر ہوگئے تھے تاکہ لوگوں کو احکام الٰہی سکھائیں اور اسلامی زندگی کو دوسرے علاقوں میں طرز حیات سے پیوند دے سکیں ایک نئی بات یہ پیدا ہوئی کہ اب تابعین نے کسی مسئلے کا صحیح حل دریافت کرنے اور اس کے مختلف ممکنہ حلوں پر گفتگو کرنے کے مقصد سے ہر حکم کے اسباب اور مصالح و مفاسد سے بحث شروع کردی۔ یہ طریقہ صحابہ کرام کے زمانے میں رائج نہیں تھا اور اس وقت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر اس طریقے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہی مسائل کے بارے میں تابعین میں آپس میں اختلافات پیدا ہونے لگے اور خصوصاً فروعی مسائل کے بارے میں اختلافات بہت بڑھ گئے۔ اسی وجہ سے یہ فقہاء اہل رائے مشہور ہوگئے۔ فقہائے حجاز چونکہ ایسے ماحول میں رہ رہے تھے جہاں نصوص کے متعلق اس طرح کی بحث کی ضرورت نہیں تھی جیسی یہ تابعین کررہے تھے اس لئے وہ اہل حدیث کہلائے۔ بڑی بات یہ تھی کہ اہل حجاز رسول اکرمؐ کے زیادہ قریب رہے تھے۔ احادیث نبوی انہیں زیادہ معلوم تھیں اور وہ راویوں کے حالات سے بھی زیادہ واقف تھے۔ اس لئے ان کے لئے صحیح احادیث کو پہچاننا اور ان سے احکام مستنبط کرنا آسان تھا۔

۱۔ تمهيد لتاريخ الفلسفه نقل از اعلام الموقعین مولفہ ابن حزم

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ جس رائے نے تابعین کے دور میں رواج پایا وہ فقیہ کے فتوے کے علاوہ کوئی چیز نہیں تھی۔ اس طرح کا فتویٰ اس وقت دیا جاتا تھا جب کتاب اللہ اور صحیح احادیث میں کوئی دلیل نہیں ملتی تھی اور یہی وہ چیز ہے جس پر خود رسول اکرمؐ نے معاذ بن جبلؓ کی روایت کے مطابق پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس سے وہ قیاس کسی صورت مراد نہیں ہے جس کا بیج حضرت عمر ابن خطابؓ نے اس خط میں بویا تھا جو آپ نے ابوموسیٰ اشعری کو لکھا تھا۔ اس رائے کے مطابق فتویٰ دینے میں حنفیوں نے خاص شہرت حاصل کی ہے اور مالکیوں وغیرہ نے بھی اس طرح کی رائے کی تائید کی ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ فقہائے تابعین میں سے کسی نے قیاس کو احکام معلوم کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہو بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب فقیہ کو کتاب و سنت سے حکم معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے تو وہ رائے پر عمل کرتا ہے، بشرطیکہ یہ رائے اسلام کے لئے قابل قبول ہو اور قرآن و سنت کے کسی نص کے مخالف نہ ہو۔ جو اصول اسلام نے قبول کئے ہیں ان میں کہیں دور کا بھی اشارہ اس قیاس کی طرف نہیں ہے جو بعض صحابہ میں رحلت رسولؐ کے بعد رواج پا گیا تھا۔

بہرحال فقہائے حجاز نے اہل حدیث کے نام سے شہرت پائی اور فقہائے عراق نے اہل رائے کے نام سے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ حجاز کا فقہ مکمل طور پر حدیث پر مبنی ہو اور عراق وغیرہ کا فقہ رائے پر۔ یہ بات مسلّم ہے کہ فقہائے حجاز میں بھی وہ لوگ موجود تھے کہ جب انہیں کسی مسئلے کے بارے میں قرآن و سنت سے کافی دلیل نہیں ملتی تھی تو وہ رائے پر فتویٰ دیتے تھے۔

شیخ محمد ابوزہرہ کہتے ہیں: ”مدینے میں اور حجاز کے سب دوسرے شہروں میں رائے پر عمل ہوتا تھا۔ فقہائے سبعہ جو فقہائے مدینہ کا بہترین نمونہ تھے رائے پر عمل کرتے تھے۔ ان میں سب سے سربرآوردہ حضرت سعید ابن مسیب تھے جو فتویٰ دینے میں ہچکچاتے نہیں تھے۔ اسی لئے ان کا لقب جری ہوگیا تھا۔ کوئی شخص فتویٰ

دینے میں اس وقت تک بیباک نہیں ہوسکتا جب تک وہ رائے پر عمل میں بیباک نہ ہو۔ اور جو شخص فتوے میں فقط نص اور حدیث پر اکتفا کرے اسے فتوے میں جری نہیں کہا جاسکتا۔ جری وہی ہے جو بہت سے احکام احادیث سے اخذ کرنے کے باجود احادیث کے محدود دائرے سے باہر بھی قدم رکھے اور اس راستے پر بھی چلے جو راستہ بجز رائے کے کچھ نہیں ہے۔[1]

اس سے قبل ہم نے بیان کیا تھا کہ حضرت عمرؓ رائے پر بھی فتویٰ دیتے تھے اور جب مصلحت سمجھتے تھے قیاس پر بھی عمل کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ متعدد فقہائے حجاز نے فقہ اور قضاء ان ہی سے سیکھے تھے اور اس معاملے میں ان ہی کا اتباع کرتے تھے۔

بہرحال رائے پر فتویٰ اجتہاد کے مترادف ہے۔ فقیہ کے لئے ضروری ہے کہ نصوص کو سمجھے اور جہاں نص موجود نہ ہو وہاں پورا اطمینان کرلینے کے بعد کہ نص موجود نہیں اپنے اجتہاد پر عمل کرے۔

بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ فقہاء رائے پر اس وقت عمل کرتے ہیں جب کتاب و سنت سے کوئی دلیل موجود نہ ہو یا دلیل تو ہو لیکن اس خاص مسئلے کے بارے میں کوئی نص نہ ہو یا پھر نص کے مفہوم میں کئی احتمال ہوں۔ ایسی صورت میں حکم معلوم کرنے کے لئے رائے پر عمل کچھ غلط نہیں ہے۔ جب سے مسلمانوں نے قرآن وسنت سے احکام اخذ کرنے شروع کئے اسلامی فقہ ترقی ہی کرتا گیا۔ رائے پر عمل صحابہ اور فقہائے حجاز میں بھی رائج تھا۔ جو لوگ بعد میں اہل حدیث کے نام سے مشہور ہوئے ان کے اس نام سے مشہور ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان کو حدیث سے زیادہ واقفیت تھی۔ اسی طرح عراق اور دیگر علاقوں کے فقہاء اہل رائے کیوں مشہور ہوئے یہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔

۱۔ الامام الصادق صفحہ ١٧٦

اسلامی فقہ کا اصل مآخذ گو کتاب وسنت ہی ہیں لیکن فقیہ کے لئے مندرجہ بالا معنی میں رائے کا استعمال بھی ضروری ہے۔ لیکن وہ رائے جو قیاس کے مترادف ہے اور جس میں اس کے بعض حامیوں نے بہت مبالغے سے کام لیا ہے، وہ قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ رائے کی یہ قسم فقہائے عراق میں خاص کر ان شیعہ فقہائے عراق میں جو اپنے زمانے میں تدریس اور افتاء کے ذمہ دار تھے جیسے ابراہیم بن یزید نخعی اور علقمہ بن قیس وغیرہ کبھی رائج نہیں رہی۔

نص نہ ہونے کی صورت میں رائے پر فتویٰ دینا یا فتویٰ دینے سے احتراز کرنا دونوں ہی باتیں صحیح ہیں۔ ثانی الذکر طریقہ ان فقہاء کے بعض دوسرے ہمعصر فقہاء کا تھا۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے جو شیخ خضری نے تاریخ التشریع الاسلامی میں اور مصطفیٰ عبدالرزاق نے تمہید لتاریخ الفلسفہ میں لکھی ہے۔ یہ دونوں کہتے ہیں:

"مشہور فقیہ شعبی، ابراہیم بن یزید نخعی کے ہمعصر تھے۔ جب ان سے فتویٰ پوچھا جاتا تھا تو اگر انہیں اس معاملے میں کوئی نص نہ ملتی تو وہ فتویٰ دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ لیکن ابراہیم وغیرہ اپنے اجتہاد کی بنا پر فتویٰ دیتے تھے۔"

عہد تابعین میں حدیث اور فقہ کی تدوین

اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ بعض وجوہ سے خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطابؓ نے احادیث جمع کرنے کی ممانعت کردی تھی۔ ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ مجموعی طور پر فقہ وحدیث اور مسلمانوں پر اس حکم کا خراب اثر مرتب ہوا اور یقیناً ان سازشی لوگوں کے لئے ــــ جو ایک خاص مقصد سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے ــــ ایک دروازہ کھل گیا چنانچہ ان لوگوں نے بنی امیہ کی حکومت کے مفاد میں حدیثیں گھڑیں جسے اموی سیاست کے کارکن قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ کے عنوان سے بیان کرتے ہوئے اسلامی مملکت کے دور دراز علاقوں تک پہنچ گئے۔ یہی وہ وقت تھا جب صحیح اور غلط آپس میں مخلوط ہوگئے۔

انہی وجوہ کی بناء پر مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے جیسا کہ ہم ''اسلامی قانون سازی پر تدوین حدیث کی ممانعت کے اثرات'' کے باب میں بتا چکے ہیں۔ اسی طرح ہم نے مؤثق ذرائع کے حوالے سے یہ بھی بتلایا تھا کہ امام علیؑ نے رسول اکرمؐ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد فقہ کی تدوین کی۔ امام علیؑ اور بعض دوسرے مسلمان احادیث کے جمع کرنے اور لکھنے کو جائز اور مناسب سمجھتے تھے۔ گو مسلمانوں کی اکثریت حضرت عمرؓ کی ہی رائے کو صحیح سمجھتی اور اس کا اتباع کرتی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ احادیث صرف یاد رکھتے تھے اور اسی حدیث کو قابل اعتماد سمجھتے تھے جسے وہ صحابہ اور دیگر حفاظ حدیث کی زبان سے سنتے تھے۔

ایسی شہادت موجود ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس دور میں بھی احادیث مدون کی گئی تھیں۔ اس کام کے بعض نمونے بھی ملتے ہیں۔ لیکن اس وقت یہ کام ان لوگوں نے انجام دیا تھا جن کا مقصد یہ تھا کہ جو احادیث انہیں معلوم ہیں وہ ان کو ذاتی یادداشت کے لئے محفوظ کرلیں تا کہ وہ انہیں بھول نہ جائیں اور ان کی جمع کردہ احادیث ضائع نہ ہوجائیں۔

عمومی تدوین بعد ہی کے زمانے میں شروع ہوئی، جس کے شروع ہونے کی ڈاکٹر محمد یوسف وغیرہ نے تین وجوہ بتلائی ہیں:

(۱) چونکہ مسلمان بدویت کے دور کو گزار کر تہذیب و تمدن کے دور میں داخل ہوگئے تھے اور آرام و آسائش کی زندگی گزارنے لگے تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کی توجہ مختلف علوم کی طرف منعطف ہونے لگی اور انہوں نے اپنا دماغ علوم کی تحصیل پر لگا دیا۔ ابن خلدون نے اس کی متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔ وہ اپنی تاریخ کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''جب تمدن کی آسائشوں اور نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے جب ہی علم فروغ پاتا ہے۔''

(۲) عربوں میں لکھنے کا رواج ہوگیا اور وہ اپنی تحریر کی قابلیت کو مختلف علوم محفوظ کرنے کیلئے استعمال کرنے لگے۔ اس کی وجہ سے انہوں نے یاد رکھنے کی طرف توجہ کم کردی اور اس کے نتیجے میں ان کا حافظہ کمزور ہوگیا۔ جب آدمی کا حافظہ کمزور ہوجاتا ہے تو وہ مجبوراً اپنی معلومات کو قلم بند کرنے لگتا ہے تا کہ معلومات کو نابود ہونے سے بچا سکے۔ اس کے علاوہ بہت سے نومسلم جنہوں نے فقہ، قرآنی علوم اور حدیث میں امتیازی حیثیت پیدا کرلی تھی اور جن کی تابعین کے دور میں خاصی اکثریت ہوگئی تھی موالی یعنی غیر عرب تھے۔ ان میں سے اکثر اچھی طرح لکھنا جانتے تھے اور ان کے ملکوں میں اسلام پھیلنے سے قبل فارسی، رومی اور دوسری گزشتہ قوموں کے آثار جمع کرنے کا کافی رواج تھا۔ ان کا حافظہ بھی عربوں اور بدوؤں کی طرح قوی نہیں تھا۔

(۳) احادیث میں کافی غلطیاں اور اختلاف پیدا ہوگئے تھے۔ جو راوی احکام سنانے اور احادیث روایت کرنے کے لئے مختلف اسلامی علاقوں میں پھیل گئے تھے وہ زیادہ تر اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے۔ اور چونکہ انسان قدرتی طور پر بھول چوک کا شکار ہوجاتا ہے اس لئے روایات میں اختلاف پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ اس کے علاوہ بعض افراد نے محض مجبوری سے اسلام قبول کیا تھا اور وہ دل سے مسلمان نہیں تھے۔ ان لوگوں نے جھوٹی احادیث گھڑنی اور پھیلانی شروع کردیں۔ اسی طرح کچھ ایسے لوگ بھی جعلی حدیثیں بنانے لگے جو گو دل سے ایمان لائے تھے مگر انہوں نے اپنا دین ان حکمرانوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا جو اقتدار کے لئے سب کچھ جائز سمجھتے تھے۔

استاد مصطفیٰ عبدالرزاق لکھتے ہیں: "جس چیز نے احادیث جمع کرنے کی ضرورت کو شدید بنادیا وہ وضعی احادیث کی کثرت، بعض راویوں کا غیر ثقہ ہونا اور سیاسی و مذہبی وجوہ کی بناء پر احادیث نبوی میں جھوٹ کی آمیزش تھی۔"[۱]

احادیث کی بروقت تدوین نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کو غیر ضروری نقصان پہنچا۔ اگر خلیفہ وقت نے مسلمانوں کو جمع و تدوین قرآن کی طرح جمع و تدوین حدیث کی بھی اجازت دیدی ہوتی تو یہ صورت پیش نہ آتی۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بناء پر مسلمانوں کو تدوین حدیث کی ضرورت کا احساس ہوا اور انہوں نے تدریجاً احادیث جمع کرنی شروع کردیں جیسا کہ اسلامی فقہ اور قدماء کے آثار کے غائر مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے لیکن شیعہ ذرائع اس پر زور دیتے ہیں کہ اہلبیتؑ اور ان کے متبعین نے احادیث کی تدوین دوسروں سے ایک صدی پہلے ہی شروع کردی تھی۔ ہم بخاری کی روایت نقل کرچکے ہیں جس میں اس کی تصریح ہے کہ امام علیؑ نے ایک صحیفہ لکھا تھا جو احکام پر مشتمل تھا۔ مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمے میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے بھی امام علیؑ کے فیصلے قلم بند کرنے

۱۔ تمہید لتاریخ الفلسفہ صفحہ ۱۹۵

کی کوشش کی تھی۔ مسلم نے اس کی کچھ مثالیں بھی دی ہیں۔ ہم نے گزشتہ ابواب میں اس مسئلے پر قدرے زیادہ روشنی ڈالی ہے۔

بہرحال محدثین اور راویوں کے مطابق عمر بن عبدالعزیز پہلے شخص تھے جنہوں نے احادیث مدون کرنے اور صحیح احادیث کو جعلی روایات سے الگ کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں قاضی مدینہ ابوبکر محمد بن عمر بن حزم کو لکھا کہ "احادیث اور سنت نبوی کو تلاش کر کے میرے لئے مرتب کر دو۔" انہوں نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم ضائع نہ ہو جائے اور علماء ختم نہ ہو جائیں۔"

مؤطاء امام مالک میں محمد بن الحسین کی روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے مالک کو حکم دیا کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاری، جو حضرت عائشہ کی شاگرد تھی، اور قاسم بن محمد کے پاس جو احادیث ہیں وہ لکھ کر مجھے بھیج دو۔[1]

ابونعیم کی تاریخ اصفہان میں ہے: عمر بن عبدالعزیز نے مختلف علاقوں کے والیوں کو خطوط بھیجے اور ان میں لکھا کہ "احادیث نبوی کو تلاش کر کے ان کو جمع کرو۔" اسی روایت میں ہے کہ "ابن حزم نے اس ضمن میں کئی کتابیں لکھیں لیکن انہوں نے اپنی کتابیں ابھی عمر بن عبدالعزیز کو بھیجی نہیں تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔"[2]

علم خصوصاً حدیث کی تاریخ پر عمر بن عبدالعزیز کی اس سوچ کا زبردست اثر پڑا۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اسلام اور آثار نبوی سے کتنی گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے علماء اور حفاظ حدیث کا طرز فکر بدل دیا۔ اب تک سارا دار و مدار حفظ پر اور زبانی سیکھنے پر تھا۔ انہوں نے لکھنے کے خیال کو رواج دیا۔ کچھ علماء احادیث کی جمع و تدوین کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف شہروں میں لوگوں کی توجہ اس طرف ہو گئی۔

مختصر جامع بیان العلم میں ہے کہ علم کو سب سے پہلے مدوّن کرنے

۱و۲ تمہید لتاریخ الفلسفہ صفحہ ۱۹۶

والے (امام) ابن شہاب زہری ہیں۔ اسی کتاب میں عبدالرحمٰن بن ابی الزناد کی ایک روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد کہتے تھے: ''ہم حلال و حرام لکھتے تھے۔ امام زہری جو سنتے تھے وہی لکھ لیتے تھے۔''[1]

استاد ابوریہ نے (امام) زہری کا قول نقل کیا ہے کہ زہری کہتے تھے:

''ہمیں علمی باتیں لکھنا پسند نہیں تھا۔ ہمیں اس کام پر مجبور کیا گیا۔''

ہشام نے جو ۱۰۵ھ میں خلیفہ ہوا تدوین کے ضروری ہونے کے خیال کو پھیلانے کے لئے بہت کوشش کی۔ ویسے اس پر تاریخ نویسوں کا اتفاق ہے کہ اس کام کی ترغیب سب سے پہلے عمر بن عبدالعزیز نے دی تھی۔ گو زہری کو یہ کام پسند نہیں تھا مگر جب اور لوگوں نے کتابیں لکھیں تو اس کا رواج ہوگیا۔ عالموں نے اس موضوع پر مختلف ادوار میں مفصل کتابیں لکھی ہیں۔ شروع میں فقہی ابواب کے مطابق کتابوں کی تہذیب یا فصل بندی نہیں تھی بلکہ ان کتابوں کا اسلوب وہی تھا جو عموماً اس زمانے کے علماء کی مجالس کا ہوتا تھا۔ یہ مجالس کسی ایک علم سے مختص نہیں تھیں بلکہ ایک ہی مجلس میں مختلف علوم پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ عطاء حضرت ابن عباسؓ کی مجلس کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں نے اس سے زیادہ وقیع مجلس نہیں دیکھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی مجلس میں فقہ کی تعلیم دوسری مجالس سے زیادہ ہوتی تھی۔ ان کی مجلس بڑی پروقار اور شاندار تھی۔ قرآن، شعر اور ادب کے طلباء ان کی مجلس میں آکر ان سے سوالات پوچھتے تھے اور ایک ہی وسیع سرچشمہ سے سب علوم کی پیاس بجھاتے تھے۔''

محمد بن دینار حضرت ابن عباسؓ کی مجلس کے بارے میں کہتے ہیں:

''میں نے حضرت ابن عباسؓ کی مجلس سے بہتر کوئی مجلس نہیں دیکھی جہاں ہر موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔''

۱۔ تمہید لتاریخ الفلسفہ صفحہ ۲۰۰

آہستہ آہستہ اور کاموں کی طرح احادیث کی تدوین کا طریقہ بھی بدلتا گیا۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ بنی عباس کا دور آ گیا۔ علماء فقہی کتابوں کو فصول اور ابواب پر مرتب کرنے لگے۔ اس زمانے میں مصنفین کی تعداد بھی خوب بڑھ گئی اور فقہی تالیفات نے پہلے سے مختلف ایک نئی شکل اختیار کر لی۔[1]

بنی عباس کے دور میں علماء نے پچھلی تصانیف کا جائزہ لینا اور ان کی تصحیح کرنا شروع کر دیا۔ جو علم ابھی تک سینوں میں باقی رہ گیا تھا اس کو بھی رشتہ تحریر میں لے آئے۔ کتابوں کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے مرتب کیا۔

ابو جعفر منصور نے علوم کے فروغ کے لئے بہت دولت خرچ کی۔ علماء کو تصنیف و تالیف کا شوق دلایا۔ امام مالک کو موطاء لکھنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے یہ کتاب ۱۴۷ھ میں تالیف کی۔ منصور دوانقی نے فقہ، حدیث اور سنت نبوی کی تدوین کی طرف اس قدر توجہ کی کہ نہ اس سے پہلے کسی نے کی تھی اور نہ اس کے بعد۔ جب اس سے کسی نے پوچھا کہ کیا دنیا میں آپ کی کوئی ایسی خواہش ہے جو پوری نہ ہوئی ہو تو منصور نے جواب دیا: "ایک آرزو باقی رہ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں مسند پر بیٹھا ہوں، میرے گرد حدیث کے طلباء جمع ہوں۔"[2]

منصور دوانقی کی یہ خصوصیت اس کی عام سیرت، کردار اور سیاست سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ سیاست میں تشدد پسند تھا۔ اس نے بہت سے صلحاء کو قتل کرا دیا تھا۔ علویوں اور ان کے طرفداروں کے خون سے اس کے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔ اس کے ظلم و ستم نے بنی امیہ کے ظلم و ستم اور ان کی غیر اسلامی حرکتوں کی یاد بھلا دی تھی۔ منصور دوانقی دراصل چاہتا تھا کہ علماء کا دھیان اپنی ظالمانہ سیاست سے

۱۔ اضواء علی السنة المحمدیة

۲۔ تدوین حدیث کے مراحل کو بیان کرنے کے سلسلے میں ہم نے ان کتابوں پر بھروسہ کیا ہے۔
تاریخ الفقه الاسلامی، تاریخ التشریع الاسلامی، الاضواء علی السنة المحمدیة، تمهید لتاریخ الفلسفه اور السنة قبل التدوین

ہٹائے رکھے اور انہیں حدیث کی تدوین اور فقہی کتابوں کی تالیف کے کام میں الجھا کر معاشرتی امور کی طرف متوجہ نہ ہونے دے تاکہ اس کے ظلم وستم سے تنگ آئے ہوئے لاکھوں مظلوم انسانوں میں ان کی آواز بلند نہ ہونے پائے۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ علماء کی صلاحیت اور سوچ کو محدود کردے تاکہ اس کی اس خلافت کو نقصان نہ پہنچنے پائے جو بنی عباس نے بڑی خونریزی کے بعد بنی امیہ سے چھینی تھی اور یہ جھوٹ بول کر لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا تھا کہ" ہم اسلام کی عزت کی حفاظت، مظلوموں کی دادرسی اور علویوں کی خیرخواہی میں لڑ رہے ہیں۔"

فقہ کی تدوین پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد یوسف نے **تاریخ الفقہ** میں لکھا ہے اور اسی طرح محمد عجاج خطیب وغیرہ نے بھی مختلف ذرائع سے نقل کیا ہے کہ تدوین کا کام اسلامی تاریخ کے آغاز ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ خود رسول اکرمؐ نے زکوٰۃ کے احکام لکھنے کا حکم دیا تھا اور یہ احکام مختلف علاقوں کے حکام کو بھجوائے تھے۔ اسی طرح جب آپ نے حضرت عمرو بن حزمؓ کو یمن کا والی مقرر کیا تو ان کو صدقات و دیات وغیرہ کے کچھ احکام تحریری شکل میں دیئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن حکیمؓ اور حضرت وائل بن حجرؓ کو بھی تحریریں دی تھیں جو مردہ حیوانات، نماز، روزے، ربا اور شراب کے احکام پر مشتمل تھیں۔ اور یہی بات علی متقی ہندی کی **کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال** جلد ۳ صفحہ ۱۶۸ اور طبرانی کی **المعجم الصغیر** جلد ۳ صفحہ ۱۱۷ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح روایات میں آیا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے حضرت انسؓ کو بحرین بھیجا تو انہیں ایک خط دیا جس میں ایسے اونٹوں اور بھیڑوں کے احکام اور ان کی زکوٰۃ کا نصاب درج تھا جو چراگاہوں میں چرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بھی زکوٰۃ جمع کرنے کے بارے میں خطوط لکھ کر اپنے کارگزاروں کو دیئے تھے۔ ڈاکٹر یوسف وغیرہ نے ان روایتوں کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں کوئی بحث نہیں کی باوجودیکہ اس پر محدثین کا اتفاق ہے کہ حضرت عمرؓ حدیث کی تدوین کے سخت خلاف تھے۔

صحیفہ صادقہ

ڈاکٹر محمد یوسف نے تدوین حدیث کی بحث کو ایک خاص اسلوب سے شروع کیا ہے۔ وہ بحث کا آغاز ابتدائے اسلام سے کرتے ہیں۔ جب حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے منسوب صحیفہ صادقہ سے متعلق روایت پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں:
''حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے جناب رسول اکرمؐ سے اجازت مانگی تھی کہ آپ خوشی اور غصے کی حالت میں جو کچھ بھی فرمائیں میں لکھ لیا کروں؟ تو رسول اکرمؐ نے ان کو اجازت دیدی تھی۔'' مجاہد ایک دن حضرت عبداللہؓ کے پاس آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حضرت عبداللہؓ کے ہاتھ میں ایک صحیفہ تھا۔ لیکن حضرت عبداللہؓ نے یہ صحیفہ مجاہد کو دینے سے انکار کردیا۔ مجاہد نے ان سے کہا: کیا تم اپنی کتابیں مجھے دیکھنے نہیں دوگے؟ حضرت عبداللہؓ نے کہا: یہ صحیفہ صادقہ ہے۔ اس میں وہ باتیں درج ہیں جو میں نے رسول اکرمؐ سے اس وقت سنی تھیں جب ان کے پاس میرے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر میرے پاس کتاب اللہ، یہ صحیفہ (اور میری زرعی زمین) محفوظ رہے تو مجھے حوادث روزگار کا کوئی خوف نہیں۔ کچھ بھی ہوتا رہے۔[۱]

ڈاکٹر محمد یوسف اس صحیفہ کے متعلق جس کو لکھنے کی اجازت رسول اکرمؐ نے حضرت عبداللہؓ کو دی تھی یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''یہ صحیفہ فقہ سے مخصوص نہیں تھا۔ جن کے پاس یہ صحیفہ تھا وہ کہتے تھے کہ'' اگر یہ صحیفہ اور ان کی زرعی

۱۔ تاریخ الفقه الاسلامی بحوالہ تاریخ ابن عساکر، استاد محمود ابوریہ، اضواء علی السنة المحمدیة، محمد عجاج خطیب السنة قبل التدوین

زمین محفوظ رہے تو انہیں پھر کچھ اور اندیشہ نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ ان کی تمام دینی اور دنیاوی ضرورتوں کا کفیل تھا۔ ان کی اس بات سے ایک اور نتیجہ بھی نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس صحیفے میں حلال وحرام سے متعلق بہت کافی مسائل جمع کئے گئے تھے۔ جب ہی تو وہ کتاب اللہ کے ساتھ مل کر ان صاحب کو مسائل دریافت کرنے کی ضرورت سے بے نیاز کرتا تھا۔ یہ حضرت عبداللہؓ فقہ کے متعلق کہتے تھے کہ فقہ بہترین نعمت ہے جو انسان کو عطا ہوئی ہے۔'' ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کچھ نہ کچھ تحریریں فقہی مسائل اور احکام کے بارے میں تاریخ اسلام کے آغاز ہی میں لکھی جا چکی تھیں۔[1]

ڈاکٹر محمد یوسف نے یہاں جو کچھ بیان کیا ہے اور صحابہ کرام کے دور میں حدیث اور فقہ کے مدوّن نہ ہونے کے ضمن میں جو کچھ کہا ہے اگر ہم ان دونوں کا موازنہ کریں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی رائے سے رجوع کرلیا ہے۔

بہرحال ہمیں اس سے انکار نہیں کہ طلوع اسلام کے آغاز ہی سے تدوین کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ موثق ذرائع سے ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ گو برادران اہل سنت کی تحریروں میں ان شیعہ آثار کا کوئی قابل ذکر تذکرہ نہیں ملتا جن کا شیعہ ذرائع سے پتہ چلتا ہے۔

ہم اس سے پہلے وہ اسباب بتا چکے ہیں جن کی وجہ سے فقہ، حدیث فتاویٰ اور احکام سے متعلق امام علیؑ اور ان کے شیعوں کے آثار نمایاں اور مشہور نہ ہوسکے۔

یہاں ہم مزید تائید کے لئے استاد محمد ابو زہرہ کی ایک عبارت ان کی کتاب الامام الصادقؑ سے نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''ہمارے لئے یہ اقرار کرنا ضروری ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں امام علی علیہ السلام کا فقہ، ان کے فتاویٰ اور ان کے فیصلے نہ تو اس تناسب سے آئے ہیں جو انہوں نے اپنی خلافت کے دوران

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی صفحہ ۱۸۶

میں انجام دیئے اور نہ اس تناسب سے جو انہوں نے خلفائے راشدین کے عہد میں انجام دیئے۔ امام علیؑ کی ساری زندگی فقہ اور علم دین کی خدمت میں گزری۔ وہ تمام صحابہ کرام میں رسول اکرمؐ سے سب سے نزدیک تھے۔ وہ بچپن ہی سے رسول اکرمؐ کے مبعوث ہونے سے بھی پہلے سے ان کی صحبت میں رہے تھے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اپنے پاس نہیں بلالیا وہ ان کے ساتھ رہے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ اہل سنت کی کتابوں میں جتنی روایتیں ان سے نقل ہوئی ہیں اس سے کئی گنا زیادہ نقل ہوتیں۔ اگر ہم امام علیؑ کے فقہ اور ان کی روایات کے اکثر مسلمانوں سے مخفی رہنے کے اسباب تلاش کریں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ امام علیؑ کے آثار فیصلوں اور فتوؤں کو مخفی رکھنے میں زیادہ تر بنی امیہ کی حکومت کا دخل تھا۔ کیونکہ یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ ایک طرف تو بنی امیہ منبروں پر امام علیؑ پر لعنت بھیجیں اور دوسری طرف علماء کو آزاد چھوڑ دیں کہ وہ ان کی احادیث روایت کریں اور ان کے فتوے اور فیصلے لوگوں کو سنائیں خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ان کے اقوال کا تعلق اسلامی حکومت کے بنیادی امور سے تھا۔

عراق میں جہاں امام علیؑ رہتے تھے اور جہاں ان کے علم کو فروغ ہوا بنی امیہ کی حکومت کی ابتدا سے اس کے وسط تک برابر سخت گیر اور ستم پیشہ حکام حکومت کرتے رہے۔ اس دور میں اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ یہ حکام اس بات کی اجازت دیتے کہ امام علیؑ کی آراء مسلمانوں میں پھیلنے پائیں خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ امام علیؑ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر کے اس کام میں رخنہ ڈال رہے تھے۔[1]

ڈاکٹر محمد یوسف کی تحریر سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کے دور میں حدیث کی تدوین کا تو معمول نہیں تھا البتہ اس زمانے میں

۱۔ الامام الصادق صفحہ ۱۲۶

فقہی مسائل اور احکام کی تدوین کافی ہوئی۔ لیکن اس طرح کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ اس زمانے میں جو کچھ مدوّن ہوا وہ بجز حدیث کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اس وقت جو فقہی احکام مدوّن ہوئے وہ بھی دراصل رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام سے منقول روایات تھیں جو احکام پر مشتمل تھیں۔ موطاء جسے سنی محدثین فقہ کی سب سے پہلی کتاب کہتے ہیں وہ بھی مجموعہ ہے رسول اکرمؐ اور صحابہ کرام کی احادیث کا مختلف مسائل کے بارے میں جن کی تعداد دس ہزار تک پہنچتی ہے۔[1]

بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ڈاکٹر محمد یوسف جس تدوین کی بات کررہے ہیں وہ حدیث کی تدوین تھی یا فقہ کی۔ صحیفہ صادقہ کو بہرصورت ایک حقیقت سمجھتے ہیں اور اس سے متعلق روایات کی صحت اور عدم صحت سے وہ کوئی بحث نہیں کرتے حالانکہ وہ اس دور میں حدیث و فقہ کے مدوّن نہ ہونے کی وجوہات بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ”سوائے قرآن مجید کے مجھ سے سن کر کچھ نہ لکھو۔ جس کسی نے مجھ سے سن کر کچھ لکھا ہو اسے چاہئے کہ اسے مٹا دے۔“

ایک اور روایت وہ یہ نقل کرتے ہیں کہ زید بن ثابتؓ کہتے تھے: ”رسول اکرمؐ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کوئی بات آپ سے سن کر نہ لکھیں۔“

اس سب کے باوجود وہ اس صحیفے کے بارے میں یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ ”رسول اکرمؐ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اجازت دی تھی کہ خوشی اور غصے کی حالت میں آپ جو کچھ فرمائیں وہ اسے لکھ لیا کریں۔“ کہتے ہیں کہ اس صحیفے میں فقہ کے بارے میں کچھ ایسے مضمون اور نکات درج تھے جو عبداللہ بن عمرو بن عاص کی فقہ سے متعلق تمام ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی تھے اور ان کی مدد سے حضرت عبداللہؓ سب مسائل کا حل دریافت کرسکتے تھے۔

۱۔ اضواء علی السنة المحمدیة صفحہ ۲۷۱

مگر سوال یہ ہے کہ آخر یہ دونوں باتیں جمع کیسے ہوسکتی ہیں؟ ایک موقع پر تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احادیث جمع کرنے کی قطعی ممانعت فرما رہے ہیں اور اس فعل کو کسی طرح جائز نہیں سمجھتے۔ دوسرے موقع پر عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اجازت عطا فرما رہے ہیں کہ آپ خوشی اور غصے کی حالت میں جو فرمائیں وہ عبداللہؓ لکھ لیا کریں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ یہ عبداللہؓ کوئی سابقین اولین میں سے نہیں تھے کہ انہیں اس بلند مقام سے نوازا جاتا اور نہ ہی وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقرباء میں سے تھے کہ انہیں کوئی خصوصیت حاصل ہوتی۔

حضرت عبداللہؓ اپنے باپ کے ساتھ ۸ھ میں یعنی رسول اکرمؐ کی رحلت سے کل دو سال قبل[۱] یعنی پندرہ سال کی عمر میں اسلام لائے تھے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ۶۵ھ میں ان کا انتقال ہوا اور انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۲ سال کی تھی جیسا کہ ابن سعد نے طبقات الکبریٰ[۲] میں کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب حضرت عبداللہؓ اسلام لائے تو ان کی عمر فقط سترہ سال کی تھی۔ اس حساب سے رسول اکرمؐ کی وفات کے وقت ان کی عمر سترہ سال تھی اور انہوں نے فقط دو سال رسول اکرمؐ کا زمانۂ حیات پایا تھا۔ اس طرح جب وہ رسول اکرمؐ کی صحبت سے مستفیض ہوئے تو ان کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر جو انہیں دو سال کا موقع ملا تو وہ اس دوران میں بھی لڑکپن کی حدود سے باہر نہیں نکلے تھے۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاص کا شمار رسول اکرمؐ کے مخصوص اور قریبی صحابہ میں نہیں تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اکرمؐ انہیں خاص طور پر اس کام کے لئے منتخب کریں اور انہیں اپنے اہلبیتؑ پر ترجیح دے کر اس کی اجازت دیں کہ "چاہے آپ خوشی کی حالت میں ہوں یا غصے کی وہ آپ کی باتیں لکھ لیا کریں۔" بلکہ بقول مجاہد کے تو تنہائی میں بھی لکھ لیا کریں جیسا کہ صحیفہ سے متعلق مجاہد کی روایت میں کہا گیا ہے۔

۱۔ شرح نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۲ ۲۔ جلد ۴ صفحہ ۲۶۸

بہرحال استاد ابوریہ نے بعض محدثین سے نقل کیا ہے کہ جس صحیفے کا نام حضرت عبداللہؓ نے صادقہ رکھا تھا وہ محض دعا و درود پر مشتمل تھا اور اس میں فقہی احکام تھے ہی نہیں۔[۱]

زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد یوسف وغیرہ نے اس خیالی صحیفے کے بارے میں کوری جانب داری سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف بغیر کسی تامل کے یہ روایت بیان کرتے ہیں اور بغیر کسی چھان پھٹک کے اس کی صحت کی تصدیق کردیتے ہیں۔ وہ نہ صحیفے کی روایت پر غور کرتے ہیں، نہ یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ کتنی مدت رسول اکرمؐ کی صحبت میں رہے تھے اور نہ ان احادیث کی طرف توجہ دیتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فقہ و حدیث کے قبیل سے ہر چیز لکھنے کی ممانعت کی تھی۔

ہمارا تعجب اس وقت بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد یوسف دوسرے موقعوں پر حقائق قبول کرنے میں بھی بہت محتاط ہیں اور بعض جگہ تو بحث کا منطقی نتیجہ اخذ کرنے میں بھی پہلو تہی کرتے ہیں۔ خصوصاً جہاں رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد شیعہ فقہ و حدیث کی تدوین کی بات ہو۔

تدوین حدیث کی بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ شیعہ مؤلفین مثلاً علی بن رافع، سعید بن میتب اور صحابہ کے زمانے سے لے کر اس وقت تک کہ جب تک تصنیف و تالیف عام نہیں ہوگئی تھی، حدیث و فقہ کے ان دوسرے شیعہ مؤلفین کا ذکر ضرور کرتے ہیں جن کا ذکر سید حسن صدر نے بھی **تاسیس الشیعہ** میں کیا ہے۔ اسی طرح بعض ایسے افراد کا بھی ذکر کرتے ہیں جن کا ابن ندیم نے شیعہ فقہاء اور مصنفین میں شمار کیا ہے لیکن اس تمام تذکرے سے وہ کوئی مثبت نتیجہ اخذ کیے بغیر گزر جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اہل سنت کے محدثین اور ان مصنفین

۱۔ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ صفحہ ۲۲۵ نقل از تاریخ بغداد، خطیب بغدادی

نے جنہوں نے حدیث کے راویوں کے حالات لکھے ہیں اول تو اکثر شیعہ رجال کا تذکرہ ہی نہیں کیا اور جن کا تذکرہ کیا بھی ہے تو ان پر دروغ گوئی اور حدیث میں جعل سازی کا الزام لگایا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل سنت کے نزدیک شیعہ راوی قابل اعتماد نہیں۔[1]

ڈاکٹر محمد یوسف اس موضوع کو تشنہ چھوڑ کر گزر جاتے ہیں۔ ابن ندیم اور دوسرے شیعہ علماء نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن دوسری طرف وہ بعض مسائل کے بارے میں نہایت آسانی سے بڑے قطعی نتیجوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پیش کردہ روایات کے قابل اطمینان ہونے کی کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں ہوتی۔ وہ افراد کی زندگی اور ان کی خصوصیات پر ذرا غور نہیں کرتے۔ ان مسائل کے بارے میں بھی ان کی بحث اتنی ہی کمزور ہے جتنی کہ صحیفہ صادقہ کے بارے میں جس کو وہ ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ گو انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ سنی محدثین نے شیعہ راویوں اور محدثوں پر محض ان کے تشیع اور ان کی اہلبیت سے محبت کی وجہ سے ان پر دروغ گوئی اور حدیث میں جعل سازی کا الزام لگایا ہے۔ اس کے باوجود وہ شیعہ آثار پر بحث کرتے ہوئے ان ہی لوگوں کی رائے پر قناعت کرتے ہیں۔

شیخ محمد خضری اپنی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی میں کہتے ہیں:

''چونکہ شیعہ امام علی (ع) اور ان کے اہلبیت کی تائید میں نہایت مبالغہ اور افراط سے کام لیتے ہیں انہوں نے رسول اکرمؐ سے بکثرت ایسی روایات نقل کی ہیں جن کے بارے میں کسی کو ذرا بھی شک نہیں ہوسکتا کہ ان کی رسول اکرمؐ کی طرف نسبت محض جھوٹ ہے، اسی وجہ سے اہل علم نے کسی ایسے شخص کی روایت قبول کرنے میں تامل کیا ہے جو شیعہ ہو یا جس کے متعلق خیال ہو کہ وہ شیعہ ہے۔''

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی صفحہ ۱۹۲

اہل سنت کے نزدیک تشیع ناقابل معافی گناہ ہے۔ ساتھ ہی ان کے نزدیک ہر صحابی عادل ہے اور کسی صحابی پر کوئی تنقید روا نہیں ہے اور نہ کسی صحابی پر کوئی طعن کیا جاسکتا ہے۔[۱] یہ لوگ مروان[۲] کے بارے میں کہتے ہیں: "اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مروان کو رسول اکرمؐ کی صحبت کا شرف حاصل ہے تو پھر اس پر کوئی طعن جائز نہیں۔"

بخاری اپنی صحیح میں مروان کی روایت نقل کرتے ہیں مگر انہوں نے فرزند رسول امام جعفر صادقؑ کی کوئی روایت نہیں لی۔ وہ ایسا کرنا درست نہیں سمجھتے تھے۔[۳]

عجلی کے خیال میں، امام حسین علیہ السلام کا قاتل عمر ابن سعد اور عمران بن حطان خارجی جس نے امام علی علیہ السلام کے قاتل ابن ملجم (لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) کی مدح میں یہ شعر کہا تھا ثقہ ہیں:

يَا ضَرْبَةً مِنْ تَقِيٍّ مَا اَرَادَ بِهَا ‏ ‏ ‏ اِلَّا لِيَبْلُغَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ رِضْوَانَا

"وہ ضرب جو ایک متقی شخص نے لگائی تھی جسے خدائے عرش کی رضا حاصل کرنے کے سوا کوئی اور آرزو نہیں تھی۔"

اہل سنت سمرۃ بن جندب کو بھی عادل صحابی شمار کرتے ہیں اور سمرۃ کی روایات اور احادیث قبول کرتے ہیں۔ صحاح کے مؤلفین نے بھی سمرۃ کی حدیث قبول کی ہے۔ حالانکہ سمرۃ ان سرداروں میں سے ایک تھا جن کو ابن زیاد نے امام حسینؑ کے

۱و۳ اضواء علی السنة المحمدية صفحہ ۳۶۰-۳۶۲

۲۔ مروان طرید رسولؐ حکم بن عاص کا بیٹا تھا۔ رسول اکرمؐ نے اسے مدینہ سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ ابن عبد البر کی الاستیعاب میں ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی نقلیں اتارا کرتا تھا حتی کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے خود اسے یہ حرکتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ مروان اس وقت سات آٹھ برس کا تھا اور وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ طائف میں رہا۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنے اپنے زمانہ خلافت میں حکم بن ابی العاص کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی تھی مگر حضرت عثمانؓ نے نہ صرف یہ کہ حکم کو اپنی خلافت میں مدینہ واپس بلا لیا تھا بلکہ مروان کو اپنا چیف سکریٹری بنالیا تھا۔

(خلافت و ملوکیت از مولانا مودودی صفحہ ۱۱۰)

قتل کے لئے بھیجا تھا۔ سمرۃ نے خود بھی امام حسین علیہ السلام کے قتل کی ترغیب دی تھی۔ جب ابن زیاد نے سمرۃ کو بصرہ میں اپنا جانشین مقرر کیا تو سمرۃ نے چھ مہینے کی مدت میں آٹھ ہزار سے زیادہ صلحاء کو قتل کرادیا۔ ابوسواد العدوی کہتے ہیں:

"سمرۃ بن جندب نے ایک دن صبح کے وقت میری قوم کے ۴۵ افراد کو قتل کردیا جو سب کے سب جامع قرآن تھے۔"[1]

صحابی کچھ بھی کرے، کسی گناہ کا بھی مرتکب ہو وہ بہرحال مجتہد ہے۔ وہ ہر معاملے میں معذور ہے۔ اسی وجہ سے اہل سنت بسر بن ابی ارطاۃ[2] کو بھی مجتہد کہتے

۱۔ سفینۃ البحار، محدث شیخ عباس قمی صفحہ ۶۵۴ یہی بات اتقان المقال میں شرح نہج البلاغہ کے حوالے سے بیان ہوئی ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی وغیرہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

۲۔ زیاد بن سُمیہ سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بسر بن ابی ارطاۃ نے کئے جسے حضرت معاویہ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؑ کے قبضے سے نکالنے کے لئے بھیجا تھا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لئے مامور کیا تھا۔ اُس شخص نے یمن میں حضرت علیؑ کے گورنر عبید اللہ بن عباسؓ کے دو چھوٹے بچوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ان بچوں کی ماں اس صدمے سے دیوانی ہوگئی۔ بنی کنانہ کی ایک عورت جو یہ ظلم دیکھ رہی تھی، چیخ اٹھی کہ "مردوں کو تو تم نے قتل کر دیا، اب ان بچوں کو کس لئے قتل کر رہے ہو؟ بچے تو جاہلیت میں بھی نہیں مارے جاتے تھے۔ اے ابن ارطاۃ، جو حکومت بچوں اور بوڑھوں کے قتل اور بے رحمی و برادر کشی کے بغیر قائم نہ ہوسکتی ہو اس سے بری کوئی حکومت نہیں۔" (خلافت وملوکیت از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۱۷۶)

چونکہ بچوں کو قتل کرنے کا جرم بہت سنگین تھا اس لئے اس سنگدل شخص کا ضمیر بیدار ہوگیا اور اسے ملامت کرنے لگا۔ جب وہ سوتا تو حالت خواب میں اسے وہی منظر دکھائی دیتا۔ راستا چلتے ہوئے یہ دونوں بے گناہ بچے اس کی نگاہوں کے سامنے مجسم ہو جاتے۔ اسی طرح اس کے دوسرے جرائم بھی اسے نظر آنے لگتے۔ رفتہ رفتہ اس کا دماغ چل گیا اور وہ دیوانہ ہوگیا۔ وہ ایک لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو کر لکڑی کی بنی ہوئی ایک تلوار ہاتھ میں لئے سڑکوں پر دوڑتا پھرتا اور گھوڑے کو چابک مارتا۔ بچے اس کے اردگرد جمع ہو جاتے اور اس پر آوازیں کستے۔ (اسلامی داستانیں از آیت اللہ مرتضیٰ مطہری صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان)

ہیں حالانکہ بسر نے امام علی علیہ السلام کے تیس ہزار شیعوں کو قتل کیا تھا۔ جب معاویہ نے بسر کو یمن اور حجاز بھیجا تو حکم دیا کہ جو علی (علیہ السلام) کی اطاعت کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ بسر نے عبیداللہ بن عباس کے دو بچوں کو قتل کر دیا۔ بچوں کی ماں عائشہ بنت مدان نے ان کے مرثیے میں کہا:

اَنْحٰی عَلٰی وَدَجِیْ اِبْنَیَّ مُرْھِفَۃً مَشْحُوْذَۃً وَ کَذَا الْاٰثَامُ تَقْتَرِفُ

''میرے بچوں کے گلے تیز تلوار سے کاٹ ڈالے۔ یہ وہ گناہ ہے جس نے میرے غصے کی آگ بھڑکا دی۔''

سمرۃ اور بسر بن ابی ارطاۃ جیسے بہت سے افراد سنی محدثوں کی نظر میں عادل اور مجتہد ہیں لیکن شیعہ دروغ گو اور وضاع ہیں۔ ان کی روایت قبول نہیں کی جاسکتی اور ان کی احادیث پر اعتماد روا نہیں۔

اضواء علی السنة المحمدية میں حافظ ابن حجر کا یہ قول منقول ہے:

''احادیث کی تدوین اور تبویب تابعین کے دور کے آخر میں ہوئی۔ اس وقت علماء مختلف شہروں میں منتشر ہو چکے تھے اور خوارج اور روافض کی وجہ سے بدعات بہت پھیل گئی تھیں۔''

روافض کے لفظ کا مفہوم اہل تشیع کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو شخص بھی اہل سنت کی کتابوں اور ان کی احادیث کا مطالعہ کرے گا اسے اس لفظ کے یہی معنی ملیں گے۔

شیخ محمد خضری کی رائے میں تو خوارج بھی شیعوں سے کم جھوٹ بولتے تھے۔[۱]

افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس زمانے میں جبکہ اہل قلم افکار، اوہام و خرافات کے بندھن سے آزاد ہو گئے ہیں، عمیق ترین تفکر اور حقائق کی راہیں کھل گئی ہیں اور اسلامی آثار کے محقق حقیقت کی دریافت اور گزشتہ تاریخ پر تنقیدی نظر ڈالنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، اب بھی جب کبھی شیعوں اور ان کے آثار پر بحث ہوتی ہے تو وہی پرانی

۱۔ تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۱۴۰

زبان استعمال کی جاتی ہے اور اسی پرانے قلم سے لکھا جاتا ہے جس سے وہ یاد تازہ ہوجاتی ہے کہ یہ لوگ اظہار حقیقت اور تاریخ کی خدمت کے لئے قلم نہیں چلاتے بلکہ ارباب سیاست اور ستم پیشہ حکام کی خوشامد کے لئے لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد یوسف کے خیالات بے لچک ہیں۔ وہ ہر بحث و استنتاج میں ایک ہی ڈھرے پر چلتے ہیں اور ایک ہی طرح کے نتائج نکالتے ہیں لیکن جہاں شیعوں کی بات آجاتی ہے وہ اگلے لوگوں کی تحریروں پر اس طرح اعتماد کرتے ہیں گویا وہ قرآن کی آیت ہے جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں۔ وہ شیعوں کے ساتھ فرمانروایان وقت کا سلوک یا تو بھول گئے ہیں یا انہوں نے اسے ازخود فراموش کردیا ہے۔ یہ حکام کی سیاست ہی تو تھی جس نے سنی محدثین کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس پر آمادہ کیا کہ وہ شیعوں پر رفض و دروغ اور حدیث سازی کا الزام لگائیں یا ان کے متعلق دوسرے ایسے الفاظ استعمال کریں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ شیعہ ناقابل اعتبار ہیں۔

ڈاکٹر محمد یوسف کو چاہئے تھا کہ وہ شیعہ تاریخ کا مطالعہ کرتے اور دیکھتے کہ مختلف ادوار میں شیعوں پر کیا گزری۔ اس پر توجہ کرتے کہ اموی حکومت کی ظالمانہ سیاست کا ان کے ساتھ کیا رویہ رہا تاکہ وہ سمجھ سکتے کہ اس سیاست کا شیعوں پر اور ان مؤرخین پر جنہوں نے ان کی تاریخ لکھی کیا اثر پڑا ہے اور کیوں شیعہ بزرگوں پر دروغ گوئی، حدیث سازی اور رافضیت کا الزام لگایا گیا ہے۔ یہ لوگ ابوہریرہ، سمرۃ بن جندب، عمر بن سعد، عمران بن حطان خارجی اور معاویہ بن ہند وغیرہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور انہیں زہد و تقویٰ اور صداقت و امانت کا پیکر جانتے ہیں اور ان کی حدیثوں کو قابل اعتماد جانتے ہیں مگر صادق اہلبیت امام جعفر بن محمد علیہما السلام کی حدیث کو صحیح نہیں سمجھتے۔ (معاویہ اگر خلیفہ راشد سے جنگ صفین لڑے تو یہ لوگ اس کی اس غلطی کو بھی اجتہاد گردانتے ہیں)۔ بقول غالبؔ

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

ڈاکٹر محمد یوسف تدوین فقہ و حدیث اور شیعہ آثار کی بحث جاری رکھتے ہوئے آخر زید بن علی بن حسین کے اس فقہی مجموعے تک پہنچتے ہیں جس کا بڑا حصہ انہوں نے اپنے جدامجد امام علی علیہ السلام سے روایت کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف اس کے بارے میں کہتے ہیں: ''بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی وجہ سے اس میں شک پیدا ہوتا ہے کہ اس مجموعے کی نسبت زید بن علی کی طرف صحیح ہے یا نہیں۔''[1]

وہ اپنی بات کے ثبوت میں دو دلیلیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ تنہا ابو خالد واسطی نے اس مجموعے کو زید سے روایت کیا ہے اور ابو خالد واسطی سے بھی سوائے ایک شخص ابراہیم بن زبرقان تمیمی کوفی کے کوئی اور اسے روایت نہیں کرتا

۲۔ ثقہ علمائے رجال اور حفاظ حدیث نے واسطی کو جھوٹا اور وضاع کہا ہے۔

اس کے علاوہ زید بن علی سے منسوب فقہی مجموعہ اس قدر مرتب اور منظم ہے کہ ایسی ترتیب کا وجود اس زمانے میں جو اہل سنت کی قدیم ترین فقہی کتاب مؤطاء سے بھی نصف صدی پہلے کا ہے ہرگز قرین قیاس نہیں۔ اگر ایسی کوئی کتاب لکھی گئی ہوتی تو امام مالک کو ضرور معلوم ہوتا اور وہ ضرور اس سے استفادہ کرتے۔

ان دو وجوہ کی بناء پر ڈاکٹر محمد یوسف اس شیعی کتاب کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ وہ شیعہ آثار کے متعلق جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ زمانۂ گزشتہ اور دور حاضر کے شیعہ مصنفین اور محدثین کے بیان سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے نزدیک کسی شیعہ راوی کے قابل اعتبار ہونے کے لئے یہ قطعاً ضروری ہے کہ معتبر سنی محدثین نے اسے قابل اعتماد اور ثقہ کہا ہو یا کم از کم اس کے بارے میں سکوت کیا ہو۔ ہمارے لئے اس شرط کو آسانی سے ماننا دشوار ہے کیونکہ ڈاکٹر محمد یوسف جن محدثین کو معتبر سمجھتے ہیں وہ ہم سے سیکڑوں سال پہلے ہوئے ہیں اور وہ شیعوں اور شیعہ داعیوں کو پہلے ہی دروغ گو اور وضاع کہہ گئے ہیں۔

۱۔ تاریخ الفقہ الاسلامی صفحہ ۱۹۴

اس اثر کو رد کرنے کی دوسری دلیل بھی بے اصل ہے۔ جب کوئی روایت صحیح حدیث کی شرائط پر پوری اترتی ہو تو اس کا خبر واحد ہونا مضر نہیں۔ پھر واسطی سے تنہا ابراہیم بن زبرقان ہی نے اس مجموعے کو روایت نہیں کیا ہے بلکہ نصر بن مزاحم منقری وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔[1]

ڈاکٹر محمد یوسف نے اس اثر کو رد کرنے کے لئے عجیب عجیب مغالطوں سے کام لیا ہے۔ ہمارا مقصد اس اثر کا دفاع کرنا نہیں اور نہ ہم شیعہ آثار میں ایک اور کتاب کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ موثق ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ دوسروں سے برسوں پہلے شیعہ دسیوں کتابیں لکھ چکے تھے۔ جن مصنفین نے شیعہ تالیفات سے بحث کی ہے انہوں نے شاید اس لئے اس اثر کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہ کتاب شیعہ امامیہ کے اس فقہ کے مطابق نہیں ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے منسوب ہے۔ مگر یہ بات خلاف قیاس نہیں کہ زید بن علی کا کوئی مجموعہ موجود ہو اور وہ فقہ جعفریہ کے مطابق نہ ہو کیونکہ اموی دور میں اکثر شیعہ فقہاء تشدد اور قتل کے خوف سے اپنے فتوؤں میں تقیہ سے کام لیتے تھے۔

زید بن علی سے منسوب مجموعے کی کوئی اصلیت ہو یا نہ ہو، ہمیں تو اعتراض ڈاکٹر محمد یوسف کی اس روش پر ہے جو انہوں نے قدیم مؤرخین اور وظیفہ خوار تذکرہ نویسوں کی تقلید میں اس مجموعے کو رد کرنے کے لئے اختیار کی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ انہیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے صحیفے کی بابت کوئی شک نہیں حالانکہ اس کی صحت میں ہر لحاظ سے شک ہونا چاہئے۔

استاد عبدالرزاق مصطفیٰ عصر حاضر کے ان مصنفین میں سے ہیں جنہیں مجبوراً ہمارے دعوے کی تصدیق کرنی پڑی ہے۔ انہوں نے ان تاریخی مثالوں کے سامنے جن سے فقہ کی تدوین میں شیعوں کی سبقت ظاہر ہوتی ہے سر تعظیم خم کیا ہے۔ ہم نے

۱۔ رجال النجاشی صفحہ ۲۰۵

اس سے پہلے بھی ان کی تحریروں سے بعض اقتباسات پیش کیے ہیں۔ وہ شیعوں کی تدوین میں سبقت کے بعض شواہد نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

''بہرحال یہ دلائل اس بات کا ثبوت ہیں کہ شیعوں نے دوسرے مسلمانوں سے پہلے فقہ کی تدوین شروع کردی تھی اور شرعی احکام کی تدوین میں ان کا دوسروں سے سبقت لے جانا قدرتی بھی ہے کیونکہ وہ اپنے اماموں کی عصمت یا کسی ایسی ہی چیز کے قائل ہیں۔ یہی عقیدہ انہیں اپنے ائمہ کے فیصلوں اور فتووں کے جمع کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ شروع ہی سے شیعیت کا اثر غیر عرب مسلمانوں پر زیادہ رہا ہے جن کی خصوصیات قوت حافظہ اور ناخواندگی نہیں تھیں اور نہ وہ تحریر اور تصنیف وتالیف کے کام سے بیگانہ تھے۔ [1]

۱۔ تمہید لتاریخ الفلسفہ صفحہ۲۰۲

لگتا ہے کہ مختلف دور میں شیعوں پر ہر طرح کی الزام تراشی کرنے والے اہل قلم قرآن مجید کا یہ حکم فراموش کر بیٹھے تھے جس میں خداوند متعال نے صاف طور پر فرمایا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (سورہ مائدہ: آیت۸)

'' اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ عدل کرنا چھوڑ دو۔ عدل سے کام لو کیونکہ یہی بات پرہیزگاری کے قریب ترین ہے۔''

عہد تابعین کے شیعہ مصنفین

ہم نے کچھ شیعہ فقہاء کا ذکر کیا تھا جنہوں نے رحلت رسولؐ کے بعد فقہ اور دیگر موضوعات پر تصنیف و تالیف کی بنیاد ڈالی۔ اسی مناسبت سے ہم نے جناب علی بن ابی رافع کا نام لیا تھا جو امیرالمومنینؑ کے اصحاب میں سے تھے اور آپ کے کاتب رہے تھے۔ انہوں نے فقہ میں ایک کتاب جمع کی تھی جو امام علیؑ نے خود املا کرائی تھی۔ ہم نے ان کے بھائی عبداللہ کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ عبداللہ نے ایک کتاب ان لوگوں کے بارے میں لکھی تھی جو جنگ صفین میں امام علیؑ کے ساتھ تھے۔

شیخ طوسی فہرست المؤلفین میں لکھتے ہیں: ''عبداللہ نے ایک کتاب میں امیرالمومنینؑ کے فیصلے جمع کئے تھے اور جیسا کہ الاصابہ اور المراجعات میں ہے کہ انہوں نے ایک کتاب ان صحابہ کے بارے میں لکھی تھی جو جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں شہید ہوئے۔'' عبیداللہ اور ان کے بھائی علی کبار تابعین میں سے تھے۔ ایک اور تابعی جنہوں نے فقہ میں کتاب لکھی ربیعہ بن سمیع ہیں۔ نجاشی نے طبقہ اول کے شیعہ مؤلفین میں ان کا نام لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ''ربیعہ بن سمیع نے ایک کتاب چوپایوں کی زکوٰۃ کے بارے میں تالیف کی تھی۔ اس میں امیرالمومنینؑ کی روایات تھیں۔'' اتقان المقال میں ربیعہ کا شمار علمائے رجال کی اصطلاح کے مطابق افراد حسن میں کیا گیا ہے اور لکھا ہے۔ ''ربیعہ نے ایک کتاب چوپایوں کی زکوٰۃ کے موضوع پر لکھی تھی اور اس میں بتایا ہے کہ ان پر کتنی زکوٰۃ لی جائے گی۔''

شیخ نجاشی اور دوسرے علمائے رجال نے ربیعہ کا شمار شیعہ مؤلفین میں کیا ہے۔

ثابت بن دینار ان تابعین میں سے ہیں جنہوں نے تصنیف و تالیف کا دور شروع ہونے سے بھی پہلے اسلامی آثار کے بارے میں کتاب لکھی۔ ان کی کنیت ابوحمزہ ثمالی ہے۔ شیخ طوسی فهرست المؤلفین میں لکھتے ہیں: "ابوحمزہ ثمالی کی دو کتابیں النوادر اور الزهد کے نام سے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کو عبیداللہ بن زیاد نے محمد بن عباس سے اور انہوں نے ابوحمزہ سے روایت کیا ہے۔"

سید حسن صدر کہتے ہیں: "ابوحمزہ ثمالی اہلبیتؑ سے محبت اور ان کی پیروی پر ثابت قدم تھے۔ وہ امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ کے اصحاب میں سے تھے۔"

سید حسن صدر یہ بھی لکھتے ہیں: "ثعلبی، ابوحمزہ کی تفسیر پر اعتماد کرتے اور اس سے روایات نقل کرتے ہیں۔"[1]

ابن ندیم نے الفهرست میں لکھا ہے: "ابوحمزہ کی قرآن مجید کی تفسیر میں ایک کتاب ہے۔" ابن ندیم نے ان کا شمار مفسرین میں کیا ہے۔

اتقان المقال میں لکھا ہے: "ابوحمزہ ہمارے صالح اصحاب اور ثقہ افراد میں سے تھے۔ ان کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کہتے ہیں: "ابوحمزہ اپنے زمانے کے سلمان تھے۔" ایک اور روایت میں ہے کہ امام رضاؑ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ "ابوحمزہ اپنے زمانے کے لقمان تھے۔"[2]

شیخ طوسی نے فهرست المؤلفین میں ابوحمزہ کا شمار شیعہ مصنفین میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ الزهد اور النوادر ان کی تصانیف ہیں۔ محدث شیخ عباس قمی نے بھی الکنیٰ والالقاب میں وہی لکھا ہے جو اتقان المقال میں ہے۔

نجاشی نے اپنی اسمائے رجال کی کتاب میں ابوحمزہ کی دو کتابوں النوادر اور الزهد کے علاوہ ان کی تفسیر میں ایک کتاب اور حقوق کے بارے میں ایک ایسے

۱۔ تأسیس الشیعة لعلوم الاسلام صفحہ ۲۷۳

۲۔ اتقان المقال شیخ محمد طٰہٰ نجف

رسالے کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے امام زین العابدینؑ سے نقل کیا تھا۔ نجاشی مزید لکھتے ہیں: ''ابوحمزہ کے تین بیٹے تھے جن کے نام نوح، منصور اور حمزہ تھے۔ یہ تینوں زید بن علی کے ساتھ مارے گئے۔ ابوحمزہ امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کی عمر طویل ہوئی یہاں تک کہ انہوں نے امام موسیٰ کاظمؑ کا زمانہ پایا۔''

تابعین میں ایک اور جنہوں نے تصنیف و تالیف کا دور شروع ہونے سے پہلے کتاب لکھی عبیداللہ بن علی حلبی ہیں۔ شیخ طوسی اپنی کتاب **فہرست المؤلفین** میں لکھتے ہیں: ''حلبی کی ایک کتاب ہے جو مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حلبی نے یہ کتاب امام جعفر صادقؑ کو سنائی تھی۔ آپ نے اس کتاب کو پسند فرمایا تھا اور کہا تھا کہ ''اُن لوگوں (خلفاء کے پیروکاروں) کے پاس اس جیسی کوئی کتاب نہیں۔'' شیخ طوسی نے ان راویوں کے نام بھی گنوائے ہیں جنہوں نے اس کتاب کی عبیداللہ بن علی حلبی سے روایت کی ہے۔

اتقان المقال میں لکھا ہے: ''عبیداللہ بن علی بن ابوشعبہ کوفی اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ تجارت کی غرض سے حلب آیا جایا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے حلبی مشہور ہوگئے۔ کوفہ میں ابوشعبہ کا خاندان ہمارے اصحاب کا ایک مشہور خاندان ہے۔ عبیداللہ بن علی کے دادا ابوشعبہ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے نمایاں لوگوں میں سے تھے۔ عبیداللہ سے ایک کتاب منسوب ہے۔ جب عبیداللہ نے یہ کتاب امام جعفر صادقؑ کو سنائی تو امام نے فرمایا: کیا خلفاء کے پیروکاروں کے پاس بھی تمہارے علم میں کوئی ایسی کتاب ہے؟''

اعیان الشیعہ میں پہلے تو ابوشعبہ کے خاندان کے متعلق نجاشی کا قول نقل کیا گیا ہے پھر عبیداللہ بن علی بن ابی شعبہ سے منسوب کتاب کا نام لکھ کر کہتے ہیں:

''اس کتاب کو عبیداللہ سے متعدد افراد نے روایت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روایتیں مختلف طرق سے آئی ہیں۔ نجاشی نے اپنی رجال کی کتاب میں بیان کیا ہے

کہ اس کتاب کو برقی نے بھی روایت کیا ہے۔ نجاشی نے یہ بھی لکھا ہے کہ تمام باوثوق شیعہ ذرائع نے عبیداللہ حلبی کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔"

ایک اور تابعی جنھوں نے فقہ میں کتاب لکھی ہے عمرو بن ابی مقدام ہیں جو ثابت بن ہرمز کے نام سے مشہور ہیں۔ نجاشی کہتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدینؑ سے اور ان کا بیٹا عمر بن ثابت ان سے روایت کرتا ہے۔ نجاشی نے اپنی رجال میں ایک بار اور ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: "ثابت بن ہرمز، امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں اور ان کی ایک کتاب بھی ہے۔

نجاشی اپنے طریقے کے مطابق اس کتاب کی سند کو اپنے سے عباد بن یعقوب تک پہنچاتے ہیں۔ عباد نے اس کتاب کو ثابت بن ہرمز سے روایت کیا ہے۔

سید حسن صدر لکھتے ہیں: "ثابت بن ہرمز کا فقہ میں ایک مجموعہ ہے جس کی روایت وہ امام زین العابدینؑ سے کرتے ہیں۔"

اتقان المقال اور علامہ حلی کے خلاصۃ الرجال میں بھی ثابت بن ہرمز کا تذکرہ ہے۔ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت نیک سیرت اور صاحب استقامت تھے۔

جن لوگوں نے فقہ اور تفسیر میں کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک اور محمد بن علی حلبی ہیں۔ شیخ طوسی نے ان کا شمار شیعہ مصنفین میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی ایک کتاب ہے۔ شیخ طوسی نے محمد بن علی حلبی کی توثیق کی ہے۔ اضافات علی فہرست المؤلفین میں ہے: "محمد بن علی بن ابی شعبہ ہمارے ممتاز اصحاب میں سے ہیں۔ وہ قابل اعتماد فقیہ ہیں۔ ان پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔"

نجاشی کتاب الرجال میں انہیں معتبر اور قابل اعتماد فقیہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ایک کتاب تفسیر میں بھی ہے۔ اس کتاب کی اپنی سند بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: "ان کی ایک اور مبوب کتاب حلال وحرام کے بیان میں ہے۔"

نجاشی نے اپنے طریقے کے مطابق ان سب افراد کے نام بھی لکھے ہیں جنہوں نے اس کتاب کو محمد بن علی سے روایت کیا ہے۔

ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم صحابہ اور تابعین کے دور کے تمام شیعہ فقہاء کے نام گنوائیں یا ان تمام کتابوں کا استقصاء کریں جو ان فقہاء نے فقہ، حدیث اور دوسرے اسلامی شعبوں میں لکھیں۔ ہمارا یہ مقصد قطعی نہیں۔ جو چیز ہمارے لئے اہم ہے اور جسے ہم واضح کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ صحابہ کے دور اور اس کے بعد تابعین کے دور میں شیعہ اسلامی معاشرے میں ہمیشہ سب سے آگے رہے۔ انہوں نے اسلام پر عمل کیا اور اسلامی احکام اور سنت کو پھیلانے میں کوشاں رہے۔ انہوں نے احادیث کو جمع کیا اور فقہ اور دوسرے اسلامی مباحث پر اوروں سے دسیوں سال پہلے کتابیں لکھیں۔ اگر ماضی اور حال کے مصنفین ان شیعہ فقہاء کی حق تلفی کے درپے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ان اگلوں کی تقلید کر رہے ہیں جنہوں نے شیعوں پر یا جن پر شیعیت کا شبہ تھا، بقول شیخ خضری کے دروغ گوئی اور بدعت پھیلانے کا الزام لگایا اور ان کے تفقہ اور دین و دانش میں ان کے بلند مقام کو نظر انداز کر دیا، جنہوں نے تاریخ کو حقیقت نگاری کے لئے نہیں بلکہ حکام اور خلفاء کی خوشامد کے لئے استعمال کیا۔ اس لئے انہوں نے کبھی اپنی یہ ذمہ داری نہیں سمجھی کہ دوسروں کے حقوق کا پاس کریں اور جس جماعت کی جو خصوصیات ہوں وہ بے کم و کاست بیان کریں۔

اس کتاب کے خاتمے پر ہم یہ بتاتے چلیں کہ اگرچہ اسماعیلی بھی اپنے آپ کو شیعہ امامی کہتے ہیں لیکن آج کل شیعہ سے مراد شیعہ اثناء عشری مذہب ہی ہوتا ہے۔ قدیم اور اصلی اسماعیلی مذہب عرب، افریقہ اور ایران میں بڑے نشیب و فراز سے گزرا ہے۔ قرامطی، نصیری، دروزی اور نزاری اسماعیلیوں کے مختلف فرقے ہیں۔ تاریخ کی شہادت کے مطابق قرامطیوں میں صوفیاء ہوئے ہیں۔ نزاری پیروں میں پیر صدر الدین (۷۷۰۔۸۱۹ھ) نے سندھ اور ہند خصوصاً گجرات میں نزاری دعوت کی تبلیغ میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے گجرات کے لوہانہ نسل کے ہندوؤں کو اپنا ہم مذہب بنایا اور انہیں خوجہ (Khoja) کا نام دیا۔ ڈیڑھ سو سال قبل ایران میں نزاری ریاست کے

خاتمے کے بعد نزاری امام، آغا خان محلاتی، ایران سے ہندوستان منتقل ہوئے اور اسماعیلی مذہب آغا خانوں کی قیادت میں اپنی تاریخ کے جدید دور میں داخل ہوا۔ نزاری، قاسم شاہی اور محمد شاہی دو سلسلوں میں منقسم ہیں۔ محمد شاہی (مومنی) نزاریوں کے ۴۰ امام ہیں۔ امیر محمد بن حیدر باقر اس سلسلے کے آخری امام ہیں جبکہ قاسم شاہی نزاریوں میں امامت جاری ہے اور پرنس کریم آغا خان چہارم ان کے ۴۹ ویں امام ہیں۔

گو کہ اثناء عشریوں اور اسماعیلیوں میں امامت کا تصور مشترک ہے لیکن دونوں کے ہاں اس کا مفہوم مختلف ہے۔ اثناء عشری اور اسماعیلی مذہب میں فرق یہ ہے کہ اسماعیلیوں میں امامت کا تصور سات کے ہندسے کے گرد گھومتا ہے۔ علاوہ ازیں اسماعیلی، بالخصوص باطنی، شرعی احکام میں تبدیلی کو جائز سمجھتے ہیں حتی کہ ان کے نزدیک شریعت کو بالکل رد کر دینا بھی جائز ہے۔ اسماعیلیوں کا فلسفہ ستارہ پرستوں سے ملتا جلتا ہے۔ اسلامی علوم اور احکام کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے مثلاً وضو کا باطنی مفہوم حُب امام ہے وغیرہ۔ وہ مسنون طریقے سے سلام بھی نہیں کرتے بلکہ یا علی مدد اور جواباً مولا علی مدد کہتے ہیں۔ اسماعیلیوں کے پہلے امام حضرت علیؑ اور پانچویں امام حضرت جعفر صادقؑ ہیں کیونکہ وہ حضرت حسنؑ کو امام نہیں مانتے۔

اثناء عشریوں کا اعتقاد ہے کہ حضور نبی کریمؐ کے بارہ وصی ہیں جو سب کے سب قریش میں حضرت ہاشم کی نسل سے ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا۔ ان میں کے پہلے حضرت علیؑ اور آخری حضرت مہدی موعودؑ ہیں نیز ان کے نزدیک شریعت کا ظاہری پہلو درست اور ناقابل تنسیخ ہے۔

فاطمی خلیفہ مستنصر کے بعد اس کے دو بیٹوں مُستعلی اور نزار کے مابین امامت کی گدی کے لئے جنگ ہوئی جس میں مُستعلی فتحیاب ہوا اور نزار گرفتاری کے بعد قید خانے میں انتقال کر گیا۔ یوں اسماعیلی نزاریہ اور مُستعلیہ فرقوں میں بٹ گئے۔ مستنصر کے دست راست حسن بن صباح کو جو نزار کی امامت کا قائل تھا مُستعلی نے مصر سے نکال دیا۔ چنانچہ حسن بن صباح ایران آ گیا جہاں اس نے نزاری مسلک کو پھیلایا۔ اس نے قلعہ الَمُوت اور بعد میں دوسرے قلعے فتح کر کے اپنی ریاست قائم کر لی۔ الَمُوت میں اپنی ریاست کے خاتمے کے بعد نزاری ائمہ صوفی مشائخ کے بھیس میں رہنے لگے۔ مُستعلوی اسماعیلی مصر اور یمن میں پھیل جانے کے بعد گیارھویں صدی میں ہندوستان وارد ہوئے تو انہوں نے ہندوؤں کی اونچی ذات بوہرہ کو اپنا ہم مذہب بنایا۔ بوہرہ اسماعیلی بھی بعد میں داؤدی، سلیمانی اور علوی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ بوہروں کا سب سے بڑا گروہ داؤدی ہے۔ بوہرہ اپنے مستور امام کے دوبارہ ظہور کے منتظر ہیں۔ ڈاکٹر محمد برہان الدین داؤدی بوہروں کے ۵۲ ویں داعی مطلق ''مُلاّ جی صاحب'' یا ''سیدنا صاحب'' کہلاتے ہیں۔

داؤدیوں کے اہم مذہبی فرائض میں حج کیلئے مکہ جانا اور نجف اور کربلا میں امام علیؑ اور امام حسینؑ کے مزارات کی زیارت کرنا شامل ہے۔ وہ عشرہ محرم میں امام حسینؑ کی مجالس بھی منعقد کرتے ہیں۔ اپنی مسجدوں میں ہر نماز کے بعد وہ اپنے ۲۱ ظاہر اماموں کے نام پڑھتے ہیں۔ وہ جمعہ اور عیدین نہیں پڑھتے۔ ان کا کیلنڈر جو فاطمی دور میں تیار کیا گیا تھا رویت ہلال پر مبنی نہیں بلکہ معین ہے۔

حالیہ زمانے تک عام طور پر غیر اسماعیلی حلقوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اسماعیلیوں کا بھی اپنا ایک خاص فقہی مسلک رہا ہے۔ اسماعیلی فقہ قاضی نعمان (۲۹۰-۳۶۳ھ) کی کتاب **دعائم الاسلام** پر مشتمل ہے۔ **دعائم الاسلام** کی پہلی جلد میں عبادات سے بحث کی گئی ہے مثلاً ایمان اور مذہبی فرائض جو اسماعیلی نظریے کے مطابق اسلام کے سات ارکان پر مشتمل ہیں مثلاً ولایت، طہارت، صلات، زکات، روزہ، حج و جہاد اور دوسری جلد میں معاملات مثلاً ماکولات، مشروبات، ملبوسات وصیت، میراث، شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ کا بیان ہے۔

چونکہ اہل تصوف بھی پنجتن پاک کا بڑا ذکر کرتے ہیں اس لئے ہم اس شبہے کو بھی دور کر دیں کہ اثناء عشریوں کا صوفیوں سے کوئی تعلق ہے۔ اگرچہ صوفی حضرت علیؑ کی ولایت کے قائل ہیں اور اپنے سلسلوں کو ان سے ملاتے ہیں مگر وہ اہلبیتؑ کے حق امامت کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی فقہ بھی فقہ اہلبیتؑ نہیں ہے۔ ہاں! نزاری البتہ مرشد، شیخ، پیر یا قطب کہلاتے تھے۔ وہ شاہ قلندر اور شاہ غریب جیسے نام اپناتے تھے یا اپنے ناموں کے ساتھ اکثر شاہ جیسے صوفیانہ لقب کا اضافہ کرتے تھے۔ تصوف کی شطحیات کے علی الرغم اثناء عشری شیعیت معرفت الٰہی کے لئے معرفت نفس کا درس دیتی ہے۔ خالص اسلامی عرفان یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، بدھ مت اور ہندو مت کے عرفان سے قطعاً مختلف چیز ہے۔ اس کے روحانی پیغام کا خلاصہ بس یہ ہے کہ ہم "اللہ کو پہچانیں۔" مولی الموحدین حضرت علیؑ کا قول ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ ایک عارف کے شب و روز توحید کے جلال میں بسر ہوتے ہیں اور وہ خدا اور کائنات کے بارے میں تفکر، تلاوت قرآن اور اس میں تدبر، شب زندہ داری، دعا، مناجات اور توبہ و استغفار کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح اور روح کی تربیت کرتا ہے اور روح کے دونوں مراکز یعنی دل اور دماغ کے راہوار کی باگ کو اپنے قابو میں رکھتا ہے۔ وہ راہ سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے شریعت کی پوری پابندی کرتا ہے۔ وہ آستانوں اور خانقاہوں میں بیٹھ کر نہ دنیا کو ترک کرتا ہے اور نہ لوگوں کے ساتھ دغل کرتا ہے بلکہ دنیا کی منجدھار میں زندگی گزارتا ہے اور لوگوں کی خدمت کرتا ہے۔ اس کے لئے تو یہ پوری دنیا خدا کا دربار ہے جس میں وہ ہر وقت خدا کے روبرو حاضر رہتا ہے۔ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ اس راہ سلوک میں موجودہ تصوف کی طرح نہ کسی شیخ کی بیعت ہوتی ہے، نہ ہُو اور حق کے نعرے، نہ ذکر و

اذکار کے حلقے، نہ مراقبہ، نہ سماع، نہ تار وطنبور، نہ قوالی نہ دھمال کچھ بھی نہیں ہوتا۔
تصوف کیا کیا رنگ دکھا سکتا ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک قدرت اللہ شہاب کے شہاب نامہ صفحہ ۵۵۷ پر "یورپ کے صوفی" کے بیان میں دیکھی جا سکتی ہے۔
تصوف کی مذمت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا تھا: **لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ عَلٰی اُمَّتِیْ حَتّٰی یَقُوْمَ قَوْمٌ مِنْ اُمَّتِیْ اِسْمُهُمُ الصُّوْفِیَّةُ اُولٰئِکَ لَیْسُوْا مِنْ اُمَّتِیْ وَاَنَّهُمْ یَحْلِقُوْنَ ذِکْرًا وَیَرْفَعُوْنَ اَصْوَاتَهُمْ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰی طَرِیْقَتِیْ وَهُمْ اَضَلُّ مِنَ الْکُفَّارِ وَمِنْ اَهْلِ النَّارِ وَلَهُمْ شَهِیْقُ الْحِمَارِ** "میری امت پر اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک اس میں صوفیاء کے نام سے ایک جماعت اٹھ کھڑی نہ ہو۔ یہ لوگ میری امت میں سے نہیں ہیں۔ یہ لوگ ذکر کے حلقے بنائیں گے اور اونچی آوازوں میں (ھو اور حق کے) نعرے لگائیں گے اور گمان کریں گے وہ میرے طریقے پر چل رہے ہیں جب کہ وہ کافروں سے زیادہ گمراہ اور جہنمی ہوں گے اور ان کی آوازیں گدھوں کی آواز کے مثل ہوگی۔"
امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا تھا: **مَنْ ذُکِرَ عِنْدَهُ الصُّوْفِیَّةُ وَلَمْ یُنْکِرْهُمْ بِقَلْبِهٖ وَلِسَانِهٖ فَلَیْسَ مِنَّا وَمَنْ اَنْکَرَهُمْ فَکَاَنَّمَا جَاهَدَ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ** "جس کسی کے سامنے صوفیوں کا تذکرہ کیا جائے اور وہ اپنے دل وزبان سے ان کا انکار نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جو شخص صوفیوں کا انکار کرے وہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے رسول اللہؐ کے ہمراہ کفار اور منافقین سے جہاد کیا۔"
ہم اپنی بات کو درود پر ختم کرتے ہیں کیونکہ ائمہ اہلبیتؑ پر درود بھیجنا ہماری ولادت کی پاکیزگی نفس کی طہارت، ذات کے تزکیہ اور گناہوں کے کفارے کا باعث ہوتا ہے۔ (زیارت جامعہ کبیرہ)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ

تفصیلات کے لئے دیکھئے:

اسماعیلی تاریخ و عقائد مؤلفہ ڈاکٹر فرہاد دفتری مطبوعہ اقبال برادرز کراچی ۱۹۹۷ء
تاریخ دولت فاطمیہ مؤلفہ سید رئیس احمد جعفری ندوی مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۶۵ء
تصوف اور تشیع کا فرق مؤلفہ ہاشم معروف الحسنی مطبوعہ مجمع علمی اسلامی ۲۰۰۸ء
تجلی مؤلفہ ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی مطبوعہ مجمع علمی اسلامی
پاسداران اسلام مؤلفہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان
سیر و سلوک مؤلفہ استاد مطہری، علامہ طباطبائی مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

کتابیات

الامام علیؑ — عبد الفتاح عبد المقصود
الامام زین العابدینؑ — شیخ کاظم القریشی
الامام الصادقؑ — شیخ محمد ابو زهره
الأمالی — سید مرتضی
الارشاد — شیخ مفید
الانتصار — شیخ مفید
أعیان الشیعه (جلد اول) — علامه سید محسن امین
اتقان المقال فی علم الرجال — شیخ محمد طه نجف
أضواء علی السنة المحمدیة — استاد محمود ابو ریّه
الأدب فی ظل التشیّع — شیخ عبد اللّٰه نعمه
تفسیر آلاء الرحمن — شیخ جواد بلاغی
تذکرة الخواص — ابن جوزی
تمهید لتاریخ الفلسفة — مصطفی عبد الرزاق
تاریخ الفقه الاسلامی — ڈاکٹر محمد یوسف موسٰی
تاریخ التشریع الاسلامی — شیخ محمد خضری
تاریخ الیعقوبی (مطبوعه نجف) — ابن ابی واضح یعقوبی
تأسیس الشیعة لعلوم الاسلام — سید حسن صدر
التکامل فی الاسلام — احمد امین ایرانی
تلخیص ابطال القیاس والرأی والاستحسان والتقلید والتعلیل — ابن حزم
جعفر الصادقؑ — استاد احمد مغنیه
جواهر الکلام فی الفقه — شیخ محمد حسن
خلاصة الرجال — علامه حلی
الدیموقراطیة — خالد محمد خالد
سفینة البحار — محدث شیخ عباس قمی

السنّة قبل التدوين	محمد عجاج خطيب
شرح نهج البلاغة	ابن ابی الحديد
الطبقات الكبرى	ابن سعد
العدة فی الاصول	شيخ طوسی
علیّ والقرآن	شيخ محمد جواد مغنية
العراق فی ظل العهد الاموی	ڈاکٹر علی الخرطبولی
فهرست المؤمنين	شيخ طوسی
الفقه علی المذاهب الخمسة	شيخ محمد جواد مغنية
الفهرست	ابن نديم
فجر الاسلام	احمد امين مصری
القواعد و الفوائد	شهيد اول
كتاب الرجال	کشی
كتاب الرجال	نجاشی
الكنٰی والالقاب	محدث شيخ عباس قمی
مجمع البيان	طبرسی
منهج المقال فی احوال الرجال	مرز محمد
مسالک الأفهام	شهيد ثانی
مروج الذهب	مسعودی
مع الشيعة الامامية	شيخ محمد جواد مغنية
مسائل فقية	علامه عبد الحسين شرف الدين
المراجعات	علامه عبد الحسين شرف
مجالس الشيخ المفيد	سيد مرتضی
الموطأ	امام مالک
المقدمة	ابن خلدون
المدخل لدراسة نظام المعاملات	ڈاکٹر محمد يوسف
المرأة فی الاسلام	شيخ كمال احمد عون
النص والاجتهاد	علامه عبد الحسين شرف الدين
وسيلة النجاة	سيد ابو الحسن اصفهانی
وفيات الأعيان	ابن خلكان